تفہیمات

حصّہ پنجم

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : تفہیمات حصہ پنجم

مؤلف : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ناشر : ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ،
اردو بازار، لاہور

مطبع : ایس۔ بی پریس، ۸ ڈیوس روڈ، لاہور

اشاعت :

بار اول : نومبر ۱۹۹۰ء ۲۰۰۰
بار دوم : جون ۱۹۹۱ء ۲۰۰۰

قیمت : / روپے

فہرست مضامین

۱	عرض مرتب	۵
۲	پاکستان میں نفاذِ شریعت	۷
۳	اے علمائے کرام	۲۷
۴	اقبال اور پاکستان	۳۷
۵	اُمّتِ مسلمہ کے لئے دو بہترین نمونے	۵۳
۶	امیر اور مامور	۶۳
۷	خطباتِ حرم	۷۱
۸	تعمیرِ اخلاق کیوں اور کیسے	۱۰۹
۹	دنیائے اسلام کی موجودہ حالت	۱۲۱
۱۰	مسلمان حکومتوں کا اتحاد	۱۳۷
۱۱	قومی وحدت اور پائیدار جمہوریت	۱۶۱
۱۲	سنت و بدعت کی کشمکش	۱۸۳
۱۳	اخلاقیات اجتماعیہ	۲۱۹
۱۴	اسلام کی قوّت کا اصلی سرچشمہ	۳۱۳
۱۵	حصہ دوم .... افاداتِ ابن القیمؒ	
۱۶	سدِّ باب ذریعہ	۳۹۳
۱۷	تغیّرِ احکام بلحاظ تغیرِ ازمنہ و احوال	۴۲۹
۱۸	تقلید و اتباع	۴۴۷
۱۹	تقلیدِ شخصی کے شرعی حدود	۴۶۵

عرضِ مرتب

تفہیمات، حصہ پنجم پیش خدمت ہے اس کے مضامین بھی مختلف موضوعات پر اور مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں ان مضامین میں بھی بقول مولانا مرحومؒ کے "ان میں کوئی ربط اس کے سوا نہیں ہے کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کار فرما ہے، یعنی اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں اور الجھنیں لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جائے اور سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی، عمرانی، قانونی اور مسائل دینی کے فہم و تعبیر کا ایک ہموار راستہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے"

اس مجموعہ میں مولانا مرحومؒ کے دو اہم اور قدیم ترین مقالات "اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ" جو ماہنامہ "ہمایوں" لاہور میں فروری ۱۹۲۴ء سے کئی ماہ تک شائع ہوتا رہا ہے اور دوسرا "اسلام کا اصلی سرچشمہ قوت" کے عنوان سے ہفت روزہ "الجمیعت" دہلی میں ۱۸ جولائی تا ۱۸ر اگست ۱۹۲۵ء کے شماروں میں اداریے کی شکل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ شامل ہیں

امید ہے اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھا جائے گا

اختر حجازی۔ لاہور

۲۰ر جولائی ۱۹۹۰ء

پاکستان میں نفاذِ شریعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت سے مراد کیا ہے ؟ بعد میں یہ عرض کروں گا کہ اس کے نفاذ کا کیا مطلب ہے اور آخر میں یہ بتاؤں گا کہ پاکستان میں اس کے نفاذ کے امکانات کیا ہیں اور کیا ضروری شرائط ہیں ۔

شریعت سے مراد

شریعت سے مراد محض قانون نہیں ہے جس کو عدالتوں کے ذریعے نافذ کیا جائے شریعت قانون کے ہم معنی نہیں ۔ شریعت سے مراد زندگی کا پورا نظام حیات ہے جو عقائد ایمانیات سے شروع ہوتا ہے ، اور عبادات واخلاقیات پر آتا ہے ۔

شریعت کے تقاضے

۱۔ پختہ ایمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت ہی کو نافذ کرنے کیلئے مبعوث فرمائے گئے تھے آپؐ نے تیرہ برس تک مکہ میں اس کے بعد مدینہ منورہ میں اپنی ساری طاقت صرف فرمائی تھی کہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں ایمان کی طاقت بٹھا دیں کیونکہ یہ شریعت اس وقت تک نافذ ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس کے چلانے والوں میں ایمان موجود نہ ہو ، اور جن پر وہ چلائی جائے

---

۵ ۔ نفاذِ شریعت کانفرنس راولپنڈی ۹۷۴ کا خطاب ۔

ان کے اندر بھی ایمان نہ ہو، اگر ایمان موجود نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کیا جاسکے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس آبادی پر اس کو نافذ کیا جارہا ہے وہ اس کو برداشت کرے مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ حدود شرعیہ میں سے ایک حد شرعی یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس کے اوپر عمل وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان ہو۔ وہ سچے دل سے سمجھتے ہوں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ سچے دل سے یہ سمجھتے ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولؐ ہیں سچے دل سے یہ مانتے ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی اور کلام نازل ہوا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو رسولؐ کی زبان سے جاری ہو رہا ہے۔ اور سچے دل سے یہ مانتے ہوں کہ اگر ہم نے اس کے نافذ کرنے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کی تو آخرت میں ہمیں اللہ کے روبرو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اگر یہ چیزیں موجود نہیں ہیں تو حدود شرعیہ کا اجراء نہیں ہو سکتا۔ ~~ممکن ہی نہیں~~۔ کوئی ایسا فرد جس کو قانون کی شکل میں حد شرعی ملے لیکن، وہ اس پہ ایمان نہ رکھتا ہو تو وہ پہلی فرصت تلاش کرے گا جس میں اس قانون کو منسوخ کرے اور اپنے لیے نیا قانون بنائے اسی طرح جن لوگوں پہ نافذ کیا جاتا ہے اگر ان کے اندر ایمان نہ ہو، وہ یہ نہ مانتے ہوں کہ قرآن برحق ہے اور اسلام کے قانون میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہی ہے، اگر وہ اس کے اوپر یقین نہ رکھتے ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کسی غریب، چھوٹے اور بے اثر آدمی کے تو ہاتھ کاٹ دیئے جائیں لیکن اگر کسی با اثر آدمی کا ہاتھ کاٹنے کی نوبت آجائے تو بغاوت برپا ہو جائے۔ وہ آبادی اس چیز کو برداشت ہی نہیں کرے گی کہ وہ قانون نافذ ہو۔ اس لیے شریعت سب سے پہلے جس چیز کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو نافذ کرنیوالے اور جن لوگوں پر کیا جائے ان کے اندر ایمان ہو، ان کے دلوں میں ایمان ہو۔

۲ - اسلامی اخلاق

اس کے بعد دوسری چیز کا شریعت یہ مطالبہ کرتی ہے، کہ اسلام جو اخلاقیات دیتا ہے، بھلے اور برے

کا جو امتیاز دیتا ہے۔ خیر و شر کا جو فرق بتاتا ہے اور جو اقدار انسان کو دیتا ہے کہ یہ چیز قیمتی ہے اور یہ چیز بے قیمت ہے اس کو ٹھیک مان کر سمجھ لیا جائے۔ اگر یہ چیز موجود نہ ہوگی تو مانتے ہوئے بھی وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے کیونکہ ان میں اخلاق موجود نہ ہوگا۔ اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ لوگ جن کے اخلاق کو گھن کھا چکا ہو ان کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کریں۔ اس لیے شریعت اسلامیہ ان کے ساتھ اخلاقیات بھی دیتی ہے۔ اور اخلاقیات کا نہایت وسیع تصور دیتی ہے جو زندگی کے ہر معاملے سے تعلق رکھتا ہے۔

۳۔ شریعت کو پوری زندگی پر نافذ کیا جائے

اس کے بعد تیسری چیز یہ ہے کہ شریعت کا نظام انسانی زندگی کے پورے دائرے پر پھیلتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی بحث کرتا ہے کہ پانی میں پاک کیا ہے اور ناپاک کیا ہے، اس شے سے بھی بحث کرتا ہے کہ انسان نجس کس حالت میں ہوتا ہے اور کس حالت میں کس طرح وہ پاک ہو سکتا ہے یعنی شریعت کوئی محدود سا قانونی تصور نہیں رکھتی آپ دیکھیے کہ فقہ کی کتابیں باب عبادت سے شروع ہوتی ہیں اور دنیا کا کوئی قانون آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس کے اندر طہارت کے مسئلے سے بحث کی گئی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں طہارت کا ہم معنی لفظ موجود نہیں۔ مغربی ممالک جانتے ہی نہیں کہ طہارت کس چیز کو کہتے ہیں۔ ان کی زبان میں اس کا ہم معنی لفظ موجود نہیں لیکن اسلامی شریعت طہارت سے بحث کرتی ہے جو کہ ایک فرد کا معاملہ ہے اور افراد کے اندر طہارت پیدا کرتی ہے یہ افراد کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرتی ہے۔ افراد کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے آمادہ کرنا، ان کو بندگی کے طریقے سکھانا یہ شریعت کا کام ہے۔ پھر افراد کو جوڑ کر ایک جماعت بنانا اور اس جماعت کے اندر اسلامی طریقے رائج کرنا، عبادات سے لے کر نکاح کے معاملات تک اور تجارت سے لے کر سیاست اور قانون و عدالت کے معاملات تک جنگ سے لیکر

ضلع تک، ملک کی مالیات سے لے کر ملک کی صنعت و حرفت تک، ہر چیز کے بارے میں قانون موجود ہے۔ اس چیز کو اگر نافذ کرنا ہے تو آدمی یہ سمجھ لے کہ انسانوں کی پوری زندگی کو بدل ڈالنا ہے، یہ نہیں ہے کہ صرف ایک پہلو سے ان کی زندگی کو بدلا جائے بلکہ ان کی پوری زندگی کو بدلا جائے۔ ان کی پوری زندگی کو ہر پہلو سے، افراد سے لے کر جماعت تک پوری آبادی کو بدلنا ہے ان کے اندر ایمان داخل کرنا ہے ان کے اندر اخلاقیات پیدا کرنے ہیں، ان کے اندر آمادگی پیدا کرنی ہے کہ خدا کے قانون کی پابندی کریں اور اس کے بعد تمام معاملات کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے۔ مارکیٹ میں جو لین دین ہو رہا ہے اس کے اوپر بھی شریعت کو نافذ کرنا ہے۔ بنکوں میں جو مالیاتی لین دین ہو رہا ہے ان کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے۔ یہ انشورنس کمپنیاں جو چل رہی ہیں ان کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے حکومت جو ٹیکس لگاتی ہے اور ٹیکس لگا کر جس طرح خرچ کرتی ہے ان دونوں چیزوں میں، جو قرض دیتی ہے اور جو قرض لیتی ہے اور قرض لے کر جس طرح خرچ کرتی ہے، ان سب پر بھی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ عدالتوں میں بھی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ حکومت کے انتظامی شعبوں کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے۔ مثلاً اگر پولیس بے ایمان ہے تو اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا، اگر ایک بے ایمان پولیس کے ہاتھ میں اسلامی شریعت دے دی جائے تو وہ پوری آبادی کو نچوا دے گی، تو اس طرح پوری انتظامی پالیسی کو بدلنا ہے۔ اس کی فوج کو بدلنا ہے، اس کی پولیس کو بدلنا ہے اس کے تمام حکام اور کارکنوں کو بدلنا ہے، رشوت خور لوگ اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ تو اس طرح سے شریعت کی اس حیثیت کو نگاہ میں رکھیے کہ یہ پوری زندگی کا قانون ہے، کسی ایک پہلو کا نہیں، اور یہ ایمان سے لے کر معاملات کے چھوٹے سے چھوٹے اجزائے کر سڑکوں کی صفائی تک سے بھی بحث کرتی ہے سڑک پر کوئی شخص کانٹے ہے یا لوگوں کو تکلیف دینے والی چیز ڈالتا ہے، کوئی نجاست پھینکتا ہے تو

وہ ایک گناہ کرتا ہے۔ ان سارے معاملات پر شریعت حاوی ہے شریعت کے اس حاوی ہونے کے پہلو کو نگاہ میں رکھنے کے بعد اب دیکھئے کہ اس کے نفاذ کا کیا مطلب ہے۔

نفاذِ شریعت کا مطلب

اس کے نفاذ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اپنے مدرسوں میں بیٹھ کر شریعت کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے نفاذ کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آپ وعظوں میں اور تقریروں میں اس کو بیان کریں اپنے خطبوں میں اس کو بیان کریں۔ اس کے نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ جو احکام شریعت میں ہیں ان کو پوری طاقت سے نافذ کیا جائے۔ جو کام صدر مملکت کا ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے جو وزیر اعظم کے کرنے کا کام ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ جو گورنروں اور صوبے کے وزراء کا کام ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کریں جو مالیات کے محکمے کا کام ہے، جو عدالت کے محکمہ کا کام ہے، جو اقتصادیات کے محکموں کا کام ہے جو صحت و تندرستی کے محکموں کا کام ہے وہ سارے کے سارے شریعت کے مطابق چلیں۔ یعنی کوئی ایک چیز نہیں ہے جو درکار ہو بلکہ پوری کی پوری حکومت کا نظام، پورے کا پورا تجارت و صنعت و حرفت و اقتصادیات کا نظام، پورے کا پورا عدالتی اور معاشرتی نظام سب کچھ اس کے مطابق ہونا چاہیئے ہر چیز میں اس کو نافذ کرنا چاہیئے جو چیز کہ محلے کے لوگوں کے نافذ کرنے کی ہے وہ نافذ کریں۔ جو میونسپلٹیوں کے نافذ کرنے کی ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ پوری کی پوری گورنمنٹ اس کے مطابق ہونی چاہیئے۔ نہ یہ کہ کوئی شیخ الاسلام بنا کر بٹھا دیا جائے یا وزارت مذہبی امور بنا دی جائے اور سمجھ لیا جائے کہ شریعت کا نفاذ ہو گیا یہ کوئی بات نہیں، پورے کے پورے نظامِ حکومت کو تبدیل کرنا اور اسلام کے مطابق چلانا ہے، اس کا نام ہے نفاذِ شریعت، میں مختصر عرض کر رہا ہوں ورنہ اس کی تفصیل زیادہ ہے۔

اب دیکھئے کہ پاکستان میں اس کا نفاذ کیسے ہو سکتا ہے ۔

پاکستان میں نفاذ شریعت کیوں نہیں ہوا ؟

پاکستان میں اس کے نفاذ میں اختلاف کیوں پیدا ہوا ؟ ویسے تو ہم ایک مسلمان قوم ہیں، اور پاکستان اسلام کا نام لے کر بنایا گیا تھا، ہونا تو یہ چاہیئے تھا اور فطرتاً آدمی یہ سمجھتا ہے کہ آپ سے آپ ہونا چاہیئے تھا کہ جس روز پاکستان بنا تھا شریعت اسلامی اسی روز نافذ ہو جاتی۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا، اس کی کچھ وجوہ ہیں ۔

کافرانہ حکومت کے اثرات

ایک وجہ یہ ہے کہ ایک مدت دراز تک یہاں کفر کی حکومت مسلط رہی ہے اس نے تعلیم کا نظام ایسا بنایا کہ اس نے لوگوں کے ذہن بدل کر رکھ دیئے، سوچنے کے انداز بدل دیئے اپنی تعلیم کے اثر سے لوگوں کو اس حد تک بہکایا کہ قلیل تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی رہ گئی جو واقعی دل میں ایمان رکھتی ہو اور سچے دل سے مانتے ہوں کہ اللہ کے رسولؐ جو کچھ لائے وہ برحق ہے ورنہ ایک کثیر تعداد ایسی ہو گئی جو اس بات کی قائل نہیں تھی کہ وحی آسکتی ہے، جو اس بات پر قائل ہی نہیں رہی تھی کہ نبوت بھی کسی چیز کا نام ہے جو سمجھتے تھے کہ نبوت اور وحی افسانے ہیں۔ ان کے نزدیک جو کچھ یورپ اور امریکہ سے آتا ہے وہ برحق ہے۔ اس کے بارے میں کوئی سوال کرنے کی حاجت نہیں، جیسا وہ آرہا ہے جوں کا توں مان لیں گے۔ اس میں کوئی چیز شک کی اور دریافت طلب بات نہیں، اور وہ کتاب جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لاریب فیہ اس میں ہر ریب کی گنجائش ہے۔ تو یہ تو تعلیم کے اثرات تھے ان میں جن لوگوں نے اپنا ایمان کچھ بچایا، ان کی فکر اسلامی نہیں تھی۔ سوچنے کا انداز اسلامی نہیں تھا جنہوں نے سوچنے کا انداز اسلامی بنانے کی کوشش کی ان کے پاس علم اسلامی نہیں تھا وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ اسلام کیا ہے، اس کے احکام کیا ہیں، کس قسم کا نظام وہ چاہتا ہے، جس وقت ہم نے یہ نام

لینا شروع کیا کہ اسلامی نظامِ حکومت سے کیا مراد ہے۔ عام لوگ ہی نہیں بعض دفعہ علماء کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے بعض لوگوں نے یہاں تک ہم سے کہا کہ یہاں کس چیز کی باتیں کر رہے ہو یہ اس زمانے میں چلنے والی چیز نہیں اور میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ حضور اگر یہ چلنے والی چیز نہیں تو اس پر ایمان کیوں رکھتے ہیں ؟ پھر جو چلنے والی چیز ہے اس پر ایمان لائیے میری بعض علماء سے بات چیت ہوئی اُنھوں نے مجھ سے یہ بات کہی اور میں نے ان سے یہی عرض کیا ۔

ایک اچھا خاصہ گروہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر شیخ الاسلامی قائم ہو جائے اور قضائے شرعی کا انتظام ہو جائے تو بس اسلام کا نفاذ ہو جائے گا۔ اسلامی نظام نافذ ہو گیا یہ جب ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کے خیالات تھے تو آپ اندازہ لگائیے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگوں کا کیا حال ہوگا ان کے اندر ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہ کہتے تھے کہ اگر ہم اسلامی نظام یہاں نافذ کریں تو ہم دنیا کو کیا مُنہ دکھائیں گے کہ یہ چودہ سو برس پہلے کا قانون یہاں نافذ کر رہے ہیں یہ ہم نے خود باتیں سُنی ہیں جب ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیئے بس اس چیز کا اس وجہ سے ذکر کر رہا ہوں کہ آپ کو وہ رکاوٹیں سمجھ میں آجائیں ۔

اسلام ناآشنا قیادت

باوجود اس کے کہ یہ ایک مسلمان قوم تھی اور اس نے اسلام کا نام لے کر پاکستان قائم کیا تھا لیکن وہ اسلام کا نظام نافذ نہیں کر سکی۔ کیوں نہیں کر سکی ؟ اس کے جو کارفرما لوگ تھے جن کے ہاتھ میں نظام تھا ان کی تربیت اور تعلیم کسی اور طرز پر ہوئی تھی وہ جانتے بھی نہ تھے کہ اسلام کیا ہے ، ان کا سوچنے کا انداز بھی اسلامی نہ تھا اور ان کے اندر خواہش بھی اسلامی نظام کو نافذ کرنے کی نہیں تھی۔ نہ اس کو جانتے تھے کہ کیا چیز ہے نہ اس کو مانتے تھے کہ اس کو نافذ کرنا چاہیے ۔ ظاہر بات ہے یہ پھر کیسے نافذ ہو سکتا ہے ۔

کافرانہ نظام کا نتیجہ

جہاں تک عام آبادی کا تعلق تھا اور ہے اس کے اندر اسلام کے ساتھ عقیدت موجود ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے اندر ایمان بھی مجمل طور پر موجود ہے چاہے وہ ایمان کی تفصیلات نہ جانتے ہوں لیکن مجمل طور پر ایمان ان میں ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہیں۔ رسولؐ کو مانتے ہیں بلکہ رسولؐ کے نام پر جان دینے کو تیار ہیں۔ قرآن کو برحق مانتے ہیں اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کا احترام کرتے ہیں۔ آخرت کے منکر نہیں۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ لیکن کفار کی ایک طویل مدت کی حکومت اور کافرانہ قوانین کے اجراء نے اور ان کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دینے نے اس مدت دراز کے اندر لوگوں کی عادات و خصائل بدل ڈالے۔ مسلمان جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے لیکن اس میں مبتلا ہوتا ہے اس لیے کہ وہی چیز اس پر مسلّط ہے۔ ہر طرف سے وہ اس پر محیط ہے۔ مثلاً سود۔ کون مسلمان نہیں جانتا کہ سود حرام ہے مگر جب سود ہی پر سارا نظام قائم ہو جائے تجارت کا صنعت و حرفت کا مالیات کا تو کون آدمی اس سے بچے۔ اس میں مبتلا ہوتے وقت مسلمان کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کسی طرح اسے بھی حلال کر دیا جائے کیونکہ حرام کو حرام جانتے ہوئے اس کو کرنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ حرام سے اجتناب کرے چاہتا یہ ہے کہ کسی طرح حرام کو حلال کر دیا جائے اب تک میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں جو اس طرح کے سوالات کرتے ہیں اور میں ان سے کہتا ہوں کہ بھائی حرام کو حلال کرنے کے اختیارات مجھے حاصل نہیں اگر مجھے یہ اختیارات حاصل ہوتے تو ایک چیز بھی حرام نہ رہنے پاتی۔ لیکن میں یہ اختیارات نہیں رکھتا۔ کیسے آپ کے لیے حلال کر دوں۔

اسلام نا آشنا قیادت نے قوم کو بدلنا چاہا

لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کافرانہ نظام کے تسلّط کی بدولت لوگوں کے سوچنے کے انداز ہی نہیں بدلتے، عادات بھی

بدل جاتی ہیں اور ان کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ نظامِ اسلامی کو برحق ماننے کے باوجود اس چیز سے پرہیز کریں۔ اب اس کے بعد جب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی حکومت آئی جو نہ اسلام کو جانتے تھے نہ اسلام کو نافذ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے نہ اسلام کو نافذ کرنے کی قابلیت رکھتے تھے تو ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر ہم اس بات کو پھیلنے دیں کہ ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو اور عام لوگوں کے اندر اس بات کی طلب پیدا ہو جائے تو پھر ہمارا چراغ کہاں جلے گا؟ لوگ ہماری طرف کیسے توجہ کریں گے۔ پھر اس کی تلاش ہوگی جو اس کو نافذ کر سکے اس لیے انہوں نے ۲۷ سال اس کام پر صرف کیے کہ قوم کے مزاج کو بدلا جائے۔ ان کے اخلاق کو بدلا جائے۔ ان کے اندر برائیوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اس کو زیادہ سے زیادہ گانے اور ناچ کا رسیا بنایا جائے۔ اس کے اندر جہاں تک ممکن ہو سکے شراب خوری پھیلائی جائے اس کو زیادہ سے زیادہ سود میں مبتلا کیا جائے اتنے سود میں جتنا انگریز کے زمانے میں بھی نہیں تھا، اس میں مخلوط تعلیم رائج کی جائے تاکہ عورتوں اور مردوں کے میل جول سے جو کچھ تہذیب و تمدن کا ستیاناس ہوتا ہے اور ہو رہا ہے وہ اور پیدا ہو، غرض انہوں نے ہر ممکن طریقے سے پوری قوم کو بگاڑ دینے کا پروگرام بنایا جس پر برابر عمل ہوتا رہا ہے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ نفاذ شریعت کے لیے جس قسم کا ماحول چاہیے۔ اس نوعیت کا ماحول بنانے کی بجائے اس کے برعکس نوعیت کا ماحول ستائیس برس میں بنایا گیا۔

نفاذِ شریعت کیسے ہوگا؟

دلوں میں ایمان اتارنا ہوگا

اب جب آپ یہ سوچنے کے لیے بیٹھیں گے کہ ہم یہاں نفاذ شریعت کیسے کریں۔ تو آپ کو ایک طرف لوگوں کے دلوں میں ایمان اتارنا پڑے گا۔

کیونکہ ایمان کے بغیر وہ بنیاد ہی قائم نہیں ہو سکتی جس پر نظامِ شریعت

کا نفاذ ہو سکے۔ وہ عمارت ہی نہیں کھڑی ہو سکتی۔ اس لیے پہلے ایمان اتارنا پڑے گا تمام شکوک و شبہات کے کانٹے جو ان کے اندر چبھے ہوئے ہیں۔ وہ نکالنے پڑیں گے۔ ان کو مطمئن کرنا پڑے گا پڑھے لکھوں کو بھی اور عوام کو بھی، جتنا کچھ عوام کے لیے درکار ہے اتنا کچھ عوام کے لیے اور جتنا کچھ پڑھے لکھوں کیلئے درکار ہے اتنا کچھ پڑھے لکھوں کے لیے کرنا پڑے گا۔

اصلاحِ اخلاق کرنی ہوگی

اس کے بعد آپ کو ان کے اخلاق کی طرف توجہ کرنی پڑے گی کیونکہ ایک بد اخلاق قوم کبھی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ اسلامی نظام نافذ کر سکے۔ تو اخلاق کی فکر کرنی پڑے گی۔

اسلامی نظام کے لیے تڑپ پیدا کرنی ہوگی

اس کے بعد آپ کو عام لوگوں کے اندر یہ تڑپ پیدا کرنی پڑے گی کہ وہ یہ سمجھیں کہ جب تک اسلام کا نظام جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں نافذ نہیں ہوتا اس وقت تک ہمارے لیے کوئی زندگی نہیں اس کے بغیر آپ اس کو نافذ نہیں کر سکتے اگر لوگ قائل ہوں کہ فی الواقع اسلام کا نظام آنا چاہیئے۔ اور وہ اس بات کے خواہش مند بھی ہوں کہ یہ نافذ ہو لیکن اس کی تڑپ موجود نہ ہو، اس کے لیے لگن موجود نہ ہو اور یہ ارادہ موجود نہ ہو کہ دوسرے نظام کو ہم نہیں چلنے دیں گے اگر ہمارے اوپر نافذ ہوگا اس وقت تک قوم اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتی کہ ایک غلط غیر اسلامی نظام چل رہا ہے۔ وہ مجبور ہو جائے جگہ چھوڑنے کے لیے اور اس کی جگہ اسلامی نظام نافذ کیا جائے،

نفاذِ شریعت کا کام پھولوں کی سیج نہیں

یہ کھیل نہیں ہے، یہ زبان سے کہنے کے لیے بہت آسان کام ہے لیکن یہ ایسا کام ہے کہ اس راہ میں ہر قدم انسان کے لیے مصیبت اذیتوں، تکلیفوں اور نقصانات سے بھرا ہے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ جس وقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے آئے تھے تو جن لوگوں نے اس کو قبول کیا تھا ان پر کیا گزری تھی۔ اور جس شخص نے اسے پیش کیا تھا اس کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا۔ اگر اس بھٹی سے نہ گزرتے تو اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت بھی لوگ اس بھٹی سے گزرے تھے اور گزرنے کے بعد جن لوگوں نے قدم قدم پر چوٹیں کھائی تھیں اور قدم قدم پر تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ قدم قدم پر نقصانات اٹھائے تھے۔ گھر بار چھوڑے تھے۔ آگ کے انگاروں پر لٹائے گئے تھے۔ تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر پتھر ان پر رکھ دیئے گئے تھے۔ الٹا لٹکا کر ان کو بوری میں لپیٹ کر آگ کی دھونی دی گئی تھی جب تک ان سارے راستوں سے گزر نہ گئے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں اقتدار نہیں دیا۔

ان راستوں سے گزرنے کے بعد بھی بدر و احد کے دنوں کو یاد کر لیجیے۔ اور حنین کا معرکہ بھی یاد کر لیجیے ایسے تمام حالات میں اپنے سے کئی کئی گنا زبردست طاقتوں کے مقابلے میں آدمی کھڑا ہو اور ہر مصیبت اور ہر مشکل و تکلیف کو یاد کرے اور کوئی پروا نہ کرے کہ مقابلے میں کتنی بڑی طاقت ہے کوئی پروا نہ کرے کہ کتنی زیادہ چوٹ مجھے لگتی ہے۔ کتنا میں قید کیا جاتا ہوں اور کتنی مجھے اذیت دی جاتی ہے اور کیسے کیسے زبردست دشمنوں سے مجھے سابقہ ہے۔ کس آگ کے گڑھے کی طرف لے جایا جا رہا ہوں۔ اس سب کچھ کی پروا کیے بغیر جو لوگ آگے بڑھیں گے وہ یہاں نظام شریعت نافذ کر سکتے ہیں اور باطل پر قابو پا سکتے ہیں۔

محنت کے اثرات ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے

یہ چیز جب آپ کریں گے تو اس کے اثرات آہستہ آہستہ پھیلیں گے۔ اس کے اثرات کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی جائیں گے اور انہی درسگاہوں میں جو کافر بنانے والی ہیں اس ذہن کی نسل تیار ہوگی۔ انہی میں وہ نوجوان تیار ہوں گے جو اسلامی نظام چاہتے بھی ہوں گے اور وہ علم بھی حاصل کریں گے کہ اسلامی نظام کیسے نافذ ہو۔ اور اس

کے لیے جب وہ منظم ہو کر کام کریں گے تو ان کے مقابلے پر ہر حربہ استعمال کیا جائے گا کہ کسی طرح دب جائیں۔ ان کے اوپر گولیوں کی بھی بوچھاڑ ہو گی ان کے اوپر لاٹھیوں کی بھی بوچھاڑ ہو گی۔ ان کو جیلوں میں بھی ٹھونسا جائے گا۔ ان کو اذیتیں بھی دی جائیں گی۔ مگر جب تک وہ اس بھٹی سے نہیں گزریں گے۔ وہ کھرا سونا نہیں بن سکتے جو اس بھٹی سے گزر کر بنتا ہے۔

ملازمین میں اسلامی ذہنیت پیدا کرنے کی ضرورت

اسی طرح سرکاری ملازمین کے اندر بھی ان خیالات کو بڑے پیمانے پر پھیلنا چاہیئے کہ وہ کسی ظلم کے آلۂ کار بننے کے لیے تیار نہ ہوں۔ ان کے ہاتھوں سے غلط کام نہ کروایا جا سکے، وہ اس بات کے لیے تیار ہو جائیں کہ نوکری چھوٹ جائے، وہ تیار ہو جائیں کہ ان کے بیوی بچے فاقہ کریں گے لیکن اس کے لیے تیار نہ ہوں کہ غلط کام اپنے ہاتھوں سے کریں یہ ذہنیت سرکاری ملازمین میں بھی پیدا ہونی ضروری ہے جب حکومت محسوس کرے گی کہ اب ہمارا کام نہیں چل سکتا جب تک ہم اسلامی شریعت کے لیے تیار نہ ہوں اور ہم تیار نہ ہوں تو پھر ان لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دیں جو اس کو نافذ کر سکیں۔

رائے عامہ کو اسلام کے حق میں بدلنے کی ضرورت

اسی طرح یہاں جمہوری نظام چل رہا ہے تو انتخابات میں کوشش کی جاتی ہے کہ عوام کو جس طرح بھی ہو سکے دھوکا دے کر فریب دے کر طرح طرح کے وعدے کر کے ان کی رائے حاصل کر لی جائے اور دنیا کو یہ دکھایا جائے کہ ہم عوام کی رائے سے آئے ہیں، آپ کو عوام کی رائے اتنی بدلنی پڑے گی کہ اس طرح لوگ عوام کا ووٹ حاصل نہ کر سکیں۔ عوام کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ہمارا جینا حرام ہے اگر ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کریں۔ عوام یہ سوچ ہی نہ سکیں کہ ہم کسی

ایسے شخص کو بھی ووٹ دے سکتے ہیں جس کی اپنی زندگی میں اسلامی نظام کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی ہے جس کا عمل اسلامی نہیں ہے جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتا ہے مگر اسلام نہیں جانتا ہے۔ ایسے کسی شخص کے لیے کوئی ووٹ نہ ہو، یہ حالت آپ کو پیدا کرنی ہوگی۔

عزم کے مقابلے میں کوئی دھاندلی کامیاب نہیں ہو سکتی!

اگر اس حالت میں انتخابات ہوں تو بڑی خوشی کی بات ہے منصفانہ انتخابات ہوں تو بہت اچھا ہم نہیں چاہتے کہ ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالا جائے۔ اگر گھی ٹیڑھی انگلی کیے بغیر نکل سکتا ہے تو کوئی احمق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ انگلی ٹیڑھی کرے لیکن اگر قوم کے اندر یہ عزم پیدا ہو جائے کہ ہمیں اس نظام کو یہاں نافذ کرنا ہے تو پھر کوئی دھن، دھونس دھاندلی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔

لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ آپ کو جان مار کر ایک مدت دراز تک کام کرنا پڑے گا یہاں تک کہ وہ مرحلہ آجائے جس میں ذرا سی عقل رکھنے والے لوگ بھی از خود جگہ خالی کر دیتے ہیں خود ہٹ جاتے ہیں۔ وہ مرحلہ جب آجاتا ہے تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب ہمارا چراغ اس قوم میں نہیں چل سکتا اس لیے بہتر ہے کہ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر نہ ہٹیں تو ان کو ہٹانا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا بشرطیکہ قوم کے اندر پورا عزم پایا جائے۔

میں نے ایک عام تصور آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کہ شریعتِ اسلامی کیا ہے اور یہ بھی آپ کے سامنے واضح ہو گیا ہے کہ اس کے نفاذ کے کیا معنی ہیں اور یہ بھی آپ کے سامنے آگیا ہے کہ اس کو نافذ کرنے کا راستہ کیا ہے۔ اب یہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا یہاں اس کا امکان ہے ؟

پاکستان میں نفاذِ شریعت کے امکان

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ امکان کے سوال کے دو جواب ہیں ۔

تدبّر و قربانی سے یہ کام ممکن ہے

ایک جواب یہ ہے کہ انسان اگر پیہم اور مسلسل سعی کرے اور سوچ سمجھ کر سعی کرے، بیوقوفوں کی طرح نہیں، سوچ کر عقل مندی کے ساتھ تو وہ بڑے سے بڑے پہاڑوں کے اندر سرنگ پیدا کر سکتا ہے۔ وہ سمندروں کے نیچے سے سرنگ نکال سکتا ہے، سمندروں کے اندر سے تیل نکال سکتا ہے وہ چاند کے اوپر پہنچ سکتا ہے۔ جب انسان یہ کچھ کر سکتا ہے تو انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم طاقتیں دی ہیں کہ اگر وہ اللہ کا نظام نافذ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو تو اس کو بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے جان لڑانی ہے محنت کرنی ہے۔ عقل مندی کے ساتھ کام کرنا ہے اور مسلسل جان کھپانی ہے اور اس کام کو وہ لوگ کر سکتے ہیں جو یہ شرط نہ لگائیں کہ ہم اس کو اپنے سامنے نافذ ہوتے دیکھیں اس لیے کہ نہ معلوم کتنوں کو اس کے نفاذ کی کوشش میں پہلے ہی جان دینی پڑے بدریں جن لوگوں نے شہادت پائی اگر وہ جان نہ دیتے اور یہ کہتے کہ ہمیں تو اس وقت کے لیے زندہ رہنا ہے جب اس نظام کو نافذ ہوتے دیکھیں گے، دنیا پر غالب ہوتے دیکھیں گے تو دنیا پر اسلام غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ غالب ہوا اس طرح کہ بکثرت لوگ اپنی جانیں قربان کرنے کیلئے تیار رہے۔ انہوں نے اس بات کی فکر نہیں کی کہ یہ نافذ ہو سکے گا یا نہیں اُنہوں نے دیکھا کہ یہ ہمارا فرض ہے ہمیں اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنی ہے جس کے نتیجے میں شہادت آتی ہے تو اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں اس سوچ کے ساتھ وہ آئے اور راہوں نے آکر کام کیا اور ان کی قربانیوں کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی قبول کرنیوالا تھا۔ وہ قبول ہو گئیں لیکن جو جان لڑانے والے تھے اور بچ رہے،

اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے ایسا دین غالب کیا کہ دنیا کے بڑے حصے پر چھا گیا تو امکان یہ بھی ہے . . . . اور امکان اس امر کا بھی ہے کہ آپ تمام عمر جدوجہد کریں اور پھر بھی یہ نظام نافذ نہ ہوا، اور اس کی وجہ اس نظام کی کمزوری نہیں ہوگی' اگر آپ اس نظام کے لیے سعی کرنے کا حق ادا کریں تو آپ کی بھی کمزوری نہیں ہوگی' تو وہ قوم کی بدبختی ہوگی جو ایسے لوگوں کا ساتھ نہ دے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو وہ چیز نہیں دیتا جس کا وہ اپنے آپ کو اہل ثابت نہیں کرتی، یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ قوم اپنے آپ کو فساق و فجار کے لیے تیار کرے اور اس پر راضی ہو جائے اور چاہے کہ فساق و فجور ہی ان کے اوپر معاملات چلانے والے ہوں تو اللہ تعالیٰ زبردستی ان کو صالحین اور متقی نہیں دیں گے۔ یہ نہیں ہوتا، تو وہ لوگ جنہوں نے ایسی قوموں میں کام کیا اور اپنی عمریں ان کے اندر کھپا دیں اور ان کی قوم سیدھے راستے پر نہ آئی تو وہ ناکام نہیں تھے۔ وہ قوم ناکام تھی۔ حضرت لوط علیہ السّلام کے قصے میں آتا ہے جس وقت فرشتے قومِ لوط پر عذاب دینے کے لیے بھیجے گئے تو انہوں نے کہا ماوجدنا فیہا غیر بیتٍ من المسلمین . . . پوری قوم میں ایک مسلم گھر تھا اور کوئی نہیں۔ اب اس کے بعد ہوتا کیا ہے۔ جو مسلم گھر تھا اس کے لوگوں سے کہا۔ نکل جاؤ اور حضرت لوطؑ سے کہا کہ بیوی کو چھوڑ جاؤ۔ یہ عذاب میں پکڑی جائے گی یعنی اس گھر میں بھی کافرہ موجود تھی اور وہ بھی پورے کا پورا مومن نہیں تھا، ان کو چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد عذاب لایا گیا وہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں واضح ہے تو ایک قوم نہ چاہتی ہو کہ ان کے اوپر اسلامی نظام نافذ ہو۔ ایک قوم اگر نہ چاہتی ہو کہ اس کے معاملات ایماندار اور خدا ترس لوگ چلائیں۔ ایک قوم خود بددیانت اور بے ایمان کو چاہتی ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو زبردستی نیک لوگ نہیں دیتا۔ ان نیک لوگوں کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ وہ ناکام نہیں ہیں اگر ان کی بات نہ چلے تو وہ ناکام نہیں ہیں ناکام وہ قوم ہے۔

امکان کو نگاہ میں رکھ کر کام نہ کریں

اس پہلو کو نگاہ میں رکھ کر کام کیجیے اور یہ سمجھ کر نہ کیجیے کہ اس کا امکان ہو تو ہم کام کریں۔ یہ سوال جو لوگ کرتے ہیں کہ کیا امکان ہے تو ان سے میں پوچھتا ہوں کہ بھائی فرض کرو کہ اس کا امکان نہیں ہے تو کیا آپ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جس چیز کا امکان ہے اس کے لیے کام نہ کریں یہ تو پھر مومن کا کام نہیں ہے۔

> مومن کا کام تو یہ ہے کہ اگر اس کے نافذ ہونے کا ایک فیصد امکان نہ ہو بلکہ ایک فی ہزار بھی امکان نہ ہو تب بھی وہ اس کے لیے جان لڑائے۔ اس راستے میں کوشش کرتے ہوئے جان دے دینا کامیابی ہے اور کسی غلط راستے پر جا کر وزیرِ اعظم یا صدرِ اعظم بن جانا بھی کامیابی نہیں، کھلی ناکامی ہے۔

آپ دیکھیں کہ آپ کا فرض کیا ہے

تو اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ امکان کی شرط کے ساتھ آپ کو یہ کام نہیں کرنا بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کرنا ہے کہ یہ ہمارے کرنے کا کام ہے اور اس کے سوا ہمارے کرنے کا کوئی کام نہیں۔ مثلاً اگر ایک آدمی کے سامنے یہ سوال آئے کہ پیشاب بھی پینے کی چیز ہے تو جو آدمی طہارت کی ذرّہ برابر بھی حس رکھتا ہو تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ بھی کوئی پینے کے قابل چیز ہے۔ وہ برابر اسی تلاش میں رہے گا کہ اسے پینے کے لیے صاف پانی ملے لیکن کبھی اس کا ذہن اس طرف نہیں جائے گا کہ پیشاب بھی کوئی پینے کے قابل چیز ہے اس طرح وہ آدمی جو اسلام کا سچے دل سے قائل ہے وہ یہ سوچ نہیں سکتا کہ دوسرے جن راستوں میں آسانیاں ہیں جن راستوں میں سہولتیں ہیں۔ عیش ہے، لذتیں ہیں، فائدے ہیں ان کی طرف جائے کہ ان کا امکان ہے اور اسلام کا کوئی امکان نہیں، اس کے سوچنے کے قابل بھی وہ چیز نہیں، وہ کبھی حسرت بھری نگاہ بھی نہیں

ڈالے گا ان کے محلات پر، ان کی کوٹھیوں پر، ان چیزوں پر، وہ کبھی یہ نہیں سوچے گا کہ کاش یہ دولت میرے پاس آ جائے۔ اس وجہ سے صرف وہ لوگ اس کام کو کر سکتے جو امکان ہے کو چھوڑ کر یہ دیکھیں کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ہر تکلیف، ہر مصیبت اور ہر مشکل برداشت کرنے کیلئے تیار ہوں، یہی ان کے کرنے کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگ پیدا کر دیئے اور انہوں نے پوری ہمت کے ساتھ اس کے لیے کام کیا تو میں یہ نہیں سمجھتا کہ کونسی طاقت یہاں ایسی ہے جو انہیں آگے بڑھنے سے روک سکے۔ اللہ نے چاہا تو اس میں کامیابی ہی ہوگی۔

میں نے دوسرا پہلو آپ کے سامنے پیش کیا وہ اس لیے کہ کامیابی کی شرط کے ساتھ آپ کام نہ کریں۔ میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس ملک کے اندر ایک مٹھی بھر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو پوری تنظیم کے ساتھ پورے ڈسپلن کے ساتھ، عقل و ہوش کے ساتھ اور دیوانگی کے ساتھ، دونوں چیزیں ساتھ چاہئیں یہ کام کریں اس میں جان لڑائیں۔ اور مسلسل جان لڑاتے جائیں اور ہر تکلیف اور خطرے کو انگیز کرنے کے لیے تیار ہوں تو وہ لوگ جو اس وقت ایک غیر اسلامی نظام کو چلاتے ہیں وہ ایسی طاقت نہیں رکھتے کہ ان کے سامنے ٹھہر سکیں۔

نظامِ باطل کھوکھلا ہوتا ہے

واقعہ یہ ہے آپ اس بات کو دیکھیے کہ جو لوگ اس نظام کو چلا رہے ہیں ان کی حالت کیا ہے۔ ان میں سے کوئی دو آدمی بھی ایک دوسرے سے مخلص نہیں ہیں۔ ان کی دوستیاں بے غرضی پر مبنی نہیں، بے لوثی پر مبنی نہیں، قلبی محبت پر مبنی نہیں، مفاد پر مبنی ہیں، جس کے ساتھ ہیں اس کا ساتھ بھی دیے رہتے ہیں اور دل میں گالیاں بھی دیے رہتے ہیں، بلکہ وہ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں جب دیکھتے ہیں کہ بات نہیں پہنچے گی تو وہ ان مجلسوں میں بھی کھلم کھلا کہتے ہیں۔ باطل

نظام بظاہر بڑے زور کے ساتھ نافذ ہوتا ہے لیکن اصل میں کھوکھلا ہوتا ہے۔ ٹھوس نہیں ہوتا، اس میں قائم رہنے کی طاقت نہیں ہوتی جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ ایسے لوگوں کو موقع دیا جائے تو ایسے لوگوں کو موقع ملتا ہے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے عقل مندی کر کے وہ تمام راستے بند کر دیئے ہیں جن سے خطرہ آ سکتا ہے لیکن ایک راستہ اللہ تعالیٰ نے ایسا رکھ چھوڑا ہے جدھر سے اس کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اس راستے کو بند نہیں کر سکتے۔ اس طرح سے ایسے نظام جو قائم ہوتے ہیں وہ بار بار مٹتے اور اکھڑتے ہیں اور حالات اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی ایسا گروہ آئے جو ایک مضبوط بنیاد پر ان کے لیے ایک نظامِ حق قائم کرے جب تک ایسا گروہ سامنے نہیں آئے گا اور اس مرحلے تک نہیں پہنچ جائے گا کہ وہ نظامِ حق کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر سکے اس وقت تک یہاں کھوکھلے نظام قائم ہوتے اور بدلتے رہیں گے۔ آدمی بدلیں گے وہ کھوکھلا نظام جوں کا توں رہے گا صرف اشخاص بدلتے چلے جائیں گے۔

حالات اہلِ حق کے منتظر ہیں

آپ دیکھئے یہاں جو نظام ۲۷ سال سے آ رہا ہے اس میں صرف اشخاص بدلتے گئے، قسم ایک ہی رہی ہے نظام کی نوعیت ایک ہی رہی ہے، اس کی فطرت ایک ہی رہی ہے یہی صورتِ حال جاری رہے گی اس انتظار میں کہ کب وہ لوگ آتے ہیں۔ اگر وہ لوگ نہ آئے تو نہیں معلوم اس قوم کا کیا حشر ہوگا کہ یہ مسلسل انقلابات کو برداشت بھی کر سکے گی یا نہیں۔ اور یہ مسلسل انقلابات کے لیے زندہ بھی رہ سکے گی۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس قوم کو کوئی بھی چیز بچا سکتی ہے تو یہی نظامِ حق ہے۔ وہ یہاں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو قبل اس کے کہ خدا کا عذاب فیصلہ کر دے کہ اس قوم کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ (ٹیپ سے ماخوذ ۱۹۷۴)

اے علمائے کرام

جماعت اسلامی صوبہ پنجاب کے اہتمام علماء کانفرنس
منعقدہ ۳ر نومبر ۱۹۷۴ء سے مولانا سید ابوالاعلیٰ
مودودی کا خطاب
ہفت روزہ ایشیاء لاہور ۱۰ر نومبر ۱۹۷۴ء

اس زمانے کے فتنوں کو سمجھئے اور ان فتنوں کے اثرات کو مٹائیے

حضرات علمائے کرام!

مجھے مسرت ہے۔ کہ اس وقت جماعت کے علماء کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور مجھے کچھ عرض کرنیکا موقع مل رہا ہے۔

دو، ذمہ دار گروہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گروہوں کو سب سے زیادہ ذمہ دار قرار دیا ہے۔ معاشرے کی ہدایت اور ضلالت کا۔ ایک امراء اور دوسرے علماء، امراء اگر بگڑے ہوئے ہوں اور علماء بھی بگڑے ہوئے ہوں تو اس معاشرے کا خدا حافظ ہے۔ پھر وہ معاشرہ نہیں ٹھہر سکتا کم از کم مسلم معاشرے کے لئے تو یہ ایک اصول ہے۔ کہ وہ ٹھہر نہیں سکتا۔ امراء بگڑے ہوئے ہوں اور علماء درست ہوں تو معاملات درست کئے جا سکتے ہیں، لیکن امراء

جماعت اسلامی صوبہ پنجاب کے زیر اہتمام علمائے کانفرنس منعقدہ ۴ نومبر ۷۴ء سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا خطاب۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور ۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء

اچھے بھی ہوں اور علماء بگڑے ہوئے ہوں تب معاملات درست نہیں کئے جا سکتے کیونکہ علم تو یہیں سے آتا ہے۔ علم دین تو انہی کے پاس ہے امراء کی رہنمائی کریں گے تو علماء کریں گے۔ امراء اگر نیک نیت بھی ہوں تب بھی ان کو جس علم کی ضرورت ہے وہ علماء کے پاس سے ملے گا۔ اگر علماء بگڑے ہوئے ہوں تو مسلمانوں پر سب سے بڑی تباہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد علماء کی موجود ہے۔ ارکان میں بھی اور متفقین میں بھی اور بہت سے علماء جمعیت اتحاد العلماء سے وابستہ ہیں۔ جو ہماری رفیق راہ ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا بات ہے کہ ہمارے ساتھ اتنی بڑی تعداد علما کی موجود ہے۔ اور وہ واقعی علماء ہیں۔ جہلاً قسم کے علماء نہیں ہیں۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ علماء نے ایک ہلچل مچا رکھی ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ جو علماء ہیں وہ غیر متحرک کیوں ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ بالکل ساکن ہیں۔ لیکن یہ کہ ان کی حرکت قوم میں محسوس نہیں ہوتی۔ معاشرہ اس حرکت کو محسوس نہیں کرتا، معاشرہ اس حرکت سے متاثر نہیں ہوتا۔ یا تو یہ ہے کہ جو کچھ جتنے بڑے پیمانے پر جس سرگرمی سے کرنا چاہیئے تھا۔ وہ نہیں ہو رہا اور یا پھر یہ بات ہے کہ آپ حضرات کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی قوم کے اندر آپ کو حرکت کرتے ہوئے تھوڑی مدت گزری ہے ہو سکتا ہے آپ کو وہ اثرات ابھی تک حاصل نہ ہوئے ہوں جو سو پچاس برس پہلے سے جمی ہوئی گدیوں اور جمی ہوئی مسندوں کے ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں آپ نہ آ سکے ہوں دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ اس لئے میں بطور الزام آپ سے کچھ نہیں کہتا۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنی ذمہ داری کو سختی کے ساتھ محسوس کریں۔ اپنا جائزہ لیں اور جائزہ لے کر فیصلہ کریں کہ ہمیں جو کچھ کرنا چاہیئے تھا۔ ہم وہ کر رہے ہیں۔ آپ کا قلب اس پر مطمئن ہو کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس کا حق آپ ادا کر رہے ہیں۔ اگر اس میں آپ کمی محسوس کرتے ہیں تو اس کمی کو دور کرنا آپ کا اپنا کام ہے۔ آپ صاحب علم لوگ ہیں خود اپنا جائزہ لے سکتے ہیں۔ خود فیصلہ کر سکتے ہیں، خود اپنے فرائض کو جانتے ہیں۔ دین جو کچھ ذمہ داری آپ

پڑتا ہے اس سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ اس وجہ سے آپ بڑی آسانی سے اپنا جائزہ لے کر رائے قائم کر سکتے ہیں۔ کہ جو حق ہمارے اوپر اللہ کے دین کا عائد ہوتا ہے ایسے بگڑے ہوئے معاشرے میں ہمیں جو کچھ کرنا چاہیئے۔ اس کا حق ہم کہاں تک ادا کر رہے ہیں۔

اختلافات پھر سے :-

ابھی ذکر آیا ہے۔ کہ پھر سے مخالفتیں شروع ہو گئیں۔ مجھے لفظ "پھر سے" اختلاف ہے۔ یہ "پھر سے" نہیں یہ جس وقت سے کام شروع کیا۔ اس وقت سے مخالفتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ابھی دینی حلقوں کی طرف سے جاری ہے۔ جن سے توقع کی جاتی تھی کہ آواز اٹھتے ہی سب سے پہلے ساتھ دیں گے مگر معاملہ یہ پیش آیا کہ ولا تکونوا اوّل کافر بہ سب سے پہلے انہوں نے اس کی مخالفت کی اور وہ مخالفت جو اس کام کے شروع ہونے کے وقت سے شروع ہوئی ہے۔ وہ اب تک جوں کی توں چل رہی ہے۔ بلکہ جتنے آپ کے اثرات بڑھ رہے ہیں، اتنی اس کی مخالفت میں شدت پیدا ہو رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی وقت مصلحتاً زبانیں خاموش رہیں اور صرف اپنی نجی مجلسوں میں اس فتنے کو پھیلایا جاتا رہے۔ اور کبھی ضبط کرنا مشکل ہو جائے اور وہ جلسہ عام میں زبانوں پر آجائے لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ دلوں سے نکل گئی تھی اور اب کسی وجہ سے تازہ ہو گئی نہ اس وقت کوئی وجہ اس کے نکل جانے کی حقیقت میں پیدا ہوئی تھی۔ اور نہ اب کوئی وجہ اس کے دوبارہ پیدا ہونے کی قائم ہوئی ہے۔ یہ کوئی بات نہیں اس وجہ سے آپ اس طرف سے بے فکر رہیں۔ کہ جو حلقے مخالفت کرنے والے ہیں وہ کرتے ہی رہیں گے۔ اور مختلف طریقوں سے کریں گے۔

ہم دوکان دار نہیں

اب انہوں نے جب محسوس کیا کہ یہ کام کافی آگے جا چکا ہے تو مختلف، جعلی سکے لا کر

بازار میں ڈال دیئے جن پر ٹھپہ وہی ہے جو اصل سکے پر ہے اس طرح سے مسلسل ایک کام ہو رہا ہے کہ بھئی اس طرف مت جاؤ اس دکان پر بھی وہی مال ہے ۔ الحمدللہ کہ ہم دوکاندار نہیں ہیں ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ۔ کہ کون آدمی کس آستانہ پہ جاتا ہے ہم دوکاندار نہیں ہیں اگر کوئی شخص خدا کا دین کہیں اور پاتا ہے ۔ تو ہم خوش ہیں ۔ ہمارا خدا خوش ہے ۔ ہمیں کوئی اس پر رنج نہیں ۔ کوئی تکلیف نہیں ۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ مال جو ہمارے ہاں بک رہا ہے اس کو لینے کے لئے وہاں کیوں جاتا ہے اس کیفیت میں آپ اپنے آپ کو کبھی مبتلا نہ کریں ۔ اپنا کام سیدھے سادھے للّٰہ فی اللہ خالص خدا کے لئے کریں ۔ اس لئے نہیں کہ آپ کا نام بڑھے اس لئے نہیں کہ آپ کو شہرت ہو، اس لئے نہیں کہ آپ کو اثرات نصیب ہوں یہ آپ کے پیش نظر بالکل نہ ہو آپ کے پیش نظر یہ ہونا چاہیئے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برائی سے بچائیں ۔ اس کو سیدھے راستے پر لائیں ۔ اس کے خیالات کو ٹھیک کریں ۔ اس کو منظم کر کے اس کو ذریعہ بنائیں کہ یہ ملک فی الواقع دارالاسلام بنے اور خدا کا دین یہاں جاری ہو اس غرض کے لئے آپ لوگوں کو تیار کریں ۔

ہر قوت استعمال کریں ۔

اپنی قوتِ تقریر کو بھی استعمال کیجئے ۔ اپنی قوتِ تحریر کو بھی استعمال کیجئے ہر شخص اسی معاملے میں مسئول ہے جس کے لئے طاقت اللہ تعالےٰ نے اس کو دی ہے ۔ اگر کسی شخص کو اہلیت لکھنے کی دی ہے تو وہ اس میں مسئول ہے کہ اس نے اپنی لکھنے کی طاقت کو اللہ کے کام کے لئے کہاں تک استعمال کیا ہے ۔

اگر کسی کو بولنے کی طاقت اللہ نے عطا فرمائی ہے تو اس کی مسئولیت اس بارے میں ہوگی ۔ کہ اس کو بولنے کی جو طاقت دی گئی تھی اس کو دین کے کام میں کتنا استعمال کیا

ہے ہر چیز جو آپ اپنے اندر پاتے ہیں۔ جو طاقت بھی جو صلاحیت بھی اس کو اس کام میں پوری طرح استعمال کریں۔ آج ایک صاحب نے کہا کہ مساجد کو تحریکات دین کا مرکز ہونا چاہیئے۔ تو میں نے ان سے کہا ویسے تو مساجد اللہ کا گھر ہیں۔ اللہ کی عبادت کے لئے ہیں۔ لیکن ایک اچھے خاصے گروہ نے ان مساجد کو دکانوں اور اڈوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اگر آپ کو ان میں پیغام حق سنانے کا موقع میسر نہ آئے تو آپ کو خدا کی زمین پر بہت سی جگہیں ایسی مل سکتی ہیں۔ جہاں آپ لوگوں کو جمع کر کے اچھی بات سنا سکتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ مساجد ہی ہوں ------

درس قرآن وحدیث

جہاں جہاں بھی آپ درس جاری کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے، احادیث کے درس جاری کریں اور جہاں جہاں بھی آپ جلسے کر سکتے ہیں۔ دینی جلسے سیرت کے اوپر تقریریں اور اصلاح اخلاق کے متعلق تقریریں، یہ چیزیں آپ جہاں چاہیں کر سکتے ہیں۔ لوگ انشاءاللہ جمع ہوں گے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ خالص سیدھی سادی تقریریں جیسی کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریریں احادیث میں پاتے ہیں۔ جیسی کہ آپ تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں تقریریں پاتے ہیں اسی طرح کی سیدھی سادھی تقریریں، جیسی شیخ سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ کے مواعظ میں آپ دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی چیزیں کہ جو تصنع سے پاک ہوں جو لوگوں کو وہ غذا نہ دے جس غذا کے لئے اس وقت یہ تصادم ہو رہا ہے آپ کو گانے بجانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اب مساجد میں بھی انگلوامی ثقافت کی ضرورت ہے جب تک کہ مسجد میں گانا پہلے نہ ہو رہا ہو اس طرف آتے نہیں۔ عوام کو پہلے ENTERAIN کیا جاتا ہے۔ عوام کی دل چسپی کے لئے پہلے گانے گائے جاتے ہیں

تاکہ وہ جمعہ کی نماز کے لئے حاضر ہوں اور یہ چیز وہ ہے جو رفتہ رفتہ یورپ میں اور امریکہ میں آئی تھی۔ جب لوگوں کی توجہات چرچ سے ہٹنی شروع ہوئیں تو پادریوں نے یہی کرنا شروع کیا انہوں نے بھی گانے بجانے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد جب اس سے بھی کام نہ چلا تو رقص خانے کھولے گئے اس سے بھی کام نہ چلا تو اس کے بعد انہوں نے ایسے انتظامات کئے کہ لڑکے اور لڑکیاں چرچ میں جمع ہو کر کورٹ شپ کر سکیں۔ پھر بھی لوگ چرچ کی طرف نہیں آئے۔ یہاں تک کہ اب بہت سے چرچ ایسے ہیں کہ جو بالکل بے کار پڑے ہیں بک رہے ہیں۔ انگلستان میں بہت سے کلب مسلمانوں نے خریدے تاکہ وہاں وہ مسجدیں بنائیں۔ تو یہ جو ثقافت مسجدوں میں جاری کی جا رہی ہے۔ یہ اس طرف لئے جا رہی ہے آپ لوگوں کو اس راستے سے بچائیں۔

احساسِ ذمہ داری۔

آپ لوگ بالکل بے لاگ سیدھی سادھی تقریریں کریں۔ خالص خدا کے لئے کریں اور یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ جو لفظ ہماری زبان سے نکل رہا ہے۔ یہ کہیں لکھا جا رہا ہے۔ اور اس کی جواب دہی آپ کو کرنی ہوگی۔ آپ کی تقریریں ان جھگڑوں سے بالکل پاک ہونی چاہئیں۔ جن جھگڑوں سے ہماری مسجدیں بھری ہوئی ہیں۔ آپ مسلمانوں کو لڑانے کا کام نہ کریں۔ آپ مسلمانوں کو خدا کے کلمے پر، اس کے رسول کے کلمے پر جمع کرنے والے بنیں۔ آپ مسلمانوں کے ذہن سے ان چیزوں کی اہمیت نکال دیں۔ جن کی وجہ سے مسجدیں الگ الگ ہو گئی ہیں۔ نمازیں الگ ہو گئی ہیں۔ آپ انہیں بتائیں کہ اصل چیزیں جن کی جواب دہی تمہیں خدا کے سامنے کرنی ہے وہ کیا ہیں۔ یہ لوگوں کے ذہنوں میں بٹھائیں اس سے آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ لوگوں کا مذاق تبدیل ہوگا۔ اور تبدیل ہو کر پھر وہ گانے بجانے والے خطیبوں کی باتیں سننے سے از خود پریشان

ہوں گے اور جو جھگڑے کی بات کرنے والے ہیں ان کے متعلق لوگ خود محسوس کریں گے کہ یہ ہمیں بگاڑ رہے ہیں۔ سر پھٹول کرانا چاہتے ہیں۔ بھائیوں کو بھائیوں سے لڑا دینا چاہتے ہیں۔ وہ خود محسوس کریں گے اس لئے آپ ایسا نہ کیجئے کہ جیسی تقریریں وہ لوگ کرتے ہیں، اسی طرح کی ہم کریں، عوامی تقریر کا لفظ سنتے ہی مجھے یہ کھٹک گیا، میں نے کہا یا الٰہی یہ عوامی تقریر ہمارے ہاں بھی ہونے لگی پھر تو معاملہ خراب ہے۔ ہمارے علماء نے بھی عوامی تقریریں شروع کر دیں تو ہم کہاں سے اصلاح کریں گے۔ آپ اس طرح سے تقریریں کیجئے جس طرح ہمارے بزرگ کیا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو خدا سے ڈراتے تھے۔ آخرت کا احساس دلاتے تھے۔ دین کی تعلیمات سے لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ ان کے اندر اخلاص فی الدین پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی چیز رفتہ رفتہ سکہ رائج الوقت بنے گی۔ اور اسی کی مانگ ہو گی اور لوگوں کا مذاق اس سے تبدیل ہو گا۔ لوگوں کے مزاج کے مطابق آپ نے اپنے آپ کو ڈھال لیا، اور ان کی جگہ لے لی۔ تو فائدہ کیا ہوا۔ پھر تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک گانے والوں کی جگہ دوسرے گانے والے آ جائیں گے ایک جھگڑنے کرنے والوں کی جگہ دوسرے جھگڑنے کرنے والے آ جائیں گے، اس وقت آپ لوگوں کو اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ عوام الناس جو بگڑ گئے ہیں۔ آپ ان کے مطابق اپنے آپ کو نہ بگاڑیں بلکہ ان کو سنوارنے کی فکر کریں۔ انہیں سیدھے راستے پر لائیں۔ ان کا مذاق تبدیل کریں، ان کے سوچنے کا انداز تبدیل کریں۔ ان کے اندر دین کا صحیح علم پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ آخر یہ دین کا علم پہلے کتابوں کے ذریعے تو نہیں پھیلا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو زبانی تلقین سے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ یہ عوام زبانی تلقین سے عالم بن سکتے ہیں۔ اس وقت کے صحابہ میں بہت سے لوگ تھے۔ جو پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن عالم تھے۔ پڑھا لکھا ہونا اور عالم ہونا ایک چیز نہیں ہے آپ لوگوں کو دین

کا علم سکھائیں۔ ان کو بتائیں کہ اسلام کے اصل بنیادی عقائد کیا ہیں۔ ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ کیا مطالبہ ہم سے کرتے ہیں۔ ان کو نماز، روزے اور حج و زکواۃ کے مسائل سے آگاہ کریں۔ ان کی اہمیت ان کے ذہن نشین کریں۔ ان کو اخلاق فاضلہ کی تعلیم دیں ان کو بتائیں کہ اخلاق کی خرابی کے ساتھ آپ کی تمام عبادتیں بے کار ہیں۔ اگر اخلاق صحیح نہ ہوں تو آدمی کی کوئی چیز کوئی عمل مقبول نہیں ہے۔ اس طرح سے اگر آپ لوگوں کے ذہن کی اصلاح شروع کر دیں۔ اور جتنے اہل علم آپ کے ساتھ ملتے جائیں وہ سب اسی کام میں لگ جائیں تو دس سال کے اندر اس قوم کے ذہن کو بالکل بدلا جا سکتا ہے اس کے بعد مفاد پرست شخص ان کو بہکا نہیں سکے گا۔ اگر ہماری طرف سے عمل میں کوتاہی ہو تو پھر ہمیں یہ شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ فلاں کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ فلاں کا زور ہو رہا ہے۔ یہ شکایت بے کار ہے۔ ہمیں اپنی طرف سے پورا پورا کام کرنا چاہیئے۔ پوری محنت کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔ اور ان تمام فتنوں کا روکنا چاہیئے۔ جو اس زمانے میں پھیل رہے ہیں۔ اس زمانے میں فتنے وہ نہیں ہیں۔ جو پانچ چھ سو برس پہلے تھے۔ اس زمانے کے فتنوں کو سمجھئے اور ان فتنوں کے اثرات کو مٹایئے۔ لوگوں کے ذہن نشین کیجئے۔ کہ اس زمانے کے فتنے کتنے خطرناک ہیں۔ اور ان فتنوں کے اثرات کو مٹایئے۔ لوگوں کے ذہن نشین کیجئے کہ اس زمانے کے فتنے کتنے خطرناک ہیں۔ اور ان فتنوں میں مبتلا ہو کر انسان خدا کے دین سے کتنا دور چلا جاتا ہے۔ ان چیزوں کا آپ بڑے دلائل کے ساتھ معقولیت اور سنجیدگی کے ساتھ رد کریں۔ اور جن لوگوں کے اوپر کچھ اثرات ہو رہے ہیں۔ ان کو زائل کرنے کی کوشش کریں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اقبال اور پاکستان

اقبال اور پاکستان

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی تاریخ میں جو عظیم الشان اصلاحی کارنامہ انجام دیا ہے، اگرچہ وہ بجائے خود نہایت قیمتی ہے، لیکن اس کی قدر و قیمت ، اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم اس بات پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ انہوں نے کن حالات میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ کسی مصلح کے کام کو جانچنے سے صرف یہی دیکھنا کافی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا کیا کام کیا ہے، بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ حالات کیا تھے جن میں اس نے وہ کام کیا۔

۲۴ء سے ۳۸ تک کا ہندوستان

۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین زمانہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے تحریکِ خلافت میں اپنی تمام تر پونجی لگا دی تھی۔ ان کو یہ احساس تھا کہ خلافتِ اسلامیہ کو بچانے اور مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو اغیار کے قبضے سے چھڑانے کے لئے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ ہمیں کر گزرنا چاہیئے اس غرض کے لئے انہوں نے نہ اپنا مال خرچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ اپنی جانیں قربان کرنے سے کوئی دریغ کیا وہ اس مقصد کے لئے اس حد تک گئے کہ جو ہندوؤں کے متعلق

ان کو صدیوں سے تجربہ تھا وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا جذبات رکھتے ہیں انہوں نے ان کے ساتھ بھی محض اس امید پر اتحاد و تعاون کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ کسی طرح سے ہم خلافت کے ادارے کو بچا لے جائیں اور اپنے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضے سے چھڑا لیں، لیکن آخرکار اس ساری تگ و دو کا جو انجام ہوا وہ یہ تھا کہ جس خلافت کو بچانے کے لیے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی، اس کی بساط انہی لوگوں نے لپیٹ دی جن کی خلافت کے لئے مسلمان کوشش کر رہے تھے ۔ اور جن مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے وہ اپنی جان لڑا رہے تھے، انہی مقامات مقدسہ کے رہنے والے قومیت کے بت کے پرستار بن گئے ۔ اور انہوں نے آپس میں کشت و خون شروع کر دیا ۔ آپس میں عداوتوں اور لڑائیوں میں اتر آئے اور وہ خود ہی مقامات مقدسہ پر اغیار کے مستقل قبضے اور تسلط کا ذریعہ بن گئے ۔

ایک طرف تو ہندی مسلمانوں کو خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ساری کوششوں کا یہ نتیجہ دیکھنا نصیب ہوا ۔ دوسری طرف جس کانگرس کے ساتھ انہوں نے اتحاد اور جن ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے تعاون کیا تھا وہی ان پر ٹوٹ پڑے اور ۱۹۲۴ء سے ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ اس سارے عرصے میں کانگرس کے لیڈروں کو ان لوگوں کی مذمت کرنے کی بھی ہمت نہ رہی جو مسلمانوں کے ساتھ یہ مظالم کر رہے تھے ۔ گویا مسلمانوں کو اس موقع پر دوہری شکست سے دوچار ہونا پڑا ۔ ایک طرف جس مقصد کے لئے جان لڑائی تھی، وہ مقصد فوت ہو گیا ۔ اور دوسری طرف جن لوگوں سے اتحاد کیا تھا ۔ وہ مسلمانوں سے لڑنے اور انہیں تباہ کرنے کے درپے ہو گئے ۔ سب سے زیادہ انہوں نے گاندھی جی پر اعتماد کیا تھا اور انہیں اپنا لیڈر بنایا تھا، مگر خود انہی کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مرحلے پر مسلمانوں پر ہندوؤں کی زیادتیوں کے خلاف زبان کھولتے ۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یکایک ایک سخت مایوسی طاری ہو گئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں، میں اس زمانے میں موجود تھا اور ان سارے حالات کا شاہد ہوں ۔ اور بکثرت ایسے لوگ بھی ہمارے اندر موجود ہیں جن کے سامنے یہ ساری تاریخ گواہ ہے کہ کس طرح مسلمان ایک

شدید مایوسی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اس کے ساتھ اس ساری لیڈر شپ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا جنہوں نے تحریک خلافت اٹھائی تھی اور اس میں کانگریس کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ اس طرح مسلمان مایوس بھی ہوگئے اور بے قیادت بھی رہ گئے۔ پوری قوم میں ایک ہمہ گیر اور شدید انتشار کی کیفیت رونما ہوگئی۔ اس انتشار کی حالت میں مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ غیر مسلم ایک لیڈر کی لیڈر شپ میں پوری طرح متحد ہیں اور ہندوستان پر اپنے قبضے کو مکمل کرنے کے لئے ہر ممکن جدوجہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف مسلمان بالکل اس قابل نہیں کہ اس صورت حال کا مقابلہ کرسکیں اور اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر اختیار کرسکیں۔

ایک طرف تو یہ مصیبت تھی اور دوسری طرف عین اسی زمانے میں یہ فتنہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کے اندر الحاد اور دہریت کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں اور اسلام کی حقانیت پر کھلم کھلا حملے کیے جانے لگے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی اس طرح اعلانیہ الحاد و دہریت کی دعوت نہیں اٹھی تھی جس طرح کی اس زمانے میں اٹھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں کمیونزم کی اشاعت شروع ہوگئی۔ بہت سے رسائل و جرائد اس غرض کے لئے چھپنے لگے کہ مسلمانوں میں الحاد و دہریت کی تبلیغ کریں۔ اخلاقی بے قاعدگی کی تعلیم مسلمانوں کو دی جانے لگی اور کھلم کھلا دی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہونے لگی کہ کوئی شخص پڑھا لکھا بھی ہو اور وہ خدا کو بھی مانتا ہو اور نماز روزہ جیسے احکام کی پیروی بھی کرتا ہو۔ اندازِ نظر اس حد تک بدلا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو شخص نماز پڑھ رہا ہو اس کو اپنی حرکت پر شرمندہ ہونا چاہیے جو نہیں پڑھ رہا ہے، اس کو شرمانے کی ضرورت نہیں

ایک طرف تو مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی و نظریاتی اختلال کا یہ عالم تھا اور اس کے ساتھ جس مصیبت میں وہ گرفتار تھے، وہ یہ تھی کہ ان کی کوئی قابلِ اعتماد قیادت اس وقت موجود نہ تھی۔ جن لوگوں نے جنگِ عظیم اول سے پہلے اور جنگ کے زمانے میں جس حد تک بھی ہوسکا تھا اسلام کے علم کو بلند رکھا تھا، وہ یا تو خاموش ہوچکے تھے یا مسلمانوں کے اندر ان کے اثر و نفوذ کو نقصان پہنچ چکا تھا۔ یا انہوں نے اسلام کی دعوت کا راستہ چھوڑ

کہ قومیت اور وطنیت کی دعوت کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اس عالم میں صرف اقبالؒ وہ شخص تھا جس نے پوری صورت حال کا مقابلہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال پر محیط زمانے میں اسلامی تحریک اور اسلامی جذبے کے احیاء کے لئے اور مسلمانوں میں اسلامی اور ملی شعور کو ابھارنے اور بیدار رکھنے کے لئے اگر کوئی سب سے بڑی طاقت کام کر رہی تھی، تو وہ اکیلے اقبالؒ کی طاقت تھی۔ جو لوگ بھی کلام اقبالؒ پر نگاہ رکھتے ہیں اور انہوں نے ان کی نظم و نثر پڑھی ہے، وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کے گرتے ہوئے وقار کو بچانے اور انہیں اپنے مٹتے ہوئے ملی تشخص کو بچانے کے لئے کس طرح آمادہ کیا۔ اس غرض کے لئے انہوں نے نظم و نثر دونوں کی قوت سے کام لیا۔

اقبالؒ کے کارنامے کو ہم مختلف عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب کے طلسم پر وار

سب سے اہم کام جو اقبالؒ نے انجام دیا۔ وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی۔ اگرچہ یہ کام اس وقت علمائے دین اور اہل مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے۔ مگر ان کی باتوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفے اور مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لوگ ان اہل علم کی بات کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جو اگرچہ دین سے تو واقف تھے، لیکن مغربی علوم، مغربی فلسفے، مغربی تہذیب اور مغربی زندگی سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ ان کے برعکس اقبالؒ وہ شخص تھا جس کے متعلق کوئی بڑے سے بڑا جدید آدمی اٹھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ مغرب کو جانتا ہے اور اس سے زیادہ مغرب کے فلسفے اور مغربی علوم سے واقف ہے، اس لئے جب اقبالؒ نے مغربیت، مغربی مادہ پرستی، مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی، تو مسلمانوں میں مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت

کو توڑنے میں اکیلے اقبالؒ کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔

اگرچہ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی جسمانی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کی بھی کوشش کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا ذہن اگر غلام ہو تو خواہ اس کا جسم آزاد بھی ہو جائے تب بھی وہ قوم آزاد نہیں رہ سکتی۔ اس لئے اقبالؒ نے مسلمانوں کی اس ذہنی غلامی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جو ان پر طاری ہو گئی تھی۔ اقبالؒ کا یہ خودی کا فلسفہ جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی چیستان یا معمہ ہے، یہ درحقیقت اس بات کے لیے تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو پہچانیں کہ وہ کیا ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو بھول گئے تھے وہ اپنی روایات اپنی تہذیب، اپنے عقیدے اور اپنی اخلاقی اقدار کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کوئی قابل قدر چیز ہے۔ تو وہ صرف اہل مغرب کی پیش کی ہوئی ہے، یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کا اپنا سرمایہ کیا ہے اس موقع پر اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ تم دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل فخر تہذیب رکھتے ہو، تمہارے پاس دنیا کا بہترین نظام حیات ہے اور تم سب سے زیادہ صحیح اور اعلےٰ اخلاقی اقدار رکھتے ہو۔ اپنی خودی کو پہچانو اور اپنے آپ کو جانو کہ تم کیا ہو، تم نے اپنے آپ کو کھو دیا ہے اور اپنی حقیقت کو گم کر دیا ہے۔ اپنے قومی تشخص کو سمجھو اور اپنی تہذیبی سربلندی کے لئے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

اس کے ساتھ اقبالؒ نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ اسلام کوئی پرانا اور از کار رفتہ نظام نہیں ہے جو اس زمانے میں کام نہ کر سکتا ہو۔ انہوں نے اپنے شعر سے بھی اور اپنی نثر سے بھی یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ اسلام ازلی اور ابدی اصولوں کا حامل ہے۔ اسلام کسی وقت بھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصول ہر زمانے میں یکساں قابل عمل ہیں۔ اگرچہ اسلام کی حقانیت کی شہادت اس وقت علمائے دین منبروں پر بھی دے رہے تھے اور مدرسوں میں بھی، لیکن جب اس مغربی تہذیب کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے اور مغربی فلسفے پر عبور رکھنے والے آدمی نے اُٹھ کر اسلام کی حقانیت کی

شہادت دی، تو مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر اس کا نہایت گہرا اور پائیدار اثر پڑا۔ اس وقت مختلف فتنوں کی یلغار کے درمیان مسلمانوں کی جو نسل گمراہ ہو رہی تھی، اس کو بچانے کے لیے اہل منبر وہ کام نہیں کر سکتے تھے جو مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی علوم میں مہارت کاملہ رکھنے والا یہ آدمی انجام دے سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جب اس نے ایک باوقار اعتماد اور مجتہدانہ شان کے ساتھ اسلام کی حقانیت کی شہادت دی، تو نئی نسل کے اندر ایک نیا اسلامی شعور پیدا ہوا۔

وطنی قومیّت کی تردید

اس کے ساتھ علامہ اقبالؒ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا، وہ یہ ہے کہ انہوں نے وطنی قومیّت اور قوم پرستی پر ایک شدید ضرب لگائی —— ایسے حالات میں جبکہ علمائے دین تک اٹھ کر مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے مفتی علما تک مسلمانوں سے یہ کہنے لگے تھے کہ وطنی قومیت سے تمہارے دین کو کوئی خطرہ نہیں، وہ صرف علامہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے پوری شدّت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تار پود بکھیرا اور لوگوں کو پوری قوّت کے ساتھ یہ بتایا کہ وطن بھی ایک بُت ہے اور وطن کی پرستش کرنا بھی ویسا ہی شرک ہے۔ اگر اقبالؒ نے یہ تعلیم بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں کانگرس نے رابطۂ عوام (MASS CONTACT) کی جو تحریک شروع کی اور جس پر علماء اور اشتراکی حضرات بھی شریک تھے، وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح گھلا دیتی، جیسے کہ نمک پانی کے اندر گھل جاتا ہے، بلکہ اقبالؒ نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ قومیت وطن اور زبان سے نہیں بنتی، بلکہ دین اور عقیدے سے بنتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کیا کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہو، تمہاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کی تہذیب اور عقیدہ اور مسلک تم سے الگ ہے۔

وحدتِ ملّی کا احساس :- اس کے ساتھ اقبالؒ نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس

بھی ابھارا کہ تمام دنیا میں ملت اسلامیہ ایک وحدت ہے اور اس کو ایک وحدت ہونا چاہیے اس طرح انہوں نے بیک وقت دو کام کیے ——— باہر کی دنیا میں مسلمان جس طرح قوم پرستی میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے کٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے اور جس طرح ترکوں اور عربوں کے درمیان ایک المناک کشمکش برپا ہوئی اور اس کے نتیجے میں شرقِ اوسط پر جو تباہی آئی اور تمام مملکتِ اسلامیہ جس مصیبت میں مبتلا ہوئے، وہ سب اس قوم پرستی کا نتیجہ تھا جس کی تبلیغ و اشاعت عیسائیوں نے ترکوں اور عربوں کے درمیان کی تھی ——— ایک طرف تو اقبالؒ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ تم ایک ملت ہو اور جس قوم پرستی میں تم مبتلا ہو، یہ ایک بالکل غلط اور مہلک تصور ہے اور دوسری طرف انہوں نے ہندی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قوم اور ایک ملت ہو۔ تمہارا کسی دوسری قوم میں جذب ہونا سراسر ایک باطل نظریہ ہے ——— اگر اقبالؒ نے بروقت یہ اقدام نہ کیا ہوتا اور اسلامی قومیت کے صحیح تصور کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کے اندر اپنی اسلامی قومیت کا احساس نہ پیدا کر دیا ہوتا، تو آج اس پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا۔

آج اگر ہندوستان میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی وجود پر اصرار کر رہے ہیں، تو وہ اسی تعلیم کی وجہ سے کر رہے ہیں جو اقبالؒ نے اس وقت دی تھی اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا جس نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ایک قوم اور ایک ملت ہیں۔

ایک باطل تصور کی بیخ کنی

اقبالؒ نے ایک بڑا کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ دین اور سیاست کی علیحدگی اور دنیا و دین کی تفریق کا جو تصور مغرب سے آکر مسلمانوں میں پھیل رہا تھا اور جس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اہل دین کو اہل سیاست سے کیا تعلق اور دین کو سیاست میں گھسیٹنے کا کیا کام؟ اقبالؒ نے اس باطل تصور کا ٹھیک وقت پر مقابلہ کیا۔ اس نے

دین بے سیاست کی بھی برملا مذمت کی اور سیاستِ بے دین کو بھی اعلانیہ مذموم قرار دیا۔ سیاستِ بے دین کے متعلق اقبال کا ایک مصرع ایسا ہے کہ اس موضوع پر تمام دنیا کا لٹریچر ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف ——— ان کا کہنا ہے : ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اگر آپ اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں پڑھ ڈالیں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس موضوع پر ان سب کا خلاصہ اور عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبالؒ نے ان الفاظ سے دراصل یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ جب تم سیاست کو دین سے الگ کرتے ہو، تو اس کا نتیجہ سوائے وحشت و بربیت اور ظلم و ستم کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، سیاست صرف اسی صورت میں ٹھیک رہ سکتی ہے، جبکہ دین اس کو صحیح راستے پر قائم رکھنے کے لئے ایک رہنما قوت کی حیثیت سے اس کے ساتھ موجود ہو۔ اسی طرح مسلمانوں کے دماغوں میں جو یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ اہل دین کا کام تو بس اللہ اللہ کرنا ہے یا مسجدوں اور مدرسوں میں فقط قرآن و حدیث پڑھنا ہے، ان کا سیاست سے بھلا کیا تعلق ——— اس غلط تصور پر بھی اقبال نے ایک کاری ضرب لگائی۔ اور اس کو بھی ایک مصرع میں بیان کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جا سکتا ہے، وہ سب ایک طرف اور یہ مصرع ایک طرف ——— اقبال کہتا ہے ع

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس مصرع میں یہ حقیقت کھول دی گئی ہے کہ اگر دین کے پاس اپنے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کے لئے طاقت نہیں ہے، تو طاقت جس شخص یا گروہ یا نظام کے پاس ہے۔ وہ دنیا کو اپنے راستے پر ہانک کر لے جائے گا۔ آپ کے لئے کلیمی کرنے کا کیا موقع باقی رہ جائے گا۔ اور وہ کلیمی کہاں بروئے عمل آئے گی۔

اقبالؒ نے پورے زور کے ساتھ یہ بات بھی لوگوں کے ذہن نشین کی کہ موجودہ زمانے کے ازم انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جتنا ظلم و ستم فساد و غارت گری اور انسانیت کے لئے آلام و مصائب رونما ہوئے ہیں، وہ سب انہی ازموں کا کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے جس طرح ان ازموں میں سے سرمایہ داری کی مذمت

کی ہے، اس طرح سے اس نے اشتراکیت کی بھی مذمت کی ہے۔ ان کا آخری پیغام جو انہوں نے اپنی وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے آل انڈیا ریڈیو سے دیا تھا اور غالباً ان کو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ وہ یہ آخری پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔ اس میں انہوں نے بالکل وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اس وقت انسانیت جن مصائب میں گرفتار ہے اور جس ہلاکت اور تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے وہ سب ان ازموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے اس پیغام پر مشکل سے دو سال گزرے تھے کہ وہ تباہی جنگِ عظیم دوم کی صورت میں دنیا پر مسلط ہوئی اور اس کے بعد بھی اس کا خطرہ مستقل طور پر موجود ہے۔ انہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ بتایا کہ انسانوں کے خود تراشیدہ ماڈرن ازم ہی دراصل انسانوں کے مصائب کا سرچشمہ ہیں اور انہی ازموں نے اس وقت انسانیت کو مصیبتِ عظمیٰ میں مبتلا کیا ہے اور اس کے لئے تباہی اور ہلاکت کی راہیں ہموار کی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس پیغام میں اشتراکیت، سرمایہ داری، ملوکیت، آمریت، نازیت، فسطائیت سبھی کی مذمت بھی کی ہے اور انہیں انسانیت کے لئے مہلک قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ اقبال نے مثبت طور پر یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ تمہاری مصیبتوں اور مسائل کا اگر کوئی حل ہے، تو وہ صرف یہ ہے کہ تم قرآن کی پیروی کرو اور اپنی زندگیوں پر اسلام کے آئین کو نافذ کرو۔ ——— انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظمؒ کے نام جو خط لکھا تھا۔ اس میں واضح طور پر بتایا تھا کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف اسلامی آئین کے نفاذ میں مضمر ہے۔

یہ وہ کارنامہ تھا جو اقبالؒ نے اپنی زندگی میں انجام دیا۔ اب اس کے مقابلے میں اس الزام کی حقیقت دیکھیے کہ اقبالؒ خدانخواستہ سوشلسٹ تھے۔

کسی آدمی کی فکر اور اس کے نقطۂ نظر کو جانچنے کے لئے اس کی کسی عبارت سے کوئی ایک آدھ فقرہ سیاق و سباق سے الگ نکال کر اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوتا ——— دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص بحیثیت مجموعی کس نظامِ فکر کے لئے برسوں کام کرتا رہا ——— کس خیال اور نظریے

کو زندگی بھر لوگوں کے ذہن نشین کرتا رہا اور فی الجملہ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا ۔ اس لحاظ سے اگر اقبالؒ کے سارے کام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اسلام کا داعی تھا کسی دوسرے نظریے اور نظام کا داعی نہ تھا ——— وہ اس بات کا ہرگز قائل نہیں تھا کہ اسلام کے سوا کسی چیز کو یا اسلام کے ساتھ کسی چیز کو اختیار کر کے ہماری نجات ہو سکتی ہے ۔ اب یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ جن لوگوں نے اقبال کی زندگی میں اس کے کام کی وجہ سے اسے رجعت پسند قرار دیا تھا اور اس بنا پر قرار دیا تھا کہ یہ شخص صدیوں پرانے نظام کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ آج وہی لوگ اس کی وفات کے بعد کہہ رہے ہیں کہ وہ اسلام کا نہیں ، بلکہ سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کا قائل تھا ، یعنی پہلے اس شخص کو جب کہ اس کے اصلی خیالات سامنے آئے ، اس بنا پر رجعت پسند قرار دیا کہ اس کے دلائل و نظریات کا توڑ کرنا اس کے بس میں نہ تھا اور جس نظام اور نظریے کی طرف وہ ان کو بلا رہا تھا اس کے یہ لوگ دشمن تھے ۔ لیکن اس کے بعد جب دیکھا کہ اس شخص کی گرفت (HOLD) تعلیم یافتہ طبقے کے دماغوں پر بہت مضبوط ہو چکی ہے ، اور اس کی فکر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے اس لئے اس کی مذمت نہیں کی جا سکتی تو انہوں نے کہا اچھا اگر اس کو ——— (CONDEM) نہیں کر سکتے ، تو اس کو CONVERT کر دو ۔ اور کہو کہ وہ تو سوشلزم کا قائل تھا ۔ اور یہ سوشلزم بھی اقبالؒ کے کلام سے برآمد کس طرح کیا جاتا ہے ۔ ذرا ایک نظر سے بھی دیکھ لیجئے ۔ ان کا مشہور شعر ہے : ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اول تو آپ یہ دیکھیں کہ جس سلسلہ کلام میں انہوں نے یہ بات فرمائی ہے اس کے اندر اس شعر کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اے گوریلو ، اٹھو ! اور لوگوں کے کھیتوں کو جلا دو ۔ سلسلہ کلام یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ فرشتوں کو فرما رہا ہے ۔ دنیا میں جو ظلم و ستم ہو رہا ہے یہ ہمارے عذاب کو دعوت دے رہا ہے ۔ اگر لوگوں کے درمیان انصاف قائم نہ کیا

گیا، تو نہیں یہ اجازت، بلکہ حکم ہے کہ ان سب کھیتوں کو جلا دو جن سے دہقان کو روزی میسّر نہیں آتی۔ گویا وہ فرمان آدمیوں کے لئے نہیں تھا بلکہ یہ بات شاعر کے تخیل کے مطابق اللہ نے اپنے فرشتوں سے کہی تھی۔

لیکن فرض کیجئے اگر اس سلسلۂ کلام سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تب بھی شعر کا یہ مطلب اخذ کرنا صحیح نہیں۔ ایک شاعر کسی مضمون کو ادا کرنے کے لئے جب کسی بات پر زور دیتا ہے تو وہ مبالغے کی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہ سخن فہمی سے آدمی کی محرومی کی علامت ہے کہ وہ شاعر کے کسی شعر کو مفتی کا فتویٰ سمجھ بیٹھے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ غالب نے کہا تھا۔ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اب کیا واقعی غالب کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ اس کا ممدوح کروڑوں سال زندہ رہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے پیشِ نظر یہ چیز نہیں تھی۔ بلکہ اس کا مقصد اس کے حق میں درازیٔ عمر کی دُعا کرنا تھا اس بات کو ادا کرنے کے لئے اس نے مبالغے کی زبان استعمال کی اور مبالغہ شعر میں حسن پیدا کرتا ہے ـــــ اگر اقبالؒ اس موضوع پر کوئی تحریر کرتے کہ لوگوں کے اندر بے انصافی پائی جاتی ہے اور ان کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس ظلم اور بے انصافی کا ازالہ ہونا چاہیئے، تو وہ کبھی اس مقصد کے لئے لوگوں کو یہ کہتے کہ جاؤ اور جا کر کھیتوں کے ہر گوشہ گندم کو جلا دو اور بالفرض اگر کوئی شخص جا کر ان کھیتوں کو جلانے کی اجازت مانگتا تو وہ کبھی اس کی اجازت یا حکم نہ دیتے۔ شعر کی زبان میں یہ بات سمجھانے کے لئے کہ جہاں فی الواقع لوگوں کے ساتھ انصاف نہ ہو رہا ہو، وہاں لوگوں کو سبق سکھانے اور سزا دینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مبالغے کی زبان اور شاعرانہ طرزِ ادا سے کام ضرور لیا لیکن یہ کسی مفتی یا قاضی کا فیصلہ نہیں تھا۔

اسی طرح اگر اقبالؒ نے کبھی اپنی کسی تحریر میں اسلامی سوشلزم کا لفظ استعمال کیا تو اس

معنی یہ نہیں ہیں کہ اقبالؒ نے اسلامی سوشلزم کا کوئی فلسفہ ایجاد کیا تھا اور اپنی ساری عمر وہ اس فلسفے کی تبلیغ کرتے رہے — بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ آگے چل کر بعض لوگ کسی لفظ کو کیا معنی پہنانے والے ہیں۔ اس وقت اقبال نے جو بات کہی تھی، وہ یہ تھی کہ معاشرتی اور اجتماعی انصاف SOCIAL JUSTICE کے لئے کسی کو سوشلزم کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ اسلام میں بھی تو موجود ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام ہی میں موجود ہے اس غرض کے لئے اگر کسی وقت انہوں نے یہ لفظ استعمال کر بھی لیا جیسا کہ قائد اعظمؒ نے بھی کبھی یہ لفظ استعمال کر لیا ہوگا۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کا کوئی مستقل فلسفہ یا نظریہ وہ ہوتا ہے جس کی تبلیغ و تلقین اور اس کی تشریح و توضیح میں وہ اپنی قوتیں کھپاتا ہے۔ اقبالؒ نے تبلیغ میں تو اپنی ساری قوتیں اسلام کے لئے کھپائیں اور سارا زور لوگوں — کو اس بات کی طرف بلانے کے لئے صرف کیا کہ تم اسلام کے فلسفہ زندگی اور نظریۂ حیات کو اختیار کرو لیکن اگر اٹھ کر اس کی طرف یہ بات منسوب کر دی جائے کہ وہ سوشلزم کا قائل تھا، تو اس سے زیادہ بے انصافی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر اقبالؒ اسلامی سوشلزم کے قائل ہوتے، تو اس کے اصول اور تفاصیل بیان کرتے اور بتاتے کہ اس سے ان کی کیا مراد ہے اور پھر لوگوں کو اس کی تبلیغ اور تلقین بھی کرتے، مگر اس بات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا کیا ہو — اس لئے یہ ایک صریح علمی بد دیانتی INTELLECTUAL DISHONESTY ہے کہ کوئی آدمی کسی صاحب فکر کی طرف ایک ایسا نظریہ منسوب کر دے جو در اصل اس کا ہے ہی نہیں۔

سوشلزم یا کسی دوسرے غیر اسلامی نظریہ و فکر کے برعکس اقبال نے تو بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تصور دیا کہ محض سیاسی آزادی یا اقتصادی بہبود ہی تمہارا مقصود نہیں ہے بلکہ اسلام کی حفاظت تمہارا اصل مقصد ہے اس نے بار بار یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی تھی کہ ہمارا عقیدہ، ہماری تہذیب، ہماری روایات اور ہماری اسلامی اقدار ہی ہمارے لئے اصل چیزیں ہیں محض روٹی یا زمین کا ٹکڑا کوئی ایسی چیز نہیں ہے

جس کے لئے ایک انسان جیے یا مرے۔ اقبالؒ نے واضح طور پر یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو ایک وطن صرف اس لئے چاہیئے کہ وہ وہاں اسلام کے اصولوں ——— پر زندگی بسر کر سکیں۔ ان کی ۱۹۳۰ کی تقریر سے جس میں انہوں نے پاکستان کی اصطلاح استعمال کئے بغیر پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا۔ یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نظر میں اگر کوئی چیز اہم تھی تو صرف یہ کہ کسی طرح اسلام اور اہل اسلام کو سربلندی نصیب ہو۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر مسلمان اپنی تہذیب پر قائم نہیں رہ سکتے اس لئے انہوں نے صرف مسلمانوں کی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لئے ایک الگ اور آزاد مملکت کے حصول کا تصور پیش کیا ——— ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد محض کسی ایسے لفظ یا اصطلاح کی بنیاد پر جو انہوں نے اتفاقاً کسی موقع پر کسی دوسرے سیاق و سباق (CONTEXT) میں کسی دوسرے مفہوم میں استعمال کی ہو اس کی طرف کسی خاص نظریے کو منسوب کرنا صریح بددیانتی بھی ہے اور مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دینا بھی ہے۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ آپ کو اسلام کی بنیاد پر ایک وطن دے کر گئے ہیں۔ اقبالؒ نے آپ کو فکر اور نظریہ دیا۔ اور قائداعظمؒ کی قیادت میں آپ کو یہ وطن حاصل ہوا۔ اس وطن کی انوکھی شان یہ ہے کہ اس کا نظریہ پہلے وجود میں آیا اور ملک بعد میں بنا۔ اگر اس ملک کے بنیادی نظریے کو یا دوسرے لفظوں میں اس کی نظریاتی بنیاد کو ہٹا دیا جائے تو یہ ملک قائم نہیں رہ سکتا۔ آج اس ملک کی نظریاتی بنیاد پر مختلف اطراف سے حملے کئے جا رہے ہیں۔ لیکن کیا آپ اس چیز کو جو اتنی محنتوں اور عظیم قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوئی یونہی اپنی غفلت اور کوتاہ ہمتی سے ضائع کر دیں گے؟ ——— میں کہتا ہوں اگر آپ نے اس کو کھو دیا، تو تاریخ انسانی میں یہ بات ثابت کر دیں گے کہ یہ ایک بے وقوف قوم تھی جس نے لاکھوں جانیں، ان گنت عصمتوں اور کروڑوں اور عربوں روپوں کی جائیدادیں قربان کر کے ایک وطن حاصل کیا، مگر حاصل کرنے کے بعد ۲۳ برس کی مدت کے اندر ہی اندر اس کو کھو بھی دیا۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا، تو تاریخ میں آپ کا مقام ایک بے وقوف اور ایک احمق قوم کی حیثیت سے باقی رہ جائیگا

(بشرطیکہ آپ کی تاریخ کو باقی رہنے دیا گیا) اگر آج آپ نے اشتراکیت یا وطنی قومیت —— کے ذریعے یا کسی اور باطل ازم کو اختیار کیا، تو صرف یہی نہیں کہ آپ کی آزادی ختم ہو جائے گی، بلکہ یہ کہتا ہوں کہ آپ کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں، کہ اسپین کے بعد تاریخ کا یہ دوسرا بھیانک المیہ ہوگا کہ اس برِصغیر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا خاتمہ ہو گیا۔

اُمّتِ مسلمہ کے لئے دو بہترین نمونے

علیؓ اور حسینؓ

انسانی تاریخ میں جن لوگوں کو عزت و شرف کا مقام حاصل ہوا ہے۔ وہ لوگ ہیں جنہوں نے انسانیت کو کوئی درسِ ہدایت دیا، کوئی صحیح راہنمائی کی اور راہِ راست دکھانے کی کوئی خدمت سرانجام دی۔ انسان نے انہی کا احسان مانا، انہی کی عزت کی اور انہی کا نام محبت سے لیا۔

انسانی تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہ، سپہ سالار اور فاتح ہو چکے ہیں جن کے سامنے دنیا گردن جھکاتی تھی۔ مگر ان میں سے جن لوگوں نے یہ فتوحات اور حکومتیں اپنی اغراض کے لئے کیں ان کے گزر جانے کے بعد دلوں میں ان کی کوئی محبت اور عزت نہ رہی۔ ایسے ایسے بادشاہ جن کے سامنے کوئی شخص سر نہیں اٹھا سکتا تھا ان کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کی قبروں پر کوڑا کرکٹ پھینکا اور ان کو نہایت ذلت سے یاد کیا انسانوں نے انہی کی قدر کی۔ جنہوں نے انسانوں کو سیدھی راہ دکھانے کی

یہ تقریر ۱۰؍ جون ۱۹۶۲ء (محرم ۱۳۸۲ھ) کی مجلس میں فرمائی۔

کوششیں کیں۔

جہاں تک کفر کے مقابلے میں اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد اور کوشش کا تعلق ہے اس کی بے شمار مثالیں انبیاء علیہم السلام میں موجود ہیں۔ ہر جدوجہد کا نمونہ ان کی زندگی میں موجود ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ نمونہ موجود ہے کہ اگر قوم مرتد ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ جب ان کی قوم نے گوسالہ پرستی اختیار کر لی۔ تو انہوں نے ایک ایک آدمی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ الغرض اسلام کے مقابلے میں کفر و ارتداد اختیار کرنے والوں کے متعلق انبیاء کی زندگی میں نمونے موجود ہیں۔

حضرت علیؓ نے جو نمونہ پیش کیا۔ وہ اس مسئلے میں ہے۔ کہ اگر مسلمانوں کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے اور خانہ جنگی رونما ہو جائے تو ایک سچے مسلمان کا رویہ کیا ہونا چاہیئے؟ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے میں رہنمائی دی کہ اگر امت میں بگاڑ آنے لگے اور اسلامی حکومت گمراہی کے راستے پر جا رہی ہو تو ایک سچے مسلمان کو کیا کرنا چاہیئے۔

اب میں مختصراً عرض کروں گا کہ دونوں ہستیوں نے کیا نمونہ پیش کیا۔

جہاں تک استحقاقِ خلافت کا تعلق ہے۔ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع میں اختلاف ہے اور دونوں مختلف اصولوں کے قائل ہیں۔

۱۔ اہلِ سنت کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے قائل تھے کہ امت جس کو خلیفہ منتخب کرے وہی مستحق خلافت ہے اور اس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

۲ اہلِ تشیع حضرت علیؓ ہی کو مستحق خلافت سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انہی کو خلیفہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس اختلاف سے قطع نظر اصل بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں حضرت علیؓ نے کیا کیا۔ انہوں نے تلوار اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کوئی فوج جمع کر کے کوئی جتھا بنایا۔ بلکہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے اتفاق کر لیا۔ اور ان کی اطاعت کرتے رہے یعنی جب امت ایک خلیفہ پر جمع ہو گئی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس سے گریز کیا کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔

اہل سنت کی تاریخیں شہادت دیتی ہے کہ حضرت علی رضؓ کو حضرت عثمان رضؓ کی بعض پالیسیوں سے اور بعض باتوں سے اختلاف تھا مگر اس وجہ سے انہوں نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ جب باغی چڑھ آئے تو ان کو باغیوں سے بچانے کے لئے اپنے صاحب زادوں کو پہرے پر مقرر کیا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ آیا جب کہ خود ان کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی اس وقت تین گروہوں سے ان کی جنگ ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور خوارج۔

ان تینوں صورتوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک تلوار نہیں اٹھائی جب تک وہ مطمئن نہیں ہو گئے۔ کہ وہ تلوار اٹھانے میں حق بجانب ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جنگ ہوئی۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کو فتح ہوئی۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تسلیم کیا کہ حق علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا چنانچہ جنگ جمل کو یاد کر کے وہ رو پڑتی تھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا۔ کہ ان کی حکومت ابھی ابھی قائم ہوئی ہے جب تک وہ اپنا نظام قائم نہ کر لیں اس وقت تک قاتلینِ عثمان کی تحقیق نہیں ہو سکتی اور اس کے لئے یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ قاتلینِ عثمان کو پکڑ کر سزا دی جائے دوسرے اگر یہ کارروائی ضروری بھی ہو تو ملک کی رعایا کے چند یا زیادہ آدمیوں کو سزا دلوانے کے لئے تلوار کے زور سے مطالبہ کرنا درست نہیں ہے چند آدمیوں کو یہ حق نہیں کہ وہ تلوار لے کر کھڑے ہو جائیں کہ فلاں لوگوں کو سزا دی جائے حضرت علیؓ کو یقین ہو گیا کہ یہ مطالبہ

غلط ہے۔

جنگ صفین کے معاملے میں ایک علاقے کا گورنر مطالبہ کرتا تھا کہ چونکہ میں مقتول کا رشتہ دار ہوں۔ اس لئے قاتلوں کو میرے حوالے کیا جائے، اور دوسرے یہ کہ معزول کئے جانے پر تلوار اٹھائے حضرت معاویہؓ کے یہ دونوں مطالبے غلط تھے۔ گورنری کوئی موروثی جاگیر نہیں ہے۔ اور بیس بائیس برس تک حضرت معاویہؓ کا گورنر بھی رہنا درست نہ تھا۔ پھر ان کا مطالبہ قاتلین عثمان کو سزا دینے کا شخصی ہوسکتا تھا۔ گورنر کی حیثیت سے نہیں۔ لہٰذا کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ حق حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھا۔

تیسرا معاملہ خوارج کا ہے۔ حضرت علیؓ کا فیصلہ یہ تھا۔ کہ خوارج اپنے خیالات رکھ سکتے ہیں۔ مگر ان کو تلوار لے کر اپنے خیالات دوسروں پر مسلط کرنے کا حق نہیں یعنی ایک مسلمان کو خیالات رکھنے کا حق ہے۔ بغاوت کرنے اور تلوار اٹھانے کا نہیں چنانچہ قتل اور خونریزی کی ابتداء خوارج کی طرف سے ہوئی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ جنگ کی۔

پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تین گروہوں سے خونریز لڑائیاں پیش آئیں۔ مگر انہوں نے کسی موقع پر بھی حدود اللہ سے تجاوز نہیں کیا جنگ کے دوران میں بھی ان حدود کا لحاظ رکھنا ایک امام ہدیٰ ہی کا کام ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں کو ان کی طرف سے اس بات کی سخت ہدایت تھی کہ زخمی اور بھاگ گئے والوں کو قتل نہ کیا جائے شکست کھانے والوں کا مال، مال غنیمت نہیں ان کے بیوی بچے لونڈی غلام نہیں بنائے جائیں گے تم صرف ان کا زور توڑ دو۔ جنگ جمل کے موقع پر بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ شکست کھانے والوں کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کون ہے۔ جو ام المومنین حضرت عائشہؓ کو لونڈی بنائے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا مسلمان کے ساتھ مسلمان کی طرح جنگ کرو۔ یہ کام حضرت علیؓ ہی کر سکتے تھے۔ انہی کو اس کا حوصلہ تھا۔

کہ جب دشمن مغلوب ہو کر ان کے منہ پر تھوک دے۔ تو وہ اس کے سینے پر سے اُتر آئیں۔ کہ اب اگر میں نے تمہیں قتل کیا تو اس میں رضائے الٰہی کے ساتھ میرا نفس بھی شامل ہو جائے گا۔ جو نفس پر اتنا قابو رکھتا ہو۔ وہی یہ نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

یہ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا۔ کہ بعد میں مسلمانوں نے آپس کی جنگوں میں وہ رویّہ اختیار نہ کیا۔ جو عیسائیوں نے آپس کی جنگوں میں اختیار کیا۔ اور بدترین بربریّت کا ثبوت دیا۔ عیسائیوں میں پچھلی صدی کے آغاز تک یہ روش رہی۔ کہ وہ عیسائی قیدیوں کو غلام بناتے تھے۔ اور عورتوں کو لونڈیاں۔ ان کے پاس کوئی نمونہ نہیں تھا۔ مگر مسلمانوں کے پاس نمونہ حضرت علیؓ تھے۔ انہوں نے تیرہ سو برس پہلے یہ نمونہ پیش کر دیا تھا۔ کہ مسلمانوں کی لڑائی مسلمانوں سے پیش آئے تو حدیں اور ہیں اور کفار و مرتدین سے پیش آئے تو حدیں اور ہیں۔

حضرت حسین علیہ السلام

اگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور غیر اسلامی طریقے سے چلائی جا رہی ہو، تو مسلمانوں کو سخت الجھن پیش آتی ہے۔ قوم مسلمان ہے حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے مگر چلائی جا رہی ہے غیر اسلامی طریقے پر تو اس حالت میں ایک مسلمان کیا کرے، اگر حضرت حسینؓ نمونہ پیش نہ کرتے تو کوئی صورت رہنمائی کی نہ تھی۔

حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ میں صلح ہو گئی تھی۔ اور خلافت حضرت معاویہؓ کو حاصل ہو گئی تھی۔ بعد میں کتنی ہی باتیں ایسی سرزد ہوئیں جو حضرت حسینؓ کے نزدیک نامناسب تھیں۔ مگر انہوں نے حضرت معاویہؓ کو ہٹانے کی کوئی کوشش نہ کی اس وجہ سے ایک خلیفہ وقت سے ان کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ دوسرے تلوار اٹھانا ناگزیر نہیں ہو گیا تھا۔ اگر کسی مسلمان حکومت کا بگاڑ جزئیات میں ہے تو نظم و نسق درہم برہم کرنے کی کوشش روا نہ ہو گی۔ مگر جب بادشاہ یا خلیفہ نے اس حکومت کو موروثی بنانے کی کوشش

کی تو اصولی تغیر واقع ہو گیا ایک خاندان نے حکومت کو اپنی جائیداد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ خواہ اس میں ان کی جان جائے، اور ان کا بچہ بچہ کٹ جائے۔

اسلامی حکومت کی اصولی نوعیت یہ ہے کہ:۔

۱۔ ملک اللہ کا ہے۔

۲ اس پر حکومت مسلمانوں کی ہے۔

۳ جس حکومت سے مسلمان راضی ہوں وہ صحیح حکومت ہے۔

۴ جس کے ہاتھ میں حکومت ہو وہ ملک کے بیت المال اور خزانے میں اس طرح تصرف کرے جس طرح یتیم کے مال میں تصرف کرنے کا حکم ہے یعنی اگر مفلس ہے تو بقدر کفاف اس میں سے لے اگر غنی ہے تو اس سے اجتناب کرے۔

حضرت امیر معاویہؓ بغیر رضامندی عوام کے حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔ ان کی حکومت میں مسلمانوں کی رضامندی کو کوئی دخل نہ رہا تھا۔ اور ملک کے مال میں بھی تصرف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تاہم حضرت حسینؓ نے برداشت کیا۔ مگر جب اس میں یہ تغیر کیا گیا۔ کہ حکومت کو موروثی بنا دیا جائے تو حضرت حسینؓ نے ولی عہدی اور ولی عہد کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ جو کہا جاتا ہے۔ کہ حضرت حسینؓ نے کہا تھا۔ کہ مجھے یزید کے پاس لے جاؤ میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ تو یہ درست نہیں۔ بلکہ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو اور پھر اس سے فیصلہ کرنے دو خواہ وہ میرے قتل ہی کا فیصلہ کر دے۔

حضرت حسینؓ نے یہ نمونہ پیش کیا۔ کہ اگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور وہ غلط راہ پر جا رہی ہو تو اس کے خلاف جدوجہد درست ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صحابہ نے تو بیعت کر لی تھی حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کی اور وہ ان کو مطعون کرتے ہیں حالانکہ جب کوئی مسلمان حکومت پوری طاقت سے قائم ہو تو اس

کے خلاف اٹھنا ہماشما کا کام نہیں صرف وہ اٹھ سکتا ہے جو فیصلہ کر چکا ہو کہ وہ اٹھے گا خواہ کچھ ہو جائے جو لوگ ایسی بات کہتے ہیں ان کو صحابہؓ کی طرف سے صفائی پیش کرنی چاہیئے۔ نہ کہ حضرت حسینؓ کو مطعون کرنا اٹھنے والے سے صفائی پیش کرنے کا مطالبہ کرنے کا کیا موقعہ ہے۔ صحابہ کرامؓ کی پوزیشن صاف کی جاسکتی ہے ہر شخص کا یہ کام نہیں تھا۔

یہ حضرت حسینؓ ہی کا نمونہ تو ہے کہ جو مسلمان حکومت کے بگاڑ کے وقت مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے اگر اس نمونے کو بھی بگاڑ دیا جائے تو نمونہ کہاں سے آئے گا معاملہ صرف یہ نہیں کہ جگر گوشہ رسولؐ کو قتل کر دیا گیا۔ اور ہم نوحہ خوانی کے لئے بیٹھے ہیں بلکہ نمونہ حاصل کرنے کا ہے۔

حضرت علیؓ کا نمونہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اختلاف ہو تو کیا کرنا چاہیئے اور حضرت حسینؓ کا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حکومت بگڑ رہی ہو تو مسلمانوں کا کام تماشبین بن کر بیٹھنا نہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اصلاح کے لئے کھڑا ہو جائے خواہ اکیلا ہی ہو اور خواہ کچھ نتیجہ ہو۔

امیر اور مامور

اسلامی نظام میں امیر اور مامور کی ذمّہ داریاں۔

تحریکِ اسلامی کا مقصد ایک آزمائش

جماعت اسلامی کے امیر اس کے رہنما اور اس کے لیڈر کا انتخاب وہ نوعیت نہیں رکھتا جو کسی اور جماعت کا ہو سکتا ہے۔

تحریک اسلامی کا منصب ایک آزمائش

اس منصب پر جس شخص کو فائز کیا جائے، وہ مبارک باد کا مستحق نہیں ہوتا۔ بلکہ اظہار ہمدردی، رحم اور ترس کا مستحق ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر ایک ایسے کام کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس میں اگر اس سے کوتاہی ہو جائے یا ادائے فرض میں کسی حد تک بھی دانستہ خامی رہ جائے تو وہ دنیا میں ہی ارکان کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور دنیا میں ہی جماعت کے لئے نقصان دہ نہیں بلکہ آخرت میں بھی اس کے لئے جواب دہ ہے۔ کیونکہ اس جماعت نے یہ کام اپنے ذمے لیا ہے کہ خدا کے دین کو اس کی زمین پر عملاً قائم کیا جائے اور اس راستے میں جو طاقتیں بھی حائل ہوں ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ان کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جائے۔ اور ان کی مزاحمت کرنے کی صورت میں جو آفت اور جو مصیبت بھی نازل ہو اس کو برداشت کرے اور عام ارکان سے زیادہ مصائب برداشت کرے اس وجہ سے میں اپنے پرانے رفیق اور دست و بازو میاں طفیل محمد[لہ] صاحب سے اظہار ہمدردی کرتا ہوں کہ جماعت نے پھر

[لہ] یہ حلف میاں صاحب کے انتخاب امارت پر ہی لیا جا رہا تھا۔

ان پر یہ ذمہ داری عائد کر دی۔ حالانکہ انہوں نے پچھلے پانچ سال اتنی سخت محنت کی ہے اور دین کی خدمت میں اتنا کچھ برداشت کیا ہے کہ اب حقیقت میں وہ رحم کے مستحق تھے۔ تاہم میں اس پر خوش بھی ہوں کہ جماعت نے اسی شخص کو دوبارہ منتخب کیا ہے جو شخص جماعت کے اندر اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ جو ابتدا سے جماعت کے پورے نظام کو سمجھنے اور تحریک کو چلانے میں میرے ساتھ شریک رہا۔ اور اس قدر جماعت کے نظام اور تحریک کو سمجھنے والا اور شاید ہی کوئی ہو۔

اس موقعہ پر میں دو چیزوں کو الگ الگ بیان کروں گا۔ ایک جماعت میں امیر جماعت کی ذمہ داری، دوسرے جماعت میں کارکنوں اور ارکان کی ذمہ داریاں امیر کے ساتھ۔

امیر جماعت کی ذمہ داریاں

امیر جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ساتھیوں کو لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور ان کے اوپر اس طرح حکم چلانے کی کوشش نہ کرے۔ جس سے ان کے اندر ضد یا بددلی پیدا ہو۔ بلکہ دلی رفاقت، دلی محبت اور دلی خلوص کے جذبے سے ان کو متاثر کرے۔ اور ارکانِ جماعت اس کے حکم کے منتظر نہ رہیں بلکہ اس کا منشا سمجھ کر ہی تعمیل کے لئے آمادہ ہوں۔ امیر جماعت کے حکم دینے کی بہت کم ضرورت پیش آئے۔ ارکانِ جماعت کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ اس امر کا لحاظ رکھیں کہ ان کا امیر کیا چاہتا ہے۔ اور ان کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس سے انحراف اگر درست ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ جب وہ شریعت کے خلاف کوئی بات کر رہا ہو، یا آپ محسوس کریں کہ وہ مصلحت کے خلاف کام کر رہا ہے۔

ان دونوں چیزوں میں سے جس چیز کو بھی آپ محسوس کریں آپ کا فرض ہے کہ امیر جماعت کے ساتھ اخلاص سے بات کر کے اس تک اپنا اعتراض پہنچائیں اور امیر جماعت کا

بھی فرض ہے کہ جب اس کو لوگوں میں اس کی کسی بات پر عدم اطمینان کا احساس ہو تو وہ انہیں مطمئن کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف قرآن میں یہ فرمائی گئی ہے کہ تم درشت خو ہوتے، سنگدل ہوتے تو یہ مسلمان جو تمہارے گرد جمع ہوئے ہیں وہ تمہیں چھوڑ کر الگ ہو چکے ہوتے۔ اس میں اس چیز کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جماعت کے اندر اس کے رہنما کی حیثیت کیا ہونی چاہیئے۔

- اس کی حیثیت یہ ہونی چاہیئے کہ
- وہ ارکان جماعت سے محبت کرے اور ارکان اس سے محبت کریں۔
- اس کی حیثیت یہ ہونی چاہیئے کہ ارکان جماعت اس کے خلوص پر اعتماد کریں۔ اور وہ ارکان جماعت کے خلوص پر اعتماد کرے۔
- اس کو جماعت کے اندر رحیم اور شفیق، ہمدرد اور مونس و غمخوار ہونا چاہیئے۔
- اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والے ارکان اور کارکنوں کی ہر تکلیف میں اسے ان کا ساتھی ہونا چاہیئے۔
- امیر جماعت کے لئے ارکان جماعت بھی دعائے خیر کریں اور وہ بھی ارکان جماعت کے لئے دعائے خیر کرے۔

ارکان اور کارکنوں کی ذمہ داریاں

جماعت کے ارکان اور اس کے کارکنوں سے میں کہوں گا کہ ان کا یہ کام ہے کہ وہ معروف میں اپنے امیر کی اطاعت کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ ایک اسلامی نظام جماعت میں جو شخص بھی امیر ہوتا ہے اگرچہ اس کو منتخب تو کرتے ہیں جماعت کے ارکان، لیکن حقیقت میں وہ جماعت کے اندر نائب رسول ہوتا ہے۔ اس لئے ان سب لوگوں پر جو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی اطاعت لازم ہے۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے، کہ جماعتی فیصلے لازماً ہر شخص کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کوئی جماعت بھی ایسی نہیں ہے۔ جس کے اندر جماعتی فیصلے اس جماعت کے ہر رکن اور ہر کارکن کو پسند ہوں اور اس کی پسند کے مطابق ہوں لازماً کہیں نہ کہیں اختلاف یا ناراضی کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ کہیں نہ کہیں آدمی غیر مطمئن ہوتا ہے۔ لیکن جب جماعتی فیصلہ ہو جائے اور امیر جماعت جماعت کے نظم کے تحت ایک چیز کا فیصلہ کر لے تو پھر چاہے وہ فیصلہ آپ کو ناگوار ہو یا خوشگوار آپ کا کام یہ ہے۔ کہ اس کی تعمیل کریں۔ اِلّا یہ کہ وہ معروف کے مطابق نہ ہو۔

معروف سے مراد یہ ہے کہ وہ نیکی اور وہ بھلائی جس کو ہر آدمی اپنے ضمیر میں جانتا ہے۔ کہ یہ نیکی اور بھلائی ہے۔ اگر امیر جماعت معروف کے مطابق حکم دے رہا ہے۔ اور شریعت کے خلاف وہ حکم نہیں ہے تو پھر اس کی پیروی کیجیے۔ البتہ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اس نے شریعت کے خلاف حکم دیا ہے تو پھر آپ کا فرض یہ ہے۔ کہ آپ امیر جماعت سے بھی کہیں، مجلس شوریٰ میں بھی کہیں، مجلس عاملہ میں بھی کہیں کہ میرے نزدیک امیر کا فلاں حکم شریعت کے فلاں حکم سے ٹکراتا ہے اگر وہ آپ کو مطمئن کر دے کہ وہ حکم شریعت کے حکم سے نہیں ٹکراتا تو پھر آپ کو تسلیم کرنے کے لیے سر جھکا دینا چاہیے۔ ورنہ کوئی جماعت اور کوئی نظام جماعت بھی اپنا کام نہیں کر سکتا۔

اگر ہر آدمی کا رویہ یہ ہو کہ وہ امیر جماعت یا مجلس عاملہ یا شوریٰ کے فیصلوں پر محض اس بنا پر ناراض ہو کہ وہ فیصلے اسے پسند نہیں اور وہ اس طرح اپنے اندر ناخوشی پیدا کرے جیسے اسے کوئی زخم آ گیا ہے تو پھر کام نہیں چل سکتا۔ یہ چیز اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ آدمی جماعت میں داخل ہونے کے بعد اپنے دل سے کبر نہ نکال دے۔ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنا ہی بیماری کی جڑ ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود بنی اسرائیل کی درخواست پر ان کے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کو کہاں سے ہم پر حکمرانی کا حق پہنچتا ہے ہم تو خود اس کے

اہل ہیں اصل یہی کبر ہے یہی کبرِ نفس ہے یعنی اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنا ۔ کبرِ نفس اسلام کے راستے میں سب سے بڑا مانع ہوتا ہے ۔ حضورؐ کے زمانے میں بھی جن لوگوں کے اندر کبر تھا۔ وہ اسلام میں آنے کے بعد پھر مرتد ہو گئے اس لئے کہ حضورؐ کے احکام ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوتے تھے۔

جماعت کے ارکان کا یہ کام ہے کہ وہ کبر کو دل سے نکالیں اور کبر کبھی ایسے شخص کے دل میں نہیں ہوتا ہے جو اپنی حقیقت کو جانتا ہو کہ میں کیا ہوں کس طرح پیدا ہوا ہوں میں کس طرح بچے سے جوان ہوا ہوں اور جوان سے بوڑھا ہوا ہوں۔ اور میری کیا حیثیت ہے اس دنیا کے اندر ایک ٹھوکر لگ جائے تو میں ختم ہو سکتا ہوں ایسا آدمی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے دماغ میں بڑائی کی ہوا پیدا نہیں ہو سکتی وہ سمجھ سکتا ہے کہ کبریائی خدا کے سوا اور کسی کے لئے نہیں ہے، تو جب کبر نکل جائیگا عاجزی پیدا ہو گئی انکسار آئے گا تو آدمی اپنی حقیقت کو خود سمجھ لے گا۔ عرفانِ نفس اس کو حاصل ہوگا۔ اس صورت میں وہ اطاعت سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ اگر جماعت کے ارکان کی اکثریت امیر پر مطمئن ہے اور مجلسِ شوریٰ کی اکثریت امیر جماعت کے ساتھ ہمنوا ہو کر کوئی فیصلہ کرے تو چاہے آپ کو گوارا ہو یا ناگوار۔ اس کی اطاعت کیجئے اس کی پیروی کیجئے اور اپنے آپ کو یہ نہ سمجھئے کہ باقی سب نالائق ہیں ایک میں ہی لائق ہوں۔ اس لئے کہ یہ بڑائی کا خیال ہے اسے اپنے دماغ سے نکال دیجئے۔

اللہ تعالیٰ سے توفیق کی دعا :- اب میں اللہ تعالےٰ دعا کرتا ہوں کہ وہ میاں طفیل محمد صاحب کو جن پر امارت کی ذمہ داری کا بار پڑا ہے اس ذمہ داری کو احسن طریقے پر نبھانے اور اس کے تقاضے ادا کرنے کی طاقت عطا فرمائے ان کی رہنمائی فرمائے اور ان کو اتنی توفیق بھی عطا فرمائے کہ وہ اس نظام کو اور تحریک کو صحیح طریقوں پر چلائیں اور اللہ تعالیٰ ارکان جماعت کے اندر بھی یہ صلاحیت پیدا فرمائے کہ وہ اپنے نظم کی پوری پوری پابندی کریں اور کسی طرح بھی فرائض رکنیت ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

خطباتِ حرم

(مئی ۱۹۷۳ء میں حج کے موقع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ممالک سے آئے ہوئے اُن حجاج سے حج کے موضوع پر خطاب کیا تھا جن کی زبان اُردو تھی۔ مولانا نے یہ تقریریں ۵ر ۶ر اور ۷ر ذی الحجہ کو نمازِ عصر کے بعد حرمِ پاک میں زمزم کے مقام پر کی تھیں)

لَبَّيْكَ ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ
لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ
لَبَّيْكَ ، اِنَّ الْحَمْدَ
وَالنِّعْمَةُ لَكَ وَالْمُلْكُ
لَاشَرِيْكَ لَكَ

”مَیں حاضر ہوں، میرے اللہ مَیں حاضر
ہوں، مَیں حاضر ہوں،
تیرا کوئی شریک نہیں، مَیں حاضر ہوں۔
یقیناً ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے
سارے احسانات تیرے ہی ہیں
بادشاہی سراسر تیری ہے۔
تیرا کوئی شریک نہیں۔“

پہلا خطبہ

حمد و ثنا کے بعد!

برادرانِ اسلام! یہ ہم سب کی انتہائی خوش بختی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے اس گھر کی زیارت کا شرف بخشا اور یہ موقع نصیب فرمایا کہ ہم یہاں حج کے لئے آئیں اور ان "آیاتِ بیّنات"[1] کو دیکھیں جو اس سرزمین میں عموماً اور خانہ کعبہ اور مسجد حرام میں خصوصاً نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں آکر ایک آدمی اگر کھلی آنکھوں سے دیکھے اور سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کو ہر طرف اللہ کی نشانیاں ہی نشانیاں نظر آئیں گی جنہیں دیکھ کر اس کا دل ایمان سے بھر جائے گا۔

حضرات! آج سے چار ہزار برس پہلے یہ جگہ بالکل ایک سنسان وادی تھی۔ دنیا سے الگ تھلگ اس ریگستان میں، ان پہاڑوں کے درمیان، اس وادی میں اللہ کا ایک بندہ آتا ہے اور ایک چار دیواری کھینچ کر اعلان کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور دنیا بھر کو پکار دیتا ہے کہ آؤ اس کا حج کرو۔ اب دیکھیے آخر کیا بات ہے کہ چار ہزار برس سے دنیا بھر کے انسان اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس گھر کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں اور آج تک

---

[1] اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف جس میں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ "اس میں روشن نشانیاں ہیں" (آل عمران۔ ۹۷)

تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا ہے کہ اس کا حج اور اس کے گرد طواف نہ ہوا ہو۔ کوئی دوسرا انسان ذرا ہمت کرکے کوئی جگہ بنا کر تو دیکھے اور اس کو قبلۂ عالم بنانے کے لئے اپنی سعی پوری کوشش کرکے دیکھ لے، اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ کتنے انسان اس کی طرف کھنچ کر آتے ہیں۔ یہ صریح علامت ہے اس بات کی کہ حضرت ابراہیمؑ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نبی تھے انہوں نے فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی اور اس کے حکم سے یہ گھر بنایا تھا۔ ان کے بنائے ہوئے اس گھر کو واقعی اللہ تعالےٰ نے شرف قبولیت عطا فرمایا ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا حکم تھا جس کے تحت انہوں نے دنیا کو حج کی دعوت عام دی تھی۔ اسی وجہ سے اس گھر کو اور اس دعوتِ عام کو یہ کشش نصیب ہوئی۔ کہ صدہا برس سے دنیا بھر کے انسان اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن مجید اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ اللہ ہی تھا جس نے اس گھر کی تعمیر کے لئے اس جگہ کو منتخب فرمایا اور حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ اس کا حج کرنے کیلئے دنیا بھر کو پکار دیں۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ (الحج: ۲۶-۲۷)

"اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ تجویز کی تھی اس ہدایت کے ساتھ کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھ، اور لوگوں کو حج کے لئے پکار دے کہ وہ آئیں تیرے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار"

حضرات! یہ اسی فرمانِ خداوندی کی برکت ہے کہ آج لاکھوں آدمی لبیک اللّٰھم لبیک کی صدائیں بلند کرتے ہوئے فوج در فوج یہاں آ رہے ہیں اور پروانوں کی طرح اس خانہ کعبہ کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ ان آیات بینات میں سے اولین اور نمایاں ترین نشانی ہے جو اس

گھر میں آپ دیکھ رہے ہیں۔

اب ذرا ایک اور نشانی ملاحظہ فرمایئے۔ اس گھر کی تعمیر جب ہوئی تھی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا تھا کہ ہم اسے لوگوں کا مرکز و مرجع ہی نہیں بلکہ امن کا گھر بھی بنا دیں گے۔ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا (البقرہ: ۱۲۵) اس اعلان پر چار ہزار برس گزر چکے ہیں۔ اور اس وقت سے آج تک یہ امن ہی کا گھر بنا ہوا ہے نہ صرف یہ خود امن کا گھر ہے۔ بلکہ جس شہر میں یہ واقع ہے وہ بھی امن کا شہر ہے اور اس کے گرد و پیش کئی کئی میل تک کا پورا رقبہ ایک ایسا حرم ہے جس کے اندر کسی نوعیت کی بدامنی نہیں ہو سکتی آج روئے زمین پر اس حرم پاک کے سوا کوئی دوسرا گز بھر کا خطہ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جسے اس معنی میں حرم شریف ہونے کا شرف حاصل ہو، اور آج ہی نہیں کبھی دنیا میں کوئی دوسرا ایسا نہیں پایا گیا ہے جس کا وہ احترام کیا گیا ہو جو اس حرم کا ہوا ہے۔ اس کی حرمت کا اندازہ آپ اس بات سے کیجئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ڈھائی ہزار برس کا زمانہ عرب کی سرزمین میں ایسا گزرا ہے جس میں یہ ملک نظم و آئین سے محروم تھا۔ یہاں کوئی حکومت نہ تھی کوئی قانون نہ تھا۔ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی قتل و خون اور غارت گری کا زور تھا کسی کے لئے جان و مال اور عزت و آبرو کی امان نہ تھی لیکن اس پورے ملک میں صرف یہ حرم پاک ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں ان ۲۵ صدیوں کے دوران میں کامل امن قائم رہا۔ عرب کے وہ لوگ جو شوقیہ خونریزی اور لوٹ مار کرتے تھے جن کے قبائل میں سو سو برس تک مسلسل لڑائیاں ٹھنی رہتی تھیں، اور پشت در پشت انتقام کا چکر چلتا رہتا تھا۔ ان کا بھی یہ حال تھا کہ اس حرم کے حدود میں پہنچتے ہی ان کے ہاتھ رک جاتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی یہاں پا لیتا تھا تو اس سے انتقام نہ لے سکتا تھا۔ یہ اس کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ مانا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس خطہ پاک کو حرم اور امن کا گھر بنا دیا تھا۔ یہ اللہ جل شانہ کے فرمان ہی کی برکت تھی کہ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا "جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں آ گیا"۔ (آل عمران: ۹۷)

اللہ کی قدرت کے سوا دنیا میں کوئی طاقت اس انتہائی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے زمانے میں ڈھائی ہزار برس تک یہاں امن قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی نشانی کی طرف اللہ تعالیٰ کفار قریش کو توجہ دلاتا ہے کہ :

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۔ (عنکبوت : ۶۷)

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پُرامن حرم بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اُچکے جا رہے ہیں"۔

اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ایک اور نشانی ہے جو اس سرزمین میں پائی جاتی ہے آپ ذرا وسیع نگاہ سے عرب کی تاریخ اور عرب کے ملک پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی قوم کا ایک قوم کی حیثیت سے باقی رہنا اور عربی زبان کا اس قوم کی زبان کی حیثیت سے زندہ رہ جانا بھی اسی بیت اللہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں آج کوئی ملک ایسا نہیں پایا جاتا، نہ کبھی پایا گیا ہے جس کا رقبہ تو اتنا وسیع ہو جتنا عرب کا ہے اور پھر اس پورے ملک میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ اور دنیا میں کوئی ایسا ملک نہ آج موجود ہے اور نہ کبھی موجود رہا ہے جس میں چار ہزار برس سے ایک ہی زبان بولی جا رہی ہو۔ اتنی لمبی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں اور اتنے وسیع و عریض ملکوں میں ایک نہیں بیسیوں بلکہ سینکڑوں زبانیں بن جاتی ہیں خصوصیت کے ساتھ جس ملک میں ہزاروں برس تک بدامنی اور بدنظمی رہی ہو، اور جو ملک صدیوں قبائلی لڑائیوں کی آماجگاہ بنا رہا ہو اس کے اندر تو یہ وحدت باقی رہ جانا بالکل ہی ایک عجوبہ ہے لیکن یہ معجزہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس سرزمین میں کر کے دکھا دیا۔ اور اس کا ذریعہ یہی خانہ کعبہ اور یہی حج تھا۔

یہ خانہ کعبہ اور یہ حج اس کا ذریعہ کیسے بنا؟ اس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو مرکز و مرجع (مثابة للناس) بنایا اور حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں کو اس کا حج کرنے کی دعوت عام دے دیں تو اس کے ساتھ یہ بھی فیصلہ فرما دیا کہ سال میں چار مہینے

(ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم حج کے لئے اور رجب عمرے کے لئے) حرام قرار دیے دیئے جائیں۔ حکم دے دیا گیا کہ ان چار مہینوں میں لڑائی بند رہے۔ حج اور عمرے کے لئے آنے جانے والوں کو کوئی نہ چھیڑے اور ان جانوروں پر بھی کوئی ہاتھ نہ ڈالے جو قربانی کے لئے بیت اللہ کی طرف لائے جا رہے ہوں۔ یہ حکم صرف ایک بندۂ خدا کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی حکومت نہ تھی، اس کے پاس کوئی فوج، پولیس یا عدالت نہ تھی۔ کہ اس کے زور سے وہ اس قانون کو جاری کرتا۔ مگر اس کی پشت پر اللہ رب العالمین کی طاقت تھی جس کے زور سے یہ حکم نافذ ہوا اور عرب کے باشندے نسلاً بعد نسلٍ اس کی پیروی کرتے چلے گئے۔

اس حکم کی برکت یہ تھی کہ عرب کی سرزمین کو ہر سال چار مہینے امن و امان کے میسر آجاتے تھے۔ جن سے فائدہ اٹھا کر ملک کے ہر گوشے سے قافلے بیت اللہ کی طرف آتے تھے، قبائل کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ آزادانہ تجارت ہوتی تھی، میلے لگتے تھے، شاعری اور خطابت کے مقابلے ہوتے تھے۔ اور عرب کے دوسرے حصوں میں بھی قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ اس طرح عربوں میں ایک قوم ہونے کا احساس زندہ تھا۔ ان کی زبان محفوظ رہی اور وہ تمام عربوں کی ایک ہی زبان بنی رہی۔ ان کی ثقافت اور ان کی روایات باقی رہیں۔ اور یہ قوم کٹ کٹ کر مر جانے سے بچ گئی۔ یہ سب کچھ اس گھر کا صدقہ اور اسی گھر کا کرشمہ ہے۔ اسی کی بدولت ایک قوم مرنے سے بچی۔ ایک زبان مٹنے سے بچی اور ایک ملک کے اندر ایک ہی زبان اور ایک ہی تہذیب برقرار رہی یہ گھر نہ ہوتا اور یہ حج نہ ہوتا تو ہزاروں برس کی بدامنی و بدنظمی اور طوائف الملوکی سے قوم عرب اور عربی زبان اور عربی ثقافت کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔

ایک اور نشانی ملاحظہ ہو جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی ایک بیوی اور ایک بچے کو لا کر چھوڑا تھا اس وقت یہاں کوئی شہر تو درکنار برائے نام کوئی چھوٹا سا گاؤں تک نہ تھا۔ اس حالت میں ان کی زبان پاک سے یہ دعا نکلتی ہے کہ:-

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ
تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُوْنَ ۔

(ابراهیم: ۳۷)

"اے ہمارے رب میں نے اپنی نسل کا ایک حصہ لا کر بے آب و گیاہ وادی میں بسا دیا ہے، تیرے حرمت والے گھر کے پاس اسے پروردگار، اس لئے کہ وہ نماز قائم کریں پس لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ یہ شکر گزار ہوں "

اب دیکھیے کہ اس دعا کا ایک، ایک لفظ کس طرح پورا کیا گیا۔ اس بیت اللہ کے گرد یہ شہر مکہ آباد ہوا۔ حج نے اس کو تمام عرب کا مرکز بنا دیا۔ تجارتی قافلے عرب کے ہر حصے سے یہاں آنے لگے اور یہاں سے گزرنے لگے۔ اسلام سے صدیوں پہلے یہ شہر ایک تجارتی منڈی بن چکا تھا اور دنیا بھر کا مال کھنچ کھنچ کر یہاں آتا تھا۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو مکہ کے بازاروں میں آپ کو نہ مل جاتی ہو اسی چیز کو اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں بیان فرماتا ہے۔

اَوَلَمْ نُمَکِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰی اِلَیْهِ ثَمَرَاتُ کُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا
مِّنْ لَّدُنَّا (القصص: ۵۷)

"کیا ہم نے اہل مکہ کے لئے ایک پُرامن حرم نہیں بنا دیا ہے جس کی طرف ہر طرح کے پھل چلے آتے ہیں۔ ہماری طرف سے رزق کے طور پر۔

حضرات! عرب اور عربی قوم اور عربی زبان پر یہ ساری عنایات جس مقصد عظیم کے لئے فرمائی گئی تھیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک دعا کو پورا کرنا تھا جسے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ

لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (البقرہ: ۱۲۷-۱۲۹)

اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس گھر کی نبیادیں اٹھا رہے تھے تو وہ یہ دعا کر رہے تھے کہ "اے ہمارے رب، ہماری اس سعی کو قبول فرما لے، یقیناً تو سب ہی کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔ اے ہمارے رب، اور ہم دونوں کو اپنا مسلم (فرمانبردار) بنا لے اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیری مسلم ہو۔ اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہمارے قصور معاف کر بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے ۔ اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات سناتے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے ۔ یقیناً تو ہی زبردست حکیم ہے ۔"

یہ تھا وہ اصل اہتمام جس کے لئے عرب قوم اور عربی زبان کو زندہ رکھنے کا اہتمام فرمایا گیا تھا جس کی تفصیل ابھی آپ نے سنی ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو یہ دعا، اور اس کے نتیجے میں آخر کار اسی شہر مکہ سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا اور پھر یہیں سے ایک عظیم الشان امت مسلمہ کا اٹھنا جو دنیا میں قیامت تک کے لئے توحید کی علمبردار بنی، یہ اللہ جل شانہ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے جس کا مشاہدہ آپ اس حرم پاک میں کر رہے ہیں ۔

یہی شہر مکہ ہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت الی اللہ کا آغاز فرمایا تھا اور یہی صفا کی پہاڑی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے سب سے پہلے قریش کے خاندانوں کو نام بنام پکار کر اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کی تلقین فرمائی تھی ۔ اس شہر کے سرداروں نے حضورؐ کی اس دعوت کو دبا دینے کے لئے اپنا سارا زور صرف کر دیا ۔ یہ حرم کی زمین، یہ ابوقبیس کا پہاڑ

اور یہی گھاٹیاں، سب اس ظلم و ستم کے گواہ ہیں جو ۱۳ سال تک حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ پر توڑا گیا تھا۔ مگر آخر کار ان سب لوگوں نے نیچا دیکھا جنہوں نے دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ دیکھیے آج یہاں ابوجہل اور ابولہب کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے اور اس حرم کے میناروں سے پانچوں وقت اشہد ان محمد رسول اللہ کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

یہی خانہ کعبہ ہے جس کی دیوار کے نیچے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور حال یہ تھا کہ مکہ میں ہر طرف مسلمانوں پر بے تحاشا ظلم ہو رہا تھا اس حالت میں حضرت خباب بن الارت نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، کیا آپؐ ہمارے لئے دعا نہ فرمائیں گے؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا "یہ کام تو پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا۔ جب ایک مسافر صنعا سے حضرموت تک بے خوف و خطر سفر کرے گا۔ مگر تم لوگ بے صبری کر رہے ہو۔" اللہ کے رسولؐ کی یہ بات حرف بحرف پوری ہوئی اور چند سال کے اندر ہی وہ وقت آگیا جب اسلام کی حکومت نے پورے جزیرۃ العرب میں مکمل امن قائم کر دیا۔

یہی خانہ کعبہ ہے جس کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنجی مانگی تاکہ بیت اللہ میں داخل ہو کر عبادت کریں۔ اس نے نہ صرف یہ کہ انکار کیا بلکہ حضورؐ کے ساتھ بدکلامی کی۔ آپ خاموشی کے ساتھ اس کی سخت سست باتیں سنتے رہے اور پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "اے عثمان تم دیکھو گے کہ ایک روز یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور مجھے اختیار ہوگا کہ جسے چاہوں دے دوں۔" عثمان نے کہا، اگر ایسا ہوا تو وہ دن قریش کے لئے ہلاکت اور ذلت کا دن ہوگا۔" حضورؐ نے فرمایا "نہیں وہ قریش کے لئے عزت اور سرفرازی کا دن ہوگا۔" یہ قول بھی پتھر کی لکیر ثابت ہوا۔ اس بات کو دس سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مکہ معظمہ فتح ہوا۔ اسی عثمان بن طلحہ کو حضورؐ نے حکم دیا کہ کلید خانہ پیش کرے۔ اس نے بے چون و چرا پیش کر دی۔ حضرت عباسؓ نے باصرار درخواست کی کہ اب کلید برداری کعبہ کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد کر دی جائے۔ لیکن حضورؐ نے

وہ کنجی اسی عثمان بن طلحہ کو عطا کی اور فرمایا:۔

خذوھا خالدۃ لا ینزعھا منکم الاظالم" لے لو، یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے اس کو کوئی نہ چھینے گا مگر ظالم"۔ یہ ارشاد بھی پورا ہو کر رہا۔ آج تک اس گھر کا کلید بردار وہی خاندان چلا آرہا ہے جسے فتح مکہ کے روز حضورؐ نے اس کی کنجی سپرد فرمائی تھی۔

یہی شہر مکہ ہے جس کے لوگوں سے حضورؐ نے اپنی دعوت کے ابتدائی زمانہ میں فرمایا تھا کہ میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ جسے اگر تم مان لوگے تو عرب اور عجم سب اس کی بدولت تمہارے تابع فرمان ہو جائیں گے۔ کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العرب۔ قریش کے لوگوں نے اس وقت اس بات کو جھوٹ سمجھا تھا۔ وہ اس کے برعکس اپنی جگہ پر سمجھ رہے تھے کہ اس کلمے کو ہم نے قبول کر لیا تو تمام عرب ہم پر ٹوٹ پڑے گا اور ہماری ریاست تو کیا، ہمارا وجود بھی یہاں باقی نہ رہ سکے گا۔ وہ کہتے تھے کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔ اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو ہم اپنی جگہ سے اُچک لئے جائیں گے لیکن اللہ کے رسول کی زبانِ مبارک سے جو کچھ نکلا تھا وہ لفظ بلفظ پورا ہو کر رہا۔ قریش کے جن لوگوں نے حضورؐ کی یہ بات اپنے کانوں سے سنی تھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ چند سال کے اندر عرب اور عجم سب خلافتِ اسلامیہ کے تابع فرمان ہو گئے اور قریش ہی کے خلفا اس عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ گھر صرف عرب کا مرکز تھا اور عرب ہی اس کے حج کے لئے آتے تھے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرایا کہ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ "جہاں بھی تم ہو، نماز میں تم اپنا رُخ اسی کی طرف پھیرو" اور جب مالکِ زمین و آسمان نے اپنے آخری نبی کے ذریعے سے یہ فرمان صادر کیا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا "اللہ کا حق ہے لوگوں پر اس گھر کا حج، جو شخص بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو" تو یہ گھر تمام دنیا کے لئے مرکزِ قبلہ بن گیا۔ آج دنیا کا کوئی گوشہ

ایسا نہیں ہے جہاں اس گھر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے والے موجود نہ ہوں، اور کوئی خطہ زمین ایسا نہیں ہے، جہاں سے اللہ وحدہٗ لاشریک کے ماننے والے اس کا حج کرنے کے لئے نہ آرہے ہوں۔ جس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان احکام کا اعلان ہوا تھا اس وقت اسلام کا نفوذ و اثر صرف مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھا۔ کوئی شخص بھی اس وقت یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ احکام تمام روئے زمین پر اور اتنے بڑے پیمانے پر نافذ ہوں گے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب دس دس لاکھ آدمی دنیا کے ہر حصہ سے کھنچ کر یہاں جمع ہوں گے۔ خداوندِ عالم کی طاقت کے سوا اور کون سی طاقت ایسی ہو سکتی تھی جو اس خانہ کعبہ کو یہ مقبولیت، یہ مرکزیت اور یہ کشش عطا کر دیتی۔

حضرات! یہ اللہ عزوجل کی بے شمار نشانیوں میں سے چند نمایاں نشانیاں ہیں جن کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سرزمین میں آنے کی سعادت بخشی ہے تو آپ اس کا پورا فائدہ اٹھائیں اور یہاں سے گہرا، سچا اور پختہ ایمان لے کر جائیں۔ یہاں اللہ کی جو نشانیاں نظر آتی ہیں وہ آدمی کا دل اس یقین سے بھر دینے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ اس کے بنانے والے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام حقیقت میں اللہ کے رسول تھے اور جن عظیم الشان ہستی کی بدولت یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شرک و بت پرستی سے پاک ہو کر تمام دنیا کے اہلِ توحید کا قبلہ اور مرکز و مرجع بنا اس کی نبوت و رسالت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

دوسرا خطبہ

حمد و ثنا کے بعد!

برادرانِ اسلام! ہر عبادت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر سے مراد وہ عملی شکل ہے جو کسی عبادت کو ادا کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اور باطن سے مراد وہ معنی ہیں۔ جو اس عملی شکل میں مضمر ہوتے ہیں اور جن کے اظہار کی خاطر عمل کی وہ شکل مقرر کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز کا ظاہر یہ ہے کہ آدمی قبلہ رخ کھڑا ہو، رکوع کرے، سجدہ کرے، بیٹھے اور ان ظاہری افعال سے نماز کی جو شکل قائم کی جاتی ہے اس سے مقصود دراصل اس معنی کا اظہار ہے کہ بندہ اپنے رب کے حضور بندگی کا اظہار کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں اپنی انانیت سے دست بردار ہو رہا ہے۔ اس کی بڑائی اور اپنی عاجزی تسلیم کر رہا ہے۔ اور اس کے آگے اپنے وہ معروضات پیش کر رہا ہے جو اس کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ اب دیکھیے جو شخص نماز کی ظاہری شکل کو ٹھیک ٹھیک احکام و ہدایات کے مطابق قائم کر دے وہ بلاشبہ ادائے نماز کی قانونی شرائط پوری کر دیتا ہے۔ اس کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی، یا اس کے ذمہ فرض باقی رہ گیا ہے۔ لیکن آپ غور کریں گے تو خود محسوس کرینگے کہ نماز کا پورا پورا فائدہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو نماز کے اعمال میں سے ہر عمل کرتے وقت اس کی روح کو بھی نگاہ میں رکھے اور نماز کے اذکار میں سے ہر ذکر کو

زبان سے ادا کرتے ہوئے اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ رہے۔

ایسا ہی معاملہ حج کا ہے اس کو ادا کرنے کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس پر آپ خواہ سمجھ کر عمل کریں یا بے سمجھے بوجھے، بہرحال جب آپ شارع کے مقرر کردہ مناسک ادا کر دیں گے تو حج ادا ہو جائے گا، اور فرض سے یقیناً آپ سبکدوش ہو جائیں گے۔ لیکن حج کی اس ظاہری شکل کے ہر ہر جز میں جو معنی پوشیدہ ہیں ان کو بھی اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور حج کے اعمال انجام دیتے وقت ہر عمل کی غرض و غایت کی طرف بھی متوجہ ہوں تو اس سے مقصد حج کی تکمیل ہو جائے گی۔ اور آپ حج کے فوائد سے پوری طرح متمتع ہوں گے۔ اسی غرض کے لئے آج میں آپ کے سامنے حج کے اعمال میں سے ایک ایک عمل کے معنی سیدھے سادے اور مختصر طریقے سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

احرام

اعمال حج میں سب سے پہلا عمل احرام ہے، باہر سے آنے والا کوئی حاجی میقات سے اس وقت تک نہیں گزر سکتا جب تک وہ اپنا لباس اتار کر احرام نہ باندھ لے اور اسی طرح مکہ معظمہ سے حج کی نیت کرنے والے کو بھی سب سے پہلے لباس تبدیل کر کے احرام باندھنا ہوتا ہے۔ یہ ایک انتہائی فقیرانہ لباس ہے جس میں آدمی بس ایک تہمد باندھ لیتا ہے، ایک چادر کندھوں پر ڈال لیتا ہے اور سر ننگا رکھتا ہے۔ یہ اس عمل کی ظاہری صورت ہے۔ مگر غور سے دیکھیے کہ اس ذرا سے فعل میں کتنے گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ حج شروع کرنے سے پہلے ہمارے وہ سارے لفافے اتروا دینا چاہتا ہے جو ہم نے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں جن کے اندر ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو اپنی اصل حقیقت سے کچھ نہ کچھ زائد بنا رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم بندے ہو اور بندے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو۔ لہٰذا میرے دربار میں حاضر ہونا چاہتے ہو تو صرف بندے بن کر آؤ۔ تم کہیں کے بادشاہ یا صدر مملکت ہو تو ہوا کرو۔ کوئی جنرل ہو، وزیر ہو، رئیس ہو یا جو کچھ بھی ہونا ہوتے رہو، میرے حضور میں تمہیں اپنی ساری حیثیتیں ختم کر کے صرف ایک

بندے کی حیثیت سے آنا ہوگا۔ اس طرح احرام کا یہ لباس ہر انسان کو بندگی کے مقام پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے، اس کی ہر شان امتیاز مٹا دیتا ہے اور ایک بڑے سے بڑے شخص کو بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی سطح پر لے آتا ہے آپ حالتِ احرام میں حاجیوں کے کسی مجمع پر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو آپ کو کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان میں کون اونچا اور کون نیچا ہے، کون امیر اور کون غریب ہے، کون حاکم اور کون محکوم ہے اللہ کے دربار میں سب ایک ہی طرح کے فقیر نظر آئیں گے۔

اونچ نیچ برابر کرنے کے ساتھ یہ احرام مسلمانوں کے درمیان تمام قومی نسلی اور وطنی امتیازات بھی ختم کر دیتا ہے۔ اسلام کے ماننے والے دنیا کے ہر حصے سے چل کر آتے ہیں مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر طرف سے ملک ملک کے لوگ طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے اپنے گھروں سے چلتے ہیں، مگر جونہی کہ وہ مرکزِ اسلام سے ایک خاص فاصلے پر پہنچتے ہیں، ان کو یکایک میقات کی سرحد پر روک کر ان کے تمام قومی لباس اتروا دیئے جاتے ہیں اور سب کو ایک ہی طرح کا لباس پہنا دیا جاتا ہے تاکہ خداوندِ عالم کے دربار میں جب وہ حاضر ہوں تو انسان اور مسلمان کے سوا اور کچھ نہ ہوں مسلمانوں کے اندر ملتِ واحدہ ہونے کا احساس پیدا کرنے کی اس سے زیادہ کارگر تدبیر شاید ہی کوئی دوسری ہو سکے۔ آپ کے سامنے لاکھوں حاجیوں کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے جس میں سینکڑوں قومیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گزر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ احرام کی برکت ہے کہ ہر دیکھنے والی نگاہ ان کو ایک ملت اور ایک ہی قوم کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور ان کے سارے وطنی و نسلی امتیازات دب کر رہ جاتے ہیں۔

پھر یہ احرام آدمی کو حیوانیت سے دور اور ملائکہ کے مقام سے قریب کر دیتا ہے اس حالت میں وہ کوئی جوں تک نہیں مار سکتا۔ کوئی بال تک نہیں اکھاڑ سکتا، کسی جانور کا شکار خود کرنا تو درکنار دوسرے کو بھی کسی قسم کی مدد شکار میں نہیں دے سکتا۔ اپنے جسم کی زینت و آرائش بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتی۔ اس کی اپنی بیوی بھی اس کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ جو عام حالات میں اس کے لئے حلال ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس کی طرف کسی شہوانی

میاں تک کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے فحش گوئی، بدکلامی، لڑائی جھگڑا سب کچھ ممنوع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے خادم کو بھی ڈانٹنے کا مجاز نہیں رہتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ احرام باندھتے ہی آدمی اللہ کا فقیر بن گیا اور اس نے تمام خواہشاتِ نفس کو تیاگ دیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کو اس کی طرف سے امن و سلامتی کا پیغام ہے۔ اب کسی کو اس سے ضرر کا اندیشہ نہیں۔ اب وہ کسی کے لئے بھی جبار و قہار اور ظالم نہیں رہا۔ اب وہ دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہونے اور کبریائی کا ہر شائبہ اپنے نفس سے نکال دینے کے بعد بس ایک بندہ عاجز ہے جو اپنے خدا کے حضور اپنی نیاز مندی پیش کرنے کے لئے جا رہا ہے۔

حضرات! یہ ہے احرام کی اصل روح۔ آپ جب غسل یا وضو کر کے احرام باندھتے ہیں اور اُن قواعد کی پابندی کرتے ہیں جو حالتِ احرام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں تو اس سے عمل کی صرف ظاہری شکل قائم ہوتی ہے۔ یہ شکل بناتے ہوئے اگر آپ کا ذہن اس تصور سے خالی ہو کہ یہ شکل آپ نے کیوں بنائی ہے تو یہ گویا ایک جسم ہو گا جس میں جان نہ ہو۔ جان اس میں اُسی وقت پڑے گی جب آپ پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اپنے اندر وہ باطنی کیفیات بھی پیدا کر لیں جو درحقیقت احرام سے مقصود ہیں۔ قانون کی نگاہ میں تو ہر شخص محرم وہی ہے جو احرام باندھتے ہی فی الواقع ایک فقیر اور ایک بندہ عاجز بن کر رہ گیا ہو جس نے اپنے دماغ سے کبریائی کی ہوا نکال دی ہو جس نے قومی و نسلی تعصبات کو بھی اپنے ذہن سے نکال باہر کیا ہو، جو خلقِ خدا کے لئے سراپا رحم اور خیرِ مجسم بن گیا ہو، اور جس نے حیاتِ دنیا کی زینتوں سے منہ موڑ کر کم از کم یہ چند دن تو صرف اپنے رب سے لو لگانے کے لئے خالی کر لئے ہوں۔

تلبیہ

احرام باندھنے کے بعد آپ تلبیہ شروع کر دیتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:

لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ

وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَاشَرِيْكَ لَكَ۔

"میں حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، یقیناً ساری تعریف تیرے ہی لئے ہے، سارے احسانات تیرے ہی ہیں۔ بادشاہی سراسر تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں"

ان الفاظ پر غور کیجئے۔ ان کے اندر خود یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ غلام کو اس کے آقا نے طلب کیا ہے۔ اور غلام اس کے جواب میں لبیک لبیک کہتا ہوا اور اپنے مالک کی تعریف کے گن گاتا ہوا دوڑا چلا جا رہا ہے۔ بیت اللہ کی طرف طلبی ہوئی۔ اس نے عرض کیا میں حاضر۔ عرفات بلایا گیا، اس نے کہا میں حاضر۔ مزدلفہ طلب کیا گیا، اس نے کہا میں حاضر۔ منیٰ طلب کیا گیا۔ اس نے کہا میں حاضر۔ اس ساری دوڑ دھوپ کے دوران میں یہ الفاظ آپ زبان سے کہتے رہیں۔ تو قانون کا تقاضہ پورا ہو جائے گا، مگر اس تلبیہ کی اصل روح یہ ہے کہ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرتے ہوئے آپ اپنے دل کی گہرائیوں میں فی الواقع آپ یہ محسوس کریں۔ کہ آپ اللہ کے بندے اور غلام ہیں۔ اس کی طرف سے آپ کی طلبی ہوئی ہے، اور جہاں جہاں حاضر ہونے کی طلبی ہوتی جا رہی ہے وہاں آپ لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس لبیک میں ایک نشہ ہے جو لازماً ہر اس بندۂ حق پر طاری ہو جائے گا۔ جسے یہ احساس ہو کہ خداوندِ عالم کی طرف سے اس جیسی ناچیز ہستی کی طلبی ہو رہی ہے۔

یہ نصیب! اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

حرم کی حاضری

باہر سے آنے والے ہر حاجی کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے، اور یہی اس کو کرنا بھی چاہیئے کہ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد جلدی سے جلدی حرم میں حاضر ہو۔ پھر جب وہ حرم میں داخل ہوتا ہے اور بیت اللہ پر اس کی نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پر ایک ہیبت طاری ہوتی ہے جو اللہ تعالےٰ کے جلال کا کرشمہ ہے، اور اس کا دل بے اختیارانہ کعبہ کی طرف کھچتا ہے جو اللہ جل شانہ کی محبت کا فطری تقاضا ہے۔ اس موقع پر اسے دل اور زبان سے

اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا چاہیے اور پورے شعور کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے،

اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَعْظِيْمًا وَّتَشْرِيْفًا وَّتَكْرِيْمًا وَّمَهَابَةً وَّبِرًّا۔

"خدایا، اس گھر کو زیادہ سے زیادہ عظمت و شرف اور بزرگی اور دبدبہ عطا فرما، اور اسے زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا مرکز بنا دے"

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ

"خدایا تو خود ہر عیب و نقص سے پاک ہے اور عیوب و آفات سے سلامتی جس کو بھی نصیب ہوتی ہے تیری ہی طرف سے نصیب ہوتی ہے لہٰذا اے پروردگار ہمیں جسم و روح کی سلامتی کے ساتھ جینے کی توفیق عطا فرما"

ضروری نہیں ہے کہ یہ دعائیں آپ عربی زبان ہی میں مانگیں، اصل چیز ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی دعا اللہ سے مانگنا ہے جو ان فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ کو عربی الفاظ یاد کرنے اور پڑھنے میں دقت ہو تو آپ اسی مضمون کی دعا اپنی زبان میں بھی مانگ سکتے ہیں۔

طواف

حرم میں پہنچنے کے بعد ہر حاجی کو طواف کرنا ہوتا ہے، اگر احرام باندھتے وقت اس نے تمتع یا قران کی نیت کی ہو تو وہ عمرے کا طواف کرتا ہے[1]۔ اور اگر افراد (یعنی صرف حج) کی نیت کی ہو تو طوافِ قدوم کرتا ہے۔ پھر یوم النحر کو اسے طوافِ افاضہ اور مکہ چھوڑتے وقت طوافِ وداع بھی کرنا ہوتا ہے اور ان ضروری طوافوں کے علاوہ بھی یہ ایک ایسی نفلی

---

[1] تمتع یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے احرام کھول دے اور پھر حج کا وقت آنے پر نئے سرے سے احرام باندھے اور قران یہ ہے کہ آدمی ایک ہی احرام میں عمرہ اور حج دونوں کرے۔

عبادت ہے جس کا موقع باہر سے آنے والوں کو صرف زمانۂ قیام مکہ ہی میں نصیب ہو سکتا ہے اس لیے اس موقع سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا جا سکے اٹھانا چاہیئے ۔

یہ طواف کیا ہے ؟ یہ انسان کے اس فطری جذبے کا اظہار ہے کہ جس ہستی کو وہ اپنا منعم و محسن سمجھتا ہے اور اپنا معبود مانتا ہے اس پر اپنے آپ کو فدا کرے ۔ اس کے گرد گھومے اور صدقے اور قربان ہو ۔ اللہ تعالےٰ بذات خود اس سے بالاتر ہے کہ ہم اسے پا سکیں اور اس کے گرد گھوم سکیں ۔ اس نے ہمارے اس جذبے کی تسکین کے لیئے اس خانہ کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور ہمیں ہدایت کی ہے کہ مجھ پر فدا ہونے کی جو خواہش تمہارے دل میں ہے اسے میرے گھر کا طواف کر کے پورا کر لو پس جب آپ اس گھر کا طواف کریں تو عشق کے جذبے سے سرشار ہو کر اس طرح طواف کیجئے جیسے ایک عاشق اپنے محبوب حقیقی کے صدقے ہو رہا ہے ۔

ہر طواف کی ابتدا حجر اسود کے بوسے یا استلام سے ہوتی ہے ۔ یہ درحقیقت ایک پتھر کا بوسہ نہیں ہے بلکہ محبوب کے سنگ آستاں کا بوسہ ہے ۔

اسی طرح طواف اور مقام ابراہیم کی دو رکعتوں سے فارغ ہونے کے بعد مُلتزم سے چمٹ کر جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ بھی یہی سمجھتے ہوئے مانگنی چاہیئں ۔ کہ یہ ہمارے مالک کے گھر کی چوکھٹ ہے ۔ مالک خود تو اس سے بالاتر ہے کہ ہم اس کا دامن تھام سکیں ہماری نارسائی پر ترس کھا کر اُس نے یہ گھر ہمارے لیئے بنا دیا ہے تاکہ اس کے دامن سے لپٹ کر اپنی آرزوئیں پیش کرنے کی جو تمنا ہمارے دل میں ہے اُسے ہم اُس کے گھر کی چوکھٹ سے لپٹ کر پورا کر لیں ۔

طواف کے دوران میں پڑھنے کے لیئے جو لمبی چوڑی دعائیں بعض لوگوں نے لکھی ہیں ان کا یاد کرنا اور پڑھنا کچھ ضروری نہیں ہے ۔ اور یہ طریقہ تو بالکل ہی فضول ہے کہ ایک معلّم آگے آگے دعا پڑھتا جا رہا ہے اور حاجیوں کی ایک ٹولی کی ٹولی اس کی غلط سلط نقل اتارتی جا رہی ہے ۔ طواف کے لیئے اِن دعاؤں کو شریعت نے ہرگز لازم نہیں کیا ہے ۔ اور نہ اس بے معنی طریقے سے ان کو ادا کرنے کا کوئی فائدہ ہے ۔ بس یہ کافی ہے کہ آپ

طواف شروع کرتے وقت حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کی طرح ہاتھ اٹھائیں۔ اور بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ کہہ کر طواف شروع کریں۔ پھر دورانِ طواف میں اللہ کا ذکر کرتے چلے جائیں اور اس سے دعا مانگتے جائیں۔ ذکر کے لئے سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے الفاظ کافی ہیں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دعا جو کچھ بھی آپ کے دل سے نکلے اور جس زبان میں بھی آپ مانگ سکیں، مانگتے رہیں۔

حجرِ اسود کا بوسہ دینے کے لئے جو ہجوم اور دھکا پیل لوگ کرتے ہیں یہ ایک ناروا فعل ہے، بلکہ اس میں ایک دوسرے کی جو سخت مزاحمت کی جاتی ہے وہ توجہ کو ضائع کرنے والی حرکت ہے۔ خصوصاً عورتوں کا دھکا پیل میں گھسنا تو بالکل ہی ناجائز ہے۔

شریعت نے آپ پر لازم نہیں کیا ہے کہ آپ ضرور حجرِ اسود کو بوسہ ہی دیں۔ یہ کام اگر مزاحمت کے بغیر نہ ہو سکتا ہو تو ہر چکر کے خاتمے پر حجرِ اسود کے سامنے پہنچ کر اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرنا اور اپنے ہاتھ ہی کو چوم لینا شرعاً بالکل کافی ہے۔

جس طواف کے بعد سعی کرنی ہو اس میں اصطباع اور رمل بھی کیا جاتا ہے۔ اضطباع یہ ہے کہ احرام کی چادر کو سیدھے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیا جائے اور دایاں شانہ کھلا رکھا جائے۔ اور رمل یہ ہے کہ پہلے تین طواف شانے ہلا ہلا کر چھوٹے چھوٹے قدم ڈالتے ہوئے ذرا تیزی کے ساتھ کئے جائیں۔ یہ دراصل اس واقعے کی یادگار ہے کہ صلح حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لائے تھے تو کفارِ مکہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مدینے کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ پہلے تین طوافوں میں اضطباع اور رمل کریں تاکہ کفار کے سامنے اہل اسلام کی طاقت کا مظاہرہ ہو۔ اسی یادگار کو آج تک باقی رکھا گیا ہے اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بندے کا اکڑ کر چلنا ویسے تو اللہ تعالےٰ کو سخت ناپسند ہے۔ مگر جب اس کے دشمنوں کے سامنے اسلام کی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے یہ چال اختیار کی جائے تو پھر یہی

چال اللہ کو محبوب ہو جاتی ہے۔

مقام ابراہیم

طواف سے فارغ ہونے کے بعد آپ مقام ابراہیم پر پہنچتے ہیں اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مقام پر جو پتھر رکھا ہے یہ وہی پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھائی تھیں۔ پھر اسی پر کھڑے ہو کر انہوں نے اللہ کے حکم سے اس ویران و سنسان مقام پر تمام خلق کو حج کے لئے پکارا تھا۔ اور اسی پکار کے جواب میں آج آپ لبیک لبیک کہتے ہوئے آج یہاں آئے ہیں۔ پھر یہ پتھر خانہ کعبہ کی دیوار سے متصل رکھا ہوا تھا۔ بعد میں اسے موجودہ مقام پر رکھ دیا گیا۔ اس مقام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اسے نماز کی جگہ بنالو۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ طواف کعبہ کے بعد یہ دو رکعتیں اسی فرمانِ خداوندی کی تعمیل میں پڑھی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی آپ کے علم میں رہنی چاہیئے کہ تمام دنیا کے لئے قبلہ مسجد حرام ہے، اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لئے قبلہ خانہ کعبہ ہے اور مسجد حرام کی نماز باجماعت کے لئے امام کا قبلہ وہ مقام ہے جہاں سے حضرت ابراہیمؑ نے دنیا کو حج کے لئے پکارا تھا حضرت ابراہیمؑ خود بھی اسی مقام پر کھڑے ہو کر کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اور آج بھی حرم کی نماز باجماعت کا امام اسی جگہ کھڑا ہوتا ہے۔

سعی بین الصفا والمروہ

مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز ادا کرنے اور ملتزم پر دعا کرنے کے بعد آپ زمزم پر آتے ہیں اور اس کا پانی پیتے ہیں۔ پھر عمرے کی تکمیل کے لئے صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرتے ہیں۔ یہ سب کام آپ غفلت و بے خبری کے ساتھ نہ کریں بلکہ اپنے دل میں سوچیں کہ یہ زمزم کیا جگہ ہے، جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ پانی کیسا ہے جسے آپ پی رہے ہیں۔ یہ صفا کیسی پہاڑی ہے جس سے آپ سعی کی ابتدا کرتے ہیں اور یہ سات چکر کیسے ہیں

جو آپ صفا اور مروہ کے درمیان لگاتے ہیں۔

حضرات! ان میں سے ہر مقام اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے اور اس تاریخ کے اندر ایک درسِ عبرت ہے۔ آج بیت اللہ اور زمزم اور مقامِ ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی حضرت ہاجرؓ اور اپنے شیرخوار بچے حضرت اسماعیل کو صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلہ کھجوروں کا دے کر بالکل یک و تنہا چھوڑ گئے تھے۔ یہاں کوئی پانی نہ تھا کوئی غذا کا سامان نہ تھا۔ دُور دُور تک کوئی بستی نہ تھی۔ اور بظاہر یہ دونوں ماں بچے اس سنسان وادی میں قطعی بے سہارا تھے۔ حضرت ابراہیم جب انہیں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو حضرت ہاجرہ ان کے پیچھے چلنے لگیں، بار بار پوچھتی تھیں کہ آپ ہمیں کہاں چھوڑے جا رہے ہیں۔ مگر وہ خاموش چلے جا رہے تھے۔ آخر حضرت ہاجرہ نے پوچھا "کیا یہ کام آپ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا ہاں! اس پر حضرت ہاجرہ نے کہا۔ اگر یہ بات ہے تو اللہ یقیناً ہمیں ضائع نہ ہونے دیں گے۔ پھر وہ پورے اطمینان کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اپنے بچے کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ حضرت ابراہیمؑ جب اس وادی سے نکلنے لگے تو پلٹ کر انہوں نے وادی کی طرف رخ کیا اور اللہ سے دعا مانگی کہ:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ
تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ -

(ابراھیم: ۳۷)

"اے پروردگار! میں نے اپنی نسل کا ایک حصہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے قریب لا بسایا ہے۔ اے پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے۔ کہ یہاں نماز قائم کریں پس تو ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھچیں، اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ یہ شکر گزار ہوں۔"

دیکھیے، کیا شانِ تسلیم و رضا اور کیا شانِ توکل علی اللہ تھی اس شوہر اور باپ کی جس نے اللہ رب العالمین کا اشارہ پاتے ہی اپنی بیوی اور بچے کو ٹھنڈے دل سے اس بے آب و گیاہ

وادی میں لاکر چھوڑ دیا۔ اور کس درجے کا یقین و اعتماد اپنے خدا پر تھا اس خدا پر تھا اُس خاتون کو جو یہ معلوم ہو جانے کے بعد بالکل مطمئن ہو گئی کہ اسے اور اس کے ننھے بچے کو اللہ کے حکم سے یہاں یکہ و تنہا چھوڑا جا رہا ہے۔

جب پانی اور کھجوروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور دونوں ماں بچے بھوک پیاس سے تڑپنے لگے تو حضرت ہاجرہؓ اس زمزم کے مقام پر بچے کو لٹا کر صفا کی پہاڑی پر پہنچیں تاکہ چاروں طرف نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ کہیں کوئی مدد کرنے والا ہے؟ پھر صفا سے اُتر کر مروہ کی طرف دوڑیں اور اس پر چڑھ کر پھر انہوں نے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی مدد کرنے والا نظر آئے۔ اس طرح ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان وہ مسلسل سات دفعہ دوڑیں۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ پر تھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ یقین نہ آیا کہ یہ واقعی کسی کی آواز ہے پھر کان لگا کر سُنا اور وہی آواز آئی۔ زمزم کی طرف دیکھا۔ جہاں بچے کو لٹا کر گئی تھیں تو ایک شخص نظر آیا جو دراصل اللہ کا فرشتہ تھا۔ اس نے زمین پر پاؤں مارا اور یکایک ایک چشمہ نکل آیا پھر اس نے حضرت ہاجرہؓ سے کہا۔ اطمینان رکھو، اللہ تمہیں ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ یہاں اللہ کا گھر بننے والا ہے جسے تمہارا یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کرے گا۔

حضرات! اسی واقعہ کی یادگار یہ سعی بین الصفا والمروہ ہے جو آج عمرے اور حج میں کی جاتی ہیں۔ حضرت ہاجرہؓ نے صفا سے سعی کی ابتدا کی تھی۔ اس لیۓ ہماری سعی بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے سات چکر لگائے تھے اس لیۓ ہم بھی سات چکر لگاتے ہیں۔ انہوں نے سعی کے بعد آکر پانی پیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے یہاں پانی موجود نہ تھا۔ ہم سعی سے پہلے اللہ تعالیٰ کے معجزے سے پیدا ہونے والا یہ پانی پیتے ہیں، کیونکہ اب وہ موجود ہے۔ یہ سارے کام جو حضرت ہاجرہؓ کے اس فعل کی نقل کے طور پر کیۓ جاتے ہیں۔

ان کی اصل روح یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہی تسلیم و رضا، وہی توکل علی اللہ اور وہی یقین و اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کا حیرت انگیز مظاہرہ حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہؓ نے کیا تھا۔ ہمیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کام کا حکم اللہ جل شانہ کی طرف سے ہے۔ تو پھر کوئی خطرہ اور کوئی اندیشہ ہمیں اس کی تعمیل سے باز نہ رکھ سکے۔ ہم پورے

یقین کے ساتھ اس بھروسے پر چھلانگ لگا دیں کہ خدا نے اس ظاہری خطرے میں کود جانے کا ہمیں حکم دیا ہے وہ ہمیں ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ ہماری بھلائی اسی کام میں ہے جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ یہ درس جس نے بھی یہاں سے حاصل کر لیا وہ آب زمزم پینے اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کے سارے روحانی فوائد لوٹ لے گیا۔

یہ بات بھی جان لیجئے کہ ان مناسک کو ادا کرتے ہوئے بھی اللہ کا ذکر اور اس سے دعا کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیئے۔ آب زمزم کا پانی پیئیں تو اللہ سے دعا کریں کہ :

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِزْقًا وَّاسِعًا، وَعِلْمًا نَافِعًا وَّشِفَاءً
مِّنْ کُلِّ دَاءٍ

"خدایا! میں تجھ سے فراخ روزی و نفع بخش علم، اور ہر بیماری سے شفا مانگتا ہوں"
صفا پر چڑھیں تو کعبے کی طرف رُخ کر کے کہیں :

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد اللہ اکبر
علی ماھدانا والحمد للہ علی مَا اَوْلانا، لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللہ وحدہ
لَا شریک لہ، لَہُ الْمُلْکُ ولہ الحمد، یحیی ویمیت، بیدہ
الخیر وھو علٰی کُلِّ شیءٍ قدیر۔ لا اِلٰہ الا اللہ وحدہ، لا
شریک لہ، اَنجز وعدہ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ
وَحْدَہٗ لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ وَلَا نعبد اِلَّا اِیَّاہُ مخلصین لَہُ الدِّیْن
وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اسی کے لئے ساری تعریف ہے۔ ہم اللہ کی بڑائی کرتے ہیں۔ اس شکر میں کہ اس نے ہمیں ہدایت بخشی اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان احسانات پر جو اس نے ہم پر کئے ہیں۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے۔ اور اسی کے لئے حمد ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے۔

اسی کے اختیار میں بھلائی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے کوئی معبود اکیلے اللہ کے سوا نہیں ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور سارے جتھوں کو اسی اکیلے نے شکست دے دی۔ کوئی معبود اللہ کے سوا نہیں۔ ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"
یہی کچھ آپ مروہ پر بھی کہیں، اور صفا و مروہ کے درمیان چلتے ہوئے یہ دعا کرتے جائیں کہ:۔

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ۔

"اے رب، بخش دے اور رحم کر، ہمارے اُن سارے قصوروں سے درگزر فرما جو تیرے علم میں ہیں، تو سب پر غالب اور بڑا کریم ہے۔"

حج

آٹھویں ذی الحجہ کی صبح کو تمام حاجی مکہ معظمہ سے حج کے لیے نکلتے ہیں، اور جن لوگوں نے تمتع کرتے ہوئے عمرے کے بعد احرام کھول لیا تھا، وہ بھی نئے سرے سے احرام باندھ لیتے ہیں۔ اب اصل حج شروع ہوتا ہے۔ یہ لاکھوں احرام بند حاجی بیک وقت مکے سے چل کر لبیک لبیک کہتے ہوئے ۸، ذی الحج کو منیٰ جا اترتے ہیں۔ پھر یہی مجمع عظیم ۹، ذی الحجہ کی صبح کو بیک وقت لبیک لبیک کہتا ہوا چلتا ہے اور حدود حرم سے باہر جا کر عرفات کے میدان میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔ پھر اُسی روز شام کو یہ پورا مجمع اٹھتا ہے اور لبیک لبیک پکارتا ہوا مزدلفہ جا اترتا ہے۔ پھر دس ذی الحجہ کو طلوع آفتاب سے پہلے پہلے حاجیوں کا یہ سیلاب لبیک کہتا ہوا اٹھتا ہے اور منیٰ واپس پہنچ جاتا ہے۔ پھر یہ سب لوگ لبیک کہتے ہوئے جمرۂ عقبہ کی طرف چلتے ہیں اور اس پر سات کنکریاں مارتے ہیں۔ پھر یہ لوگ منیٰ ہی میں قربانی کرتے ہیں۔ پھر سب سر کے بال منڈواتے ہیں یا ترشواتے

ہیں۔ پھر جوق در جوق مکہ معظمہ پہنچ کر طواف اور سعی کرتے ہیں۔ پھر منیٰ واپس ہو کر دو دن یا تین دن قیام کرتے ہیں اور ان ایام میں ہر روز تینوں جمروں پر رمی کرتے ہیں۔ یہی اعمال ہیں جن کا نام حج ہے۔

جو لوگ عبادت کے معنی اور حج کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر یہ کیسی دوڑ دھوپ ہے جس کے لئے دنیا بھر سے کھینچ کر لاکھوں آدمیوں کو بلایا جاتا ہے۔ اور یہ کیا عبادت ہوئی کہ مکہ سے اُٹھے اور منیٰ پہنچ گئے۔ وہاں سے اٹھے اور عرفات جا ٹھیرے۔ پھر یہ چلے اور مزدلفہ میں رات گذار دی، پھر منیٰ پہنچ گئے۔ اور وہاں ایک پتھر کو کنکریاں مار دیں؟ لیکن آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ اس ساری دوڑ دھوپ جو زحمت آدمی کو پیش آتی ہے جو تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں، جس مشقت اور بے آرامی سے اس کو سابقہ درپیش ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بے ٹھکانے ہوتا چلا جاتا ہے، اللہ کی راہ میں یہی سب کچھ برداشت کرنا اصل عبادت ہے۔ عمرے میں طواف وسعی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ فرداً فرداً کیا جاتا ہے۔ ایک فرد کے لئے ایک دن عرفات میں جا ٹھیرنا، ایک رات مزدلفہ میں گذار دینا اور دو چار روز منیٰ میں ٹھیر جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے، اسی لئے عمرہ کرنے والے کو ان کاموں میں کوئی کام بھی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن حج میں لاکھوں آدمیوں کو بیک وقت یہ دوڑ دھوپ کرنی ہوتی ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا صاحب ثروت آدمی بھی زحمتیں اٹھائے اور آسائشوں سے محروم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حج کی اجتماعی عبادت میں طواف وسعی سے زائد یہ مناسک رکھے گئے ہیں۔ اس سے مقصود ہر بندۂ مومن میں یہ کیفیت پیدا کرنا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لئے ہر آسائش سے دست کش ہونے اور اس کی راہ میں ہر زحمت اٹھانے کے لئے تیار ہو جائے۔ یہی اللہ پر ایمان لانے کا تقاضا ہے یہی بندگی کے معنی ہیں اور یہی اس عبادت کی روح ہے۔ اس عبادت کے دوران میں جو شخص ان ساری تکلیفوں کو پورے اطمینان اور قلب و روح کی پوری مسرت

کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور اپنے ساتھ کے حاجیوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرتا، بلکہ سخت کش مکش کے مواقع پر بھی صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتا ہے۔ وہ حج کا ثواب لوٹ لیتا ہے اور اس کے برعکس جو شخص اپنی ہر بے آرامی پر چیں بجبیں ہوتا ہے۔ ہر زحمت پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے، اور ساتھ کے حاجیوں سے اپنے آرام کی خاطر مزاحمت کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے وہ حج کے ثواب کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس بیچارے کے حصے میں خالص مشقت ہی رہ جاتی ہے۔ اجر ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھیے کہ حج کے ان اعمال کو ادا کرتے وقت آپ خواہ کچھ بھی نہ پڑھیں اور وقت پر نماز ادا کر دینے کے سوا کوئی دوسرا عمل نہ کریں، تب بھی حج پورا ہو جائے گا اور بجائے خود حج کا جو ثواب ہے وہ آپ کو مل جائے گا۔ مگر بد قسمت ہے وہ شخص جسے اللہ سے تقرب حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مکہ معظمہ سے نکلنے کے بعد یوم النحر کی پہلی رمی تک بہترین ذکر یہ ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ تلبیہ کرے اور اس شعور کے ساتھ کرے کہ میرا مولا اب منیٰ بلا رہا ہے تو میں حاضر ہوں، اب عرفات بلا رہا ہے۔ تو اس کے لئے بھی حاضر ہوں۔ اب مزدلفہ بلا رہا ہے تو اس کے لئے بھی حاضر، اور اب رمی کے لئے منیٰ طلب کر رہا ہے، تو اس کے لئے بھی حاضر، ہر مرتبہ لبیک کہتے ہوئے آپ محسوس کریں کہ رب العالمین کی طرف سے آپ کی طلبی ہو رہی ہے اور آپ اس کے جواب میں کہہ رہے ہیں کہ میں حاضر ہوں۔ اس احساس کے ساتھ جب آپ بار بار لبیک کہیں گے تو انشاء اللہ آپ کے دل میں ذوق و شوق کی وہ کیفیت طاری ہو گی جس کے مقابلے میں ہر لذت ہیچ ہو جائے گی۔

تلبیہ کے علاوہ بیچ بیچ میں کثرت سے اللہ کی حمد اور تکبیر و تہلیل کرتے جائیے۔ کثرت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیے۔ کثرت سے اپنے حق میں، اپنے والدین کے حق میں اور سب مومنین و مومنات کے حق دعائے مغفرت کیجیے۔ اور خاص طور پر وقوفِ عرفہ کے آخری وقت میں اور قیام مزدلفہ کی رات میں تو اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے ذکر اور

دعا و استغفار میں صرف کر دیجیے۔ پھر ایام تشریق میں منیٰ کے قیام کا زمانہ فضول مشاغل میں نہ ضائع کیجیے، بلکہ اسے خیر اور صلاح کی تبلیغ میں، دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ روابط پیدا کرنے میں، اور اعلائے کلمۃ الحق کی فکر و سعی میں صرف کیجیے تاکہ حج کے روحانی و اخلاقی فوائد کا کوئی پہلو آپ سے چھوٹنے نہ پائے۔

یہ ہیں حج کے معنی اور یہ ہے اس کو ادا کرنے کا صحیح طریقہ۔ میری دعا ہے کہ اللہ مجھے اور آپ سب کو یہ فریضہ ٹھیک اس روح کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

تیسرا خطبہ

حمد و ثنا کے بعد:

برادرانِ اسلام! اللہ تعالےٰ نے ہم پر کوئی عبادت ایسی فرض نہیں فرمائی ہے۔ جس میں بے شمار روحانی، اخلاقی، اجتماعی، تمدنی اور مادی فوائد نہ ہوں۔ ظاہر بات ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کو اپنی ذات کے لئے تو کسی کی عبادت کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس نے جو عبادت بھی بندوں پر فرض کی ہے وہ خود بندوں ہی کی بھلائی کے لئے ہے۔ اللہ کی ذات ہر احتیاج سے بالاتر اور ہر نفع اور فائدے کی ضرورت سے بلند تر ہے۔ لیکن جتنی عبادتیں بھی اس نے فرض کی ہیں۔ ان کا ایک تو مقصد اصلی ہے جس کے لئے وہ فرض کی گئی ہیں۔ اور اس کے علاوہ وہ بے شمار ضمنی فائدے ہیں جو ان عبادات کے انجام دینے سے آپ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص نادانی سے ان ضمنی فائدوں کو ہی اصل مقصد قرار دے بیٹھے۔ اور اس غایت اصلی کو فوت کر دے جس کے لئے وہ عبادات فرض کی گئی ہیں تو حقیقت میں وہ اپنی عبادات کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیے کہ روزے کے بے شمار اخلاقی، روحانی اور جسمانی فوائد ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص روزہ اس لئے رکھے کہ اس کی

صحت اچھی ہو جائے گی تو حقیقت میں وہ کوئی عبادت نہیں۔ وہ تو بس ایک فاقہ کرنا ہے۔ کہ جو صحت درست کرنے کے لئے کسی ڈاکٹر کی تجویز سے یا خود اپنی رائے سے اس نے کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور اس میں اس کے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ اس عادات میں باقاعدگی پیدا ہو جائے گی، اس کے اوقات میں نظم و ضبط پیدا ہو جائے گا۔ یا اسی طرح کا کوئی اور فائدہ اس کی نگاہ میں ہے۔ تو حقیقت میں وہ کوئی عبادت نہیں کرتا۔ جس فائدے کو اس نے نگاہ میں رکھا ہے وہ چاہے اس کو حاصل ہو بھی جائے لیکن عبادت کا کوئی اجر اس کو نہیں پہنچا۔ ایسا ہی معاملہ حج کا بھی ہے۔ حج کے جو اخلاقی، روحانی، اجتماعی، تمدنی اور مادی فوائد ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی فائدے کو بھی اپنا مقصود قرار دیتا ہے۔ تو حقیقت میں وہ کوئی حج کرتا ہی نہیں ہے۔ اس کی یہ عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تمام عبادتوں کا مقصود اصلی تو اللہ تعالے کے حضور میں اپنی بندگی پیش کرنا ہے۔ اس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے اگر بندے کو اللہ کی رضا حاصل ہو جائے تو اس کی عبادت کا مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن اگر وہ عبادات میں اپنی ساری دوڑ دھوپ کے باوجود اللہ کی رضا پانے سے محروم رہ گیا تو حقیقت میں اس کی ساری محنت ہی اکارت گئی۔ اس نے عبادت کے حقیقی مقصد اور اصلی فائدے کو ضائع کر دیا، اس لئے یاد رکھیے کہ عبادات سے ضمنی فوائد کا حاصل ہونا یا نہ ہونا بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ آپ یہاں حج کے لئے آئے ہیں تو آپ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص حج اپنی نیت کو خالص اور پاک کر کے صرف اللہ تعالے کی رضا کو مقصود سمجھتے ہوئے انجام دے۔ اگر کسی شخص نے نیت کے اخلاص اور ارادے کی درستی کے ساتھ حج کیا اور اگر کچھ اور نہیں وہ صرف اپنی مغفرت حاصل کر کے لے گیا تب بھی وہ حقیقت میں کامیاب ہے۔ اس کے آگے یہ سراسر اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ وہ کسی آدمی کو اس پر مزید اجر اور بلند مراتب سے نوازے لیکن ایک آدمی کا حج کے ذریعے سے اللہ کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کر لینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس لئے میں آپ کو سب سے پہلی نصیحت یہ کرتا ہوں کہ اپنے ذہن کو ہر طرح کے بے اصل افکار اور غیر حقیقی تصورات سے صاف کر لیجئے اور حج کے مقصود حقیقی کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجئے۔ آج کل حج کے بارے میں بعض نئے نئے فلسفے پیش کئے جا رہے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں حج اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس سے دراصل مسلمانوں کی ایک بین الاقوامی سالانہ کانفرنس کرانا مقصود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک سالانہ کانفرنس سے جو کچھ فوائد بھی کوئی شخص اپنے ذہن میں سوچ سکتا ہے اس سے ہزار گنا زیادہ فوائد حج سے عملاً حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی کوئی کانفرنس دراصل حج کا حقیقی مقصود نہیں ہے اسی طرح اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ حج کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو عرب کی سیاحت کرنے کا، اس کے تاریخی مقامات دیکھنے کا اور اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے حج کو ضائع کرتا ہے۔ اگر اس کے دل میں حج کے مقصد کی حیثیت سے ایسی کوئی غرض اور ارادہ شامل ہو جائے تو فی الحقیقت اس کی یہ عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں رہے گی۔ اس لئے اپنی نیت کو خالصتہً اللہ کی عبادت کے لئے مخصوص کیجئے۔ اور اپنے ذہن میں اس خیال کو بٹھائیے کہ ہمارا اصل مقصود اللہ کی رضا حاصل کرنا اور اس کے حضور اپنے جذبۂ عبودیت کو پیش کرنا ہے

اس کے ساتھ جو دوسری بات میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کے حضور بندگی پیش کرنے کی دنیا میں جتنی شکلیں بھی ممکن ہیں۔ وہ ساری کی ساری اللہ تعالےٰ نے حج میں جمع کر دی ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک آدمی جس وقت حج کا ارادہ کرتا ہے۔ اگر وہ خالصتہً اللہ کی رضا طلبی کے لئے حج کا ارادہ کر رہا ہے تو اس کا یہ عزم سفر کرنا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ کوئی دنیوی مقصد لے کر گھر سے نہیں نکل رہا ہے۔ اس کے پیش نظر کوئی تجارتی غرض نہیں ہے اور نہ اسے سیر و سیاحت ہی کا شوق چرایا ہے۔ اس نے ہزاروں میل کا سفر کرنے کا ارادہ صرف اس لئے کیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرے اور اس کی رضا جوئی کے لئے تگ و دو کرے۔ پھر آپ دیکھئے کہ ایک آدمی جب حج کے لئے نکلتا ہے تو اپنے بال بچوں کو چھوڑتا ہے، اپنا گھر بار، اپنا کاروبار، اپنے

اعزہ و اقربا اور اپنے دوست، احباب غرضیکہ بے شمار علائق و روابط کو توڑ کر نکلتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اللہ کی عبادت انجام دے اور اس کی خوشنودی تلاش کرے۔ اس طرح ہجرت کا اجر اس کو آپ سے آپ مل جاتا ہے۔ ہجرت کے جو اخلاقی اور روحانی فوائد اور منافع ہیں وہ سارے کے سارے اس کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو محض اللہ کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے۔

اس کے بعد آپ دیکھیے کہ ایک شخص جب مکہ معظمہ پہنچتا ہے تو اس جگہ وہ بے شمار مختلف عبادات انجام دیتا ہے۔ پانچوں وقت کی نمازیں تو بہرحال وہ آپ سے آپ پڑھتا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، اس سے اُسے اللہ تعالےٰ پر قربان ہونے اور اپنے آپ کو صدقہ کرنے کا اجر نصیب ہوتا ہے۔ یہاں وہ حجر اسود کو چومتا ہے، اس طرح گویا اللہ تعالےٰ کی آستانہ بوسی کرتا ہے۔ پھر وہ ملتزم سے چمٹتا ہے، یہ گویا اللہ تعالےٰ کی چوکھٹ سے چمٹ رہا ہے اور اس سے دعائیں مانگ رہا ہے اس کے علاوہ وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے اس طرح اس کو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے کا اجر ملتا ہے۔ اس طریقے سے اس کو اللہ سے دعا کرنے، اس کے گھر کے گرد طواف کرنے اور اس کی راہ میں سعی و جہد کرنے کا اجر حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان عبادات کے علاوہ حج کے دوران میں وہ منیٰ جاتا ہے منیٰ سے عرفات اور عرفات سے مزدلفہ آتا ہے مزدلفہ سے پھر منیٰ جاتا ہے۔ یہ ساری دوڑ دھوپ جہاد سے مشابہت رکھتی ہے جس طرح ایک آدمی جہاد کے لئے گھر سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکلتا ہے۔ راستے کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتا ہے میدان جنگ کی سختیاں جھیلتا ہے۔ قریب قریب اسی طرح صعوبتیں اور محنتیں اور مشقتیں آدمی کو اس تمام دوران میں انگیز کرنی ہوتی ہیں۔ اس طریقے سے وہ گویا جہاد فی سبیل اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ پھر وہ یَوْمُ النَّحْر کو (قربانی کے روز) قربانی کرتا ہے۔ اس طرح اس کو قربانی کا اجر بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ حج جامع عبادات ہے۔ دنیا میں آج تک جتنی ممکن قسم کی عبادتیں انسانوں نے کسی معبود کو پیش کی ہیں۔ وہ ساری کی ساری یہاں ایک بندہ مومن صرف اللہ تعالےٰ کے لئے خاص کرتے ہوئے

انجام دیتا ہے۔ اسی بنا پر حج کو سب سے بڑی عبادت بھی قرار دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر یہ عبادت انجام دے کر کوئی شخص اپنے گناہوں کی مغفرت ہی حاصل کر لے تو درحقیقت یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور مغفرت کی حد تک حج کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے اور آپ بے عیب حج کریں۔ بے عیب حج سے مراد یہ ہے کہ آدمی حج کے دوران میں ہر قسم کی برائیوں سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرے غیبت سے پرہیز کرے، گالی دینے سے اور باہم جھگڑا کرنے سے بچے۔ آدمی کو حج میں جو سب سے بڑی مشقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے مناسک حج کی ادائیگی میں قدم قدم پر رکاوٹوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں لاکھوں آدمیوں کو وہ مناسک حج ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اب چونکہ اس موقع پر لوگوں کا غیر معمولی ہجوم ہوتا ہے اور ہر کوئی ایک تگ و دو میں لگا ہوتا ہے۔ اس لئے اس عالم میں ہر وقت اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے دانستہ یا نادانستہ کوئی تکلیف پہنچ جائے۔ یا کسی کو اپنا کوئی کام انجام دینے میں زحمت پیش آئے اس لئے ایسے مواقع پر ہر شخص کو نہایت ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیئے اور کسی صورت میں بھی تنگ دلی اور تنک مزاجی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس عالم میں اس بات کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ کہ آدمی اپنے نفس پر ضبط کرے۔ باہم گالم گلوچ اور دنگا فساد سے پوری طرح بچے اور اس امر کی کوشش کرے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ البتہ اگر کسی کی ذات سے اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ یہ کم سے کم وہ چیز ہے جو آدمی کے حج کو بے عیب بناتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ
فِي الْحَجِّ ط

یعنی جو شخص حج کے مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدکاری، کوئی لڑائی جھگڑے سے

کی بات سرزد نہ ہو۔"

حج کے دوران میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان اسی معاملے میں ہوتا ہے اور جو آدمی حج میں لڑائی جھگڑا کرتا ہے دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے اور دوسروں سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر نہیں کرتا وہ اپنے حج کے اجر کو بہت بڑی حد تک ضائع کر دیتا ہے۔

اس کے آگے اگر کوئی شخص خوبیوں والا حج کرنا چاہتا ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اللہ کا ذکر کرنے میں صرف کرے۔ بیٹھا ہوا فضول گپیں نہ ہانکے، بیکار قصے گوئی نہ کرے، کسی کی برائی کرنا تو بڑی چیز ہے، محض دنیاوی معاملات پر ہر وقت باتیں کرتے رہنا بھی حج کے اجر و ثواب کو کم کر دیتا ہے۔ اونچے درجے کا خوبیوں والا حج اگر آپ کو مطلوب ہو تو اس کے لیئے ضروری ہے کہ آپ اپنے اوقات کا زیادہ سے زیادہ حصہ اللہ کا ذکر کرنے میں، نمازیں پڑھنے میں، قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں، نیکی اور بھلائی کی باتیں کرنے میں، لوگوں کو اللہ کا دین سمجھانے میں اور ان کو منکرات اور فواحش سے روکنے میں صرف کریں۔ اگر آپ ان کاموں میں اپنے اوقات صرف کرتے ہوئے حج کریں گے تو انشاءاللہ وہ حج خوبیوں والا حج ہوگا اور آپ بہت بڑے اجر کے مستحق ہو سکیں گے۔

اب میں مختصر طور پر آپ کو یہ بھی بتاتا ہوں کہ حج کے وہ ضمنی فوائد کیا ہیں، جو اس کے بنیادی مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ آپ سے آپ حاصل ہوتے ہیں۔ میں یہ بات پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے ایسی کوئی عبادت فرض نہیں کی ہے جو اپنے اندر ہمارے لیئے بے شمار فوائد نہ رکھتی ہو۔

اجتماعی طور پر حج سے جو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر عالم گیر برادری اور عالمگیر مساوات پیدا ہوتی ہے، اسی خانہ کعبہ کے دروازے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اسی جگہ کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا تھا کہ:-

> "اے قریش کے لوگو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوست دُور کر دی ہے اب نسبوں اور خاندانی اعزازات کے لیے کوئی مقام باقی نہیں رہا۔ اب یہاں حسب و نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سوائے تقویٰ کے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔"

یہ اعلان رسول اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ سے فرمایا تھا اور اسی مقام پر سب سے بڑھ کر اس بات کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں۔ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ نہ یہاں کوئی امیر ہے نہ غریب، نہ کوئی حاکم ہے نہ محکوم، سب برابر ہیں۔ یہاں آتے ہی، بلکہ اس خانہ کعبہ سے میلوں دور میقات پر پہنچتے ہی ایک آدمی کو اپنے پہنے ہوئے کپڑے اتار کر احرام کا لباس پہن لینا پڑتا ہے۔ خواہ کوئی افریقہ سے آ رہا ہو یا امریکہ سے، ایشیا کے کسی دور دراز گوشے سے آ رہا ہو۔ یا یورپ کے کسی دور افتادہ مقام سے۔ جہاں سے بھی وہ آ رہا ہو ہر شخص کو اپنا قومی لباس اتار کر صرف ایک احرام پہن لینا ہوتا ہے۔ اس طرح لباسوں کے اختلافات سے جو قومی امتیازات پیدا ہوتے ہیں وہ یکلخت ختم ہو جاتے ہیں۔ تمام مسلمان ایک ہی لباس میں حج کرتے ہیں۔ اس طرح یہاں ایک ایسی وحدت جنم لیتی ہے جو کسی دوسری تدبیر سے پیدا نہیں کی جا سکتی، یہ وحدت نہ تقریروں سے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ کانفرنسیں منعقد کرنے سے۔ یہ صرف اسی عمل سے پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کے ہر حصے سے آتے ہوئے لاکھوں مسلمان بیک وقت انجام دیتے ہیں کہ میقاتوں پر پہنچتے ہی وہ یک لخت اپنے قومی لباسوں کو چھوڑ کر ایک ہی لباس زیب تن کر لیتے ہیں۔

پھر یہ عمل محض عالمگیر اخوت ہی پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ عالمگیر مساوات بھی پیدا کرتا ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا رئیس ہو یا کہیں کا بادشاہ، کوئی فیلڈ مارشل ہو یا صدر مملکت، کوئی آقا ہو یا غلام، ہر ایک کو وہی ایک لباس پہننا پڑتا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، ہر کوئی وہی ایک چادر باندھے گا اور ویسے ہی دوسری چادر اوپر سے اوڑھے گا

یہاں آکر کسی کی کوئی امتیازی شان باقی نہیں رہتی۔ امیر اور غریب، حاکم اور محکوم، خادم اور مخدوم، ادنے اور اعلے سب برابر ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے دربار میں پہنچ کر کسی کی کوئی حیثیت بندۂ خدا ہونے کے سوا باقی نہیں رہتی۔ اس طرح سے جو مساوات یہاں قائم ہوتی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کے کسی دین میں اور کسی اجتماعی مسلک میں کہیں کوئی ایسی تدبیر موجود نہیں ہے جو تمام انسانوں کو بیک وقت ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیتی ہو۔ یہ بھی حج کی ایک ایسی بے نظیر خصوصیت ہے جس کے متعلق اگر ایک آدمی غور کرے۔ تو اس کو محسوس ہوگا کہ یہ اللہ تعالےٰ کی حکمت کے سوا اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتی کوئی انسان ایسا نسخہ تجویز نہیں کر سکتا تھا جس سے تمام انسانوں کو ایک ہی سطح پر لانا اور ان کے درمیان ایسی کامل مساوات قائم کرنا ممکن ہو سکے۔ اس ضمن میں اسلامی تاریخ سے بھی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہی مطاف ہے جہاں آپ حج کرتے ہیں۔ اسی جگہ قبیلہ غسان کا ایک بادشاہ (جبلہ بن ایہم) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آیا اور یہاں طواف کرتے ہوئے ایک بدو کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر اس بدو کے ایک تھپڑ مارا۔ وہ بدو حضرت عمر رضی اللہ کے پاس اپنی فریاد لے کر گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں کے بیانات سننے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ اب وہ بدو اس بادشاہ کے اسی طرح تھپڑ لگا کر اپنا بدلہ لے۔ گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بادشاہ کو سبق سکھانا چاہا کہ کیا یہاں آکر بھی تیرے دماغ میں بادشاہی کا فخر اور غرور باقی رہ گیا۔ تو نے خدا کے دربار میں آکر بھی اپنے آپ کو بدو سے بالاتر سمجھا؟ یہ ہے وہ مساوات جو حج قائم کرتا ہے۔ یہاں اب بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑا رئیس اور غریب سے غریب آدمی ایک ہی طرح سے دھکے کھاتا ہوا حرم میں آتا ہے اور دھکے کھاتا ہوا خدا کے گھر کا طواف کرتا ہے یہاں جس مقام پر بھی کسی شخص کو نماز کے لئے جگہ مل جائے وہ وہیں پڑھتا ہے، کوئی رئیس کوئی فرمانروا اور کوئی صدر مملکت ایسا نہیں ہے جس کے لئے زبردستی آگے جانے کا راستہ بنایا جا سکتا ہو۔ اگر کوئی ایسا راستہ بناتا ہے تو غلطی کرتا ہے، جرم کرتا ہے۔

پھر دنیا میں کہیں اس بات کی نظیر بھی موجود نہیں ہے کہ اس نوعیت کا بین الاقوامی اجتماع کسی قوم اور ملت میں پایا جاتا ہو۔ ہزارہا برس کے بعد اب انسان نے اس زمانے میں لیگ آف نیشنز اور یونائیٹڈ نیشنز کا تصور سوچا ہے اور اس کی بنیاد پر بعض بین الاقوامی ادارے قائم کئے ہیں لیکن خواہ آنجہانی لیگ آف نیشنز ہو یا موجودہ زمانے کے یونائیٹڈ نیشنز، ان میں ہونے والے بین الاقوامی اجتماعات میں اور حج کے بین الاقوامی اجتماع میں ایک بہت بڑا بنیادی فرق ہے۔ یونائیٹڈ نیشنز میں جو عالمگیر اجتماع ہوتا ہے وہ حکومتوں کے نمائندوں، ان کے سیاسی لیڈروں اور حکمرانوں کا اجتماع ہوتا ہے، وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے مقابلے میں مفاد اور اغراض کی کشمکش کرتے ہیں۔ اس کا نام بین الاقوامی اجتماع نہیں ہو سکتا۔ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی اجتماع تو یہ ہے جو ہر سال حج پر یہاں ہوتا ہے، کہ اس کے اندر دنیا کی تمام قوموں کے عام آدمی کھنچ کر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ اور سب اجتماعی طور پر مختلف عبادات سرانجام دیتے ہیں، یہاں قوموں کے نمائندے، حکمران، سیاست دان اور پارلیمنٹوں کے ارکان نہیں آتے۔ بلکہ عام انسان آتے ہیں اور دنیا کی ہر قوم کے عام انسانوں سے ملتے ہیں۔ بین الاقوامی اجتماع کا ایسا عظیم نقشہ اور کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

آخری بات جو میں آپ سے عرض کروں گا وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کے اندر خانۂ کعبہ کی مثال وہی ہے جو انسان کے جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ انسان کے جسم میں دل کا مقام یہ ہے کہ وہ رگ رگ سے خون کھینچ کر اپنی طرف لاتا اور پھر اس کو پمپ کر کے ایک صالح شکل میں انسان کے جسم کی رگ رگ میں واپس پہنچاتا ہے۔ جسدِ ملت کے لئے ایسا ہی عمل خانہ کعبہ کرتا ہے۔ یہ ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے مسلمانوں کو کھینچ کر لاتا ہے۔ اور ان کو گناہوں کی آلائشوں سے اور سیرت و کردار کی خامیوں سے پاک کر کے ان کے اندر ایک نئی اور صالح زندگی کی افزائش کر کے دنیا کے گوشے گوشے میں واپس پہنچاتا ہے۔ اس دل کی یہ دھڑکن جب تک ہو رہی ہے، دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو نہیں مٹا سکتی۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو ہر سال مسلمانوں کو کھینچ بلا کر ایک جگہ جمع کرتی ہے، ان کو ایک وقت تک ایک دوسرے

کے ساتھ ملا کر رکھتی ہے۔ ان سے مختلف عبادات انجام دلاتی ہے اور ان عبادات کے دوران میں تمام اسلامی جذبات کو تازہ کر کے ایک متحرک اور فعال اسلامی روح ان کے اندر پھونک کر انہیں واپس بھیجتی ہے جس طرح سے انسان کے جسم میں دل جب تک دھڑکتا رہتا ہے۔ انسان کا جسم زندہ رہتا ہے، اسی طرح سے یہ حج حقیقت میں دنیائے اسلام کے دل کی دھڑکن ہے کہ جو خون کو کھینچ کر لا رہی ہے۔ اور پھر اس کو صالح اور پاکیزہ بنا کر واپس پہنچا رہی ہے۔ انشاء اللہ قیامت تک اسلام قائم رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت خواہ وہ اپنا کتنا ہی زور صرف کر لے اس کو دنیا سے نہیں مٹا سکتی!

وَاٰخرُ دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تعمیرِ اخلاق کیوں اور کیسے؟

اخلاق حقیقت میں انسانیت کا اصل جوہر اور انسان و حیوان کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کا دارو مدار اخلاق ہی پر ہے۔ کوئی انسان اپنی انفرادی حیثیت میں، اور کوئی انسانی گروہ اپنی اجتماعی حیثیت میں اخلاق کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو اپنے استحکام کے لئے کچھ بنیادی اخلاقیات کی ضرورت نہ ہو۔ کیا آپ کو امن میسّر آ سکتا ہے اگر آپ کے شہروں اور بستیوں میں انسانی زندگی کا احترام اور دوسروں کے حقوق کا پاس و لحاظ موجود نہ ہو؟ کیا آپ کا معاشرہ تباہی سے بچ سکتا ہے اگر اس میں ہر شخص قدرت پا کر اپنے حدود سے تجاوز کرنے اور دوسروں کی جان و مال اور آبرو پر دست درازی کر گزرنے کا خوگر ہو؟ کیا آپ کسی تہذیب کا تصور کر سکتے ہیں۔ اگر افراد اور گروہوں کے برتاؤ کو ضابطہ میں رکھنے کے لئے کوئی معقول قانون موجود نہ ہو، یا موجود تو ہو مگر اس کی پابندی نہ کی جاتی ہو؟ کیا آپ کوئی مضبوط تمدنی نظام چلا سکتے ہیں۔ اگر آپ کی معاشرت اور سیاست اور معیشت میں دیانت و امانت، عدل و انصاف، فرض شناسی اور راست بازی موجود نہ ہو؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو بھی بچا سکتے ہیں اگر آپ کے افراد میں وہ خود غرضی پرورش پا رہی ہو جو ان کے دلوں میں اپنی ذات اور

ذاتی مفاد سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ دیکھیں تو اخلاق کی پستی کے ساتھ ہم سرے سے کسی اسلامی زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ مسلمان تو مسلمان بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس کی ذات سے دنیا میں بھلائی قائم ہو اور برائی مٹے۔ بھلائی کو مٹانا اور برائی پھیلانا، اور پھر اس کے ساتھ مسلمان بھی ہونا، یہ درحقیقت ایک کھلا ہوا تناقض ہے۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اس کے شر سے دوسرے بندگانِ خدا محفوظ نہ ہوں۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اس پر کسی معاملہ میں اعتماد نہ کیا جا سکے، ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی وہ نیکی سے بھاگے اور بدی کی طرف لپکے، حرام کھائے اور حرام طریقوں سے اپنی خواہشات پوری کرے، تو آخر اس کے مسلمان ہونے کا فائدہ کیا ہے کسی معاشرے کی اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہو سکتی کہ وہ انصاف سے خالی اور ظلم سے لبریز ہوتا چلا جائے۔ اس میں روز بروز بھلائیاں دبتی اور برائیاں فروغ پاتی چلی جائیں، اور اس کے اندر دیانت اور امانت اور شرافت کے لئے پھلنے پھولنے کے مواقع کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں، یہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والی حالت ہے۔ اگر کسی مسلم معاشرے کی یہ حالت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام کی روح سے خالی ہو چکا ہے، صرف اسلام کا نام ہی اس میں باقی رہ گیا ہے۔ اور یہ نام بھی اب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ دنیا کو اس دینِ حق سے دور بھگا رہے۔

مسلمان اخلاقی زوال کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب اسے خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح مطلوب نہیں رہتی اور صرف دنیا اس کی مطلوب بن کر رہ جاتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی پستی کے ساتھ کوئی قوم دنیا کی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکتی اس پستی کے ساتھ تو آخرت بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور دنیا بھی ہاتھ نہیں آتی۔

سب سے بڑھ کر دولت کی پیاس ہم کو دنیا طلبی کی طرف لے جا رہی ہے مگر اس کے لئے ہم نے افراد اور طبقوں کی خود غرضی اور بددیانتی کو وسیلہ بنایا ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری معاشی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ مجھے مشرق اوسط کے متعدد ملکوں میں جانے

کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں میں نے جب تاجروں سے کہا کہ آپ جو مال باہر کے بعض غیر مسلم ممالک سے منگاتے ہیں۔ وہ آپ کے ایک بھائی مسلمان ملک، پاکستان سے بھی مل سکتا ہے، اسے چھوڑ کر آپ دوسروں سے کیوں خریدتے ہیں؟ تو ان کا یہ جواب سن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ ہم نے مجبوراً پاکستان سے مال منگانا بند کیا ہے، وہاں سے نمونہ اچھا دکھا کر فرمائش حاصل کی جاتی ہے اور پھر اس کی تعمیل میں ردی مال بھیج دیا جاتا ہے۔ فرمایئے، کیا اس بد دیانتی کے ساتھ ہم تجارت میں کوئی ترقی کر سکتے ہیں؟ ہمارے کارخانہ دار اور بڑے تاجر جس خود غرضی کے ساتھ بے تحاشا منافع خوری کر رہے ہیں۔ اس سے ایک محدود طبقہ تو بلاشبہ فربہ ہوتا جا رہا ہے۔ مگر قوم بحیثیت مجموعی لاغر ہو رہی ہے۔ یہ چیز آخر کب تک ہمیں اس طبقاتی کشمکش کی آگ میں جھلسنے سے بچا سکے گی جس میں اسی طرح کی حماقتیں کرنے والے بہت سے دوسرے ملک جھلس چکے ہیں۔ پھر اس خود غرضی کی بدولت ہمارے کارکن طبقوں میں کام چوری اور اپنے فرض سے غفلت اور صرف اپنے حقوق کے لئے لڑنے کی جو بیماری پھیل رہی ہے کیا واقعی یہ وہی راستہ ہے جس سے ہم معاشی ترقی کی طرف پیش قدمی کر سکیں گے۔

ہم ایک مدت سے مادی ترقی کے لئے تعلیم تعلیم کا شور مچا رہے ہیں۔ مگر ہماری تمام کوششیں صرف کتاب خواں بنانے میں صرف ہوتی رہی ہیں، انسان بنانے اور مسلمان بنانے کی ہم نے کوئی فکر نہیں کی ہے بلکہ اس کے برعکس ہماری تعلیم گاہیں دھڑا دھڑ ایسے افراد تیار کر کے نکال رہی ہیں جو انسانی اخلاق سے بھی عاری ہیں اور اسلامی اخلاق سے بھی۔ ہمارے نصاب تعلیم، اور طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول میں سرے سے اس فکر کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ ہمیں اپنے افراد میں کوئی قومی سیرت بھی پیدا کرنی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حکومت سمیت ہمارے تمام شعبہ ہائے حیات کو جو کارکن مل رہے ہیں۔ ان کے اندر کوئی قابلِ اعتماد کیریکٹر نہیں پایا جاتا قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر جو روز بروز قلیل سے قلیل تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہر شعبہ زندگی کو ادنیٰ مراتب سے لے کر بلند ترین مناصب تک وہ لوگ چلا رہے ہیں جن کے اندر دیانت، امانت اور فرض شناسی کا فقدان ہے جنہیں ذرا سا لالچ

یا تھوڑا سا خوف بھی راستی سے بآسانی ہٹا سکتا ہے جو اپنے معمولی سے فائدے کے لئے دوسروں کو، حتیٰ کہ اپنی قوم اور اپنے ملک تک کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا دینے میں تامل نہیں کرتے، جن کی نگاہ میں ضمیر و ایمان کی کوئی قیمت نہیں، جنہیں اپنی ذاتی اغراض کے لئے کسی اصول اور ضابطے کو توڑ دینے میں کوئی باک نہیں۔ روحانی ترقی کا سوال تو بہت اونچا ہے کیا یہ تعلیم کسی مادی ترقی میں بھی ہمارے لئے واقعی مددگار ہو سکتی ہے؟ جس کیریکٹر میں امانتوں کا بوجھ سہارنے اور خوف و طمع کے مقابلے میں ٹھہر جانے کی طاقت نہ ہو وہ حیاتِ دنیا کے کسی میدان میں بھی آخر ہمیں کتنی دور لے جا سکتا ہے۔

ہماری اصل طاقت وہ مادی ذرائع نہیں ہیں جو خالق نے ہمیں عطا کئے ہیں، بلکہ وہ انسان ہیں جنہیں ان ذرائع سے کام لینا ہے۔ یہ انسان اگر بگڑ جائیں تو مادی ذرائع ہمارے کس کام آ سکتے ہیں۔ ان کے بگاڑ اور اس بگاڑ کے اثرات کو ہم محض حکومت اور قانون کی طاقت سے نہیں روک سکتے، کیونکہ اس طاقت کے کارگر ہونے کا انحصار بھی ان انسانوں کی سیرت و کردار ہی پر ہے جو اس طاقت کو استعمال کریں۔ دنیا میں کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا اگر اس کے نافذ کرنے والے خود اس کو توڑیں اور اسے اپنی بدکرداریوں کے لئے ہتھیار بنانے پر تل جائیں۔ ہر پابندی جو آپ کسی خرابی کو روکنے کے لئے لگائیں گے، ایک بددیانت نظم و نسق کے لئے وہ ناجائز فائدے اٹھانے کا ایک نیا دروازہ کھول دے گی اور اصلاح کی بجائے مزید خرابی کی موجب بن جائے گی۔ آپ کا قانون اپنی جگہ خواہ کتنا ہی معقول اور منصفانہ ہو وہ معاشرے میں عدل قائم کرنے کا معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ اگر انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے ہی انصاف کا خون کرنے لگیں، اور قانون کی گرفت میں لانے والی مشینری ہی ظلم پر کمربستہ ہو جائے۔ دوسری طرف دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ موجودہ زمانے کی کلیت پسندی نے ہر ملک کے قدرتی ذرائع و وسائل کو بہت بڑی حد تک حکومت کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ کوئی قوم بھی براہِ راست ان سے انتفاع نہیں کرتی بلکہ حکومت اس انتفاع کو منضبط کرتی ہے اور حکومت کے اس فریضے کو اس کے کارکن ہی انجام دیتے ہیں۔ ان کارکنوں

کے ایماندار، فرض شناس اور با اصول ہونے کی صورت میں خدا کے دیئے ہوئے ذرائع و وسائل سے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی ایسی حالت میں نہیں اٹھایا جا سکتا جبکہ ان کارکنوں کو رشوت، خیانت، کام چوری، سفارش، خویش پروری اور غرضی کی بیماریاں لگی ہوئی ہوں، اور آئین و ضابطہ کا کوئی احترام ان کے اندر موجود نہ ہو۔ خود حکومت کو بھی جو آمدنی ٹیکسوں اور دوسرے ذرائع سے ہو سکتی ہے بددیانت کارکنوں کی وجہ سے نہ وہ بھی پوری طرح وصول ہوتی ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال ہی پوری طرح ہوتا ہے۔

یہ تو اس حالت کی بات ہے جبکہ آئین و قانون بجائے خود درست ہو اور کارفرما بھی صحیح قسم کے لوگ ہوں، صرف کارکن بگڑے ہوئے ہوں، لیکن جہاں آئین و قانون تک میں بکثرت بے انصافیاں اور صریح غیر معقول باتیں موجود ہوں، اور کارفرما اخلاقی بگاڑ میں کارکنوں کے ساتھ نہ صرف برابر کے شریک ہوں، بلکہ ان سے خود کام لیتے ہوں، وہاں بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اور حکومت ذریعۂ اصلاح کے بجائے الٹی موجب فساد بن جاتی ہے۔

ہم نے کارفرماؤں اور قانون سازوں کے انتخاب کے لئے جمہوریت کا طریقہ اختیار کیا ہے لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ "جمہوریت" کے نام میں کوئی معجزہ نہیں ہے جو آپ سے آپ اس انتخاب کو صحیح بنا دے۔ جمہوریت خود بھی اپنی کامیابی کے لئے چند اخلاقی اوصاف کی محتاج ہے جو اگر موجود نہ ہوں تو وہ سرے سے چل ہی نہیں سکتی اس کے لئے کم سے کم جو اوصاف مطلوب ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ جس قوم میں جمہوریت رائج کی جا رہی ہو اس کے اندر خود اپنے حقوق کا صحیح شعور اور ان کی حفاظت کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ وہ مجموعی حیثیت سے اتنی جرأت و ہمت رکھتی ہو کہ کسی استبداد کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دے اور اس کے افراد کی اکثریت کسی لالچ کی بنا پر اپنی رائے بیچنے، یا خوف کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف رائے دینے، یا کسی خود غرضی یا بیجا عصبیت کی بنا پر نااہل لوگوں کے حق میں رائے دینے کے لئے تیار نہ ہو۔

۲۔ اس کے نظم ونسق کو چلانے والے کارکنوں اور اس کے دفاع کی خدمت انجام دینے والے سپاہیوں میں اتنی حب الوطنی، اتنی آئین پسندی اور خود جمہوریت کے تصور کے ساتھ اتنی وفاداری موجود ہو کہ وہ نہ تو جمہوریت کی جگہ کسی استبداد کو اپنے ملک پر مسلط کرنے کی سازش میں آلۂ کار بنیں، اور نہ آئین وقانون کے خلاف کوئی اُن کو استعمال کر سکے۔ انہیں ایمانداری کے ساتھ جمہوریت کے اس نظریے کا قائل ہونا چاہیئے اور اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہیئے کہ "حکمرانی دراصل قوم کے نمائندوں کا کام ہے جنہیں قوم اپنی آزاد مرضی سے اپنا نمائندہ بنائے اور ملازمین حکومت کا کام یہ ہے کہ قوم جن لوگوں کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کرے وہ ان کے ماتحت کام کریں"۔ ان کے ضمیر میں اتنی طاقت ہونی چاہیئے کہ وہ قوم سے انتخاب کی آزادی سلب کرنے کے لئے نہ خود آمادہ ہوں اور نہ کوئی ان سے یہ خدمت لے سکے۔

۳۔ قوم کے بااثر لوگوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہونی چاہیئے جو خود غرضی میں اتنے اندھے نہ ہو جائیں کہ اپنے اقتدار کا تخت بچھانے کے لئے خود اپنی قوم کو اور اپنے ملک کے ملازمین حکومت کو ضمیر فروشی، بزدلی اور بددیانتی کی تربیت دینے پر تُل جائیں۔ ان میں اگر اقتدار کی طلب ہو بھی تو بدرجۂ آخر وہ حدود آشنا ہونی چاہیئے۔ وہ اقتدار کو خریدنے یا زبردستی کھسوٹ لینے کے بجائے خدمت اور حُسنِ عمل کے ذریعہ سے قوم میں اپنا اعتماد پیدا کریں۔ اور پھر عوام کی مرضی (یعنی آزاد مرضی) سے، اگر وہ ان کو حاصل ہو جائے تو برسرِ اقتدار آئیں۔

یہ تین شرطیں جہاں نہ پائی جاتی ہوں وہاں درحقیقت کوئی جمہوریت نہ قائم ہو سکتی ہے، نہ چل سکتی ہے۔ آزادی اور جمہوریت کا بوجھ مضبوط ستون وشہتیر ہی سنبھال سکتے ہیں بودے اور گھن کھائے ہوئے ستونوں اور شہتیروں پر یہ بوجھ جہاں بھی لادا جائے گا زمین بوس ہو جائے گا۔ نام جمہوریت کا ہو گا مگر استبداد کارفرما ہو گا۔ ناجائز ذرائع سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ کبھی نیک نیت نہیں ہو سکتے۔ وہ قانون سازی اور کارفرمائی دونوں میں حق اور انصاف کے بجائے اپنی اغراض کو بالاتر رکھیں گے۔ ایسی صورت میں

سرے سے نہ تو قانون کا احترام باقی رہ سکتا ہے اور نہ حکومت کی طاقت بگاڑ کے بجائے اصلاح کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

سب سے بڑی مصیبت ہمارے لئے یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوئی تھی وہی سرے سے منہدم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان وہ اولین چیز ہے جس پر ایک مسلمان فرد اور قوم کے اخلاق کی عمارت قائم ہوتی ہے، مگر ہمارا نظامِ تعلیم، طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول اس بنیاد کو مضبوط کرنا تو درکنار، روز بروز اسے کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جارہا ہے اور اس کے برعکس ایک لادینی تہذیب کے تصورات، اقدار اور طور طریقوں کی برتری کا نقش دلوں پر بٹھارہا ہے۔ کسی کو محسوس نہیں ہوتا کہ یہ حرکت کرکے ہم دراصل خود اپنی قومی خودی کی بیخ کنی کررہے ہیں۔ پھر دوسری چیز حرام وحلال کی وہ تمیز تھی جس کے بقا واستحکام پر ہمارے اخلاق کے بقا واستحکام کا انحصار تھا۔ مگر ہم اسے بچانے اور سنبھالنے کے بجائے اس کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارا پورا معاشی نظام سود پر چل رہا ہے۔ جسے ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام نے اس کو حرام کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں شراب نوشی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ حالانکہ دنیا کی قوموں میں مسلمانوں کا یہ امتیازی وصف تھا کہ ان کے معاشرے نے شراب کا سدباب کرنے میں سب سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی ہے۔ ہمارے ہاں جنسی بداخلاقی بھی روز افزوں ہے اور ہم مغرب کی تقلید میں عریانی، بے حیائی، اختلاطِ مرد وزن، فحش لٹریچر، فحش فلموں اور فحش گانوں کے ذریعہ سے اس کو فروغ دیتے چلے جارہے ہیں، حالانکہ مسلم معاشرہ کبھی اس لحاظ سے بھی دنیا کے تمام معاشروں سے بلند اخلاق کا حامل تھا۔ ان شدید ترین حرمتوں کو توڑ دینے کے بعد اس کا آخر کیا امکان ہے کہ ہمارے عوام اور خواص میں سرے سے کوئی تمیز حرام وحلال باقی رہ جائے اور وہ رشوت، خیانت، غبن، غصب، چوری اور ایسے ہی دوسرے حرام افعال سے اجتناب کریں۔ تیسری اہم چیز وہ قدریں ہیں جو ہم کو اخلاق کی بلندی پر قائم رہنے کے لئے اپنے دین سے

اور اپنی ملی روایات سے ملی تھیں۔ حق پسندی و حق شناسی، عدل و انصاف، دیانت و امانت، راست بازی، قناعت، حیا، عفت، مروّت اور سب سے بڑھ کر تقویٰ اور احسان وہ چیزیں تھیں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے اصل میں قابلِ قدر ہونی چاہیئے تھیں۔ مگر ہم نے ان کی جگہ خوشحالی، شاندار زندگی، وجاہت، غلبہ و اقتدار اور عیش کو قابلِ قدر ٹھیرا لیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کسی ذریعہ سے میسّر ہو۔

اب آپ پوچھیں گے کہ اخلاقی پستی کے اس گڑھے میں گرنے سے اور اس کے تباہ کن نتائج سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ یہ سوال آپ خلا میں نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک خاص ملک اور خاص قوم میں کر رہے ہیں جس کا ایک خاص مزاج صدیوں کی روایات سے بنا ہوا ہے، اور ایسی حالت میں کر رہے ہیں کہ ایک مدت دراز سے آپ کے لئے مادی ترقی اور معیارِ زندگی کی بلندی کا سوال سب سے زیادہ اہم اور اخلاق کا سوال سب سے زیادہ غیر اہم بنا رہا ہے، حتیٰ کہ تعمیرِ اخلاق کے لئے اجتماعی کوشش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ہے۔

اس حالت میں سب سے پہلے تو اس بات کا احساس پیدا ہونا چاہیئے اور یہ احساس عوام سے بڑھ کر خواص اور ملک کے کارفرماؤں میں ہونا چاہیئے۔ جب تک وہ یہ نہ جانیں گے کہ اخلاق کے بغیر ہمارے لئے کسی ترقی کا، بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے بقا کا بھی امکان نہیں ہے اس وقت تک قومی پیمانے پر تعمیرِ اخلاق کے لئے کچھ نہ کیا جا سکے گا۔ انفرادی کوششیں تو خدا کے فضل سے ہوتی رہی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے افراد سے کبھی خالی نہیں رہا ہے جنہوں نے اپنی حد تک اس کی سعی کی ہو، مگر ان کا کوئی نتیجہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا کہ زوال کی رفتار اتنی تیز نہ ہو سکی جتنی اس کے بغیر ہوتی۔ قوم کا اخلاق بنانا بہر حال قومی پیمانے پر کوشش چاہتا ہے اور وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ ملک کے کارفرماؤں کو اس کی ضرورت کا، اور اس کے تباہ کن نتائج کا احساس ہو۔

احساسِ ضرورت کے بعد یہ جاننا اور سمجھنا بھی ناگزیر ہے کہ تعمیرِ اخلاق کسی بنیادی فلسفے اور کسی نقشۂ تعمیر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ آپ صرف اخلاق، اخلاق کی رٹ لگا کر اور

محض سطحی طور پر چند معروف اخلاقیات کا اشتہار دے کر تو کوئی قومی اخلاق نہیں بنا سکتے آپ کو لامحالہ ایک اساسی فلسفہ درکار ہے جس کے لحاظ سے آپ خیر و شر کا امتیاز اور اخلاقی اقدار کا تعین کریں۔ آپ کو ان اخلاقی اقدار کی پشتیبانی کے لیے کچھ عقائد درکار ہیں جو نفوس کے اندر ان کا احترام گہری جڑوں کے ساتھ جما دیں۔ آپ کے سامنے تعمیر اخلاق کے لیے کوئی نقشہ بھی ہونا چاہیئے جس کے مطابق آپ سیرت و کردار کی بنیادیں اٹھائیں۔ انسان بنانے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کیسے انسان بنانا چاہتے ہیں اور یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اس خاص قسم کے انسان کس طرح بن سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ آپ کسی قوم میں باہر سے کوئی فلسفہ اور نقشہ لا کر تعمیر اخلاق نہیں کر سکتے۔ تعمیر اگر ممکن ہے تو اسی فلسفے اور نقشے پر ممکن ہے جو اس خاص قوم کے مزاج اور اس کی روایات میں پہلے سے اپنی گہری جڑیں رکھتا ہو۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات مسلمانوں کے معاملہ میں بہت اہم ہے۔ یہ کوئی وحشی یا نودولتی قوم نہیں ہے جس کا کوئی ماضی نہ ہو، جس کا اپنا کوئی نظریۂ حیات اور فلسفۂ اخلاق نہ ہو، جو اب نئے سرے سے قومی زندگی کا آغاز کر رہی ہو۔ ایسی قوم میں تو کوئی فلسفہ کہیں سے درآمد کر کے لایا بھی جا سکتا ہے لیکن مسلمان صدہا برس سے اپنے کچھ عقائد رکھتے ہیں۔ کوئی معیار خیر و شر رکھتے ہیں کچھ اخلاقی اقدار رکھتے ہیں اور اپنے اس سرمائے پر آج اس گئی گزری حالت میں بھی ان کو فخر ہے۔ ان کی تاریخ نے ان کو انسانیت کے کچھ نمونے دیئے ہیں جنہیں وہ سیرت و کردار کی بلند ترین مثالیں سمجھتے ہیں اور وہی ان کی نگاہ میں معیار کمال ہیں۔ آپ کوئی بیرونی فلسفہ کچھ نئی اقدار اور کچھ نئے معیاروں کے ساتھ لا کر یہاں تعمیر اخلاق کرنا چاہیں گے تو آپ کو ایک مدت دراز تک اپنی ساری قوتیں ان پرانی بنیادوں کو منہدم کرنے اور نئی بنیادیں رکھنے میں صرف کرنی پڑیں گی۔ یہ کوشش اس قوم کے رہے سہے اخلاق کا بھی ستیاناس کر دے گی۔ اس تخریب سے اگر یہ کسی نہ کسی طرح جی بچی تو نئے اخلاق کی تعمیر کیجیے گا۔ ایک صدی کے بعد شاید اس تعمیر کے نتائج سامنے آنے شروع ہو سکیں لیکن اگر اسلام اور اس کی روایات کی بنیاد پر آپ تعمیر اخلاق کرنا چاہیں تو کل ہی سے یہ کام شروع

ہو سکتا ہے ، اور ہر نیا آنے والا دن اس کے اثرات و نتائج سامنے لا سکتا ہے بشرطیکہ آپ تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب کا کام جان بوجھ کر نہ کرتے رہیں۔

اسلام کی بنیادوں پر تعمیر اخلاق کے تصور کو کسی محدود معنی میں نہ لیجیے۔ اس کے لئے آپ کو اپنا پورا نظام تعلیم اپنے نصاب اور طریقوں اور ماحول سمیت بدلنا ہوگا۔ اس کے لئے افکار بنانے والے تمام ذرائع (ریڈیو، سنیما، ٹیلیویژن، صحافت، لٹریچر وغیرہ) صحیح و مناسب طریقے سے استعمال کرنے ہونگے، اور ان کے غلط استعمال کو روکنا ہوگا اس کے لئے منتظمین حکومت تیار کرنے والے اور دفاعی خدمات کی تربیت دینے والے اداروں کے طرز تربیت میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ اس کے لئے قوانین کی اصلاح بھی کرنی ہوگی۔ اور پوری انتظامی پالیسی میں بھی تغیر کرنا ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے لئے ہمارے کارفرماؤں کو اپنی نیتوں اور ارادوں اور طور طریقوں کو بدلنا ہوگا اور انتخابات جیتنے، اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار پر قابض رہنے کے ذرائع و وسائل کی اصلاح بھی کرنی ہوگی۔ یہ درحقیقت کوئی آسان کام نہیں ہے، بڑا دشوار کام ہے جس پر طبیعتیں بمشکل اس وقت ہی آمادہ ہوسکتی ہیں، جب عام و خاص سب کو یہ محسوس ہو جائے کہ قوم اگر ڈوبی تو یہاں کوئی تیرنے والا نہ رہ سکے گا۔

ترجمان القرآن اپریل ۱۹۶۵ء

دُنیائے اسلام کی موجودہ حالت

اور

اس میں اسلامی تحریکات کے لئے طریق کار

[یہ ایک تقریر ہے جو ۱۶؍ ذی الحج سنہ ۸۲ھ کو مکہ معظمہ کی مسجد دہلوی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے عربی زبان میں کی تھی، اس جلسہ میں خصوصیت کے ساتھ عرب ممالک سے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوئی تھی۔]

خوش قسمتی سے آج مجھے یہ موقع مل رہا ہے کہ مرکزِ اسلام میں حج کے عالم گیر اجتماع کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے جو بندگانِ حق آئے ہوئے ہیں ان سے خطاب کروں اور ان کو یہ بتاؤں کہ اس زمانے میں مومنین صادقین اور خصوصاً ان کے نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کے کرنے کا اصل کام کیا ہے میں اس قیمتی اور نادر موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید ایسا موقع مجھے پھر نہ مل سکے، اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ لوگ اس وقت کی حقیقی صورتِ حال کو اور اس کے واقعی اسباب کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں اور اس کی اصلاح کے لیے حکمت اور جرأت کے ساتھ وہ تدابیر اختیار کریں جو میرے نزدیک موزوں ترین تدابیر ہیں۔ فلیبلغ الشاهد الغائب۔

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجئے کہ دنیائے اسلام اس وقت دو بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک حصہ وہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور سیاسی اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا حصہ وہ جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور سیاسی اقتدار بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں حصوں میں سے فطری طور پر زیادہ اہمیت دوسرے حصے کو حاصل ہے اور ملت اسلامیہ کا مستقبل بہت بڑی حد تک اس روش پر منحصر ہے جو آزاد مسلم مملکتیں اختیار کر رہی ہیں۔ اور آگے اختیار کرنے والی ہیں۔ اگرچہ پہلا حصہ بھی کچھ کم وزن نہیں رکھتا۔ اپنی جگہ اس کو بھی بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ کیونکہ کسی نظریۂ حیات اور عقیدہ و مسلک کے پیروؤں کا دنیا کے ہر خطے اور ہر گوشے میں پہلے ہی سے موجود ہونا اور قلیل تعداد میں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہونا، اُن لوگوں کے لئے بڑی تقویت کا موجب ہو سکتا ہے جو اُس نظریے اور عقیدہ و مسلک کی علمبرداری کے لئے اٹھیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نظریہ اور عقیدہ و مسلک خود اپنے ہی گھر میں مغلوب ہو جائے تو روئے زمین پر پھیلے ہوئے اُس کے یہ پیرو، جو پہلے ہی سے مغلوب ہیں زیادہ دیر تک اپنے مقام پر ٹھیرے نہیں رہ سکتے، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اس وقت نظر بظاہر دنیائے اسلام کے مستقبل کا انحصار اُن مسلم ممالک ہی کے مستقبل پر ہے جو انڈونیشیا اور ملایا سے لے کر مراکو اور نائجیریا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالےٰ کی قدرت و حکمت کوئی اور کرشمہ دکھا دے جس کا ہم ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی اندازہ نہ کر سکتے ہوں، وہ چاہے تو چٹانوں میں سے چشمے پھوڑ کر نکال سکتا ہے اور ریگستانوں کو اپنے ایک اشارے سے گلستانوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔

اب اسی مفروضے پر کہ دنیائے اسلام کا مستقبل مسلم ممالک کے ساتھ وابستہ ہے ذرا اس امر کا جائزہ لیجئے کہ یہ ملک اس وقت کس حالت میں ہیں اور جس حال میں یہ ہیں، اس کے اسباب کیا ہیں۔

آپ لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ ایک طویل مدت تک ذہنی جمود، عقلی انحطاط، اخلاقی زوال اور مادی اضمحلال میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار اکثر و بیشتر مسلمان ایک مغربی استعمار

کے شکار ہوتے چلے گئے تھے۔ اٹھارویں صدی مسیحی سے یہ عمل شروع ہوا تھا اور موجودہ صدی کے اوائل میں یہ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے میں گنتی کے صرف دو چار مسلمان ملک باقی رہ گئے تھے جو براہ راست مغربی مستعمرین کی سیاسی غلامی میں مبتلا ہونے سے بچ گئے۔ مگر پے در پے شکستیں کھا کھا کر ان کا حال غلام ملکوں سے بھی بدتر ہو گیا اور ان کی مرعوبیت اور دہشت زدگی ان لوگوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی جو اپنی سیاسی آزادی پوری طرح کھو بیٹھے تھے۔

مغربی استعمار کے اس غلبے کا سب سے زیادہ تباہ کن نتیجہ وہ تھا جو ہماری ذہنی شکست اور ہمارے اخلاقی بگاڑ کی شکل میں رونما ہوا۔ اگر یہ مستعمرین ہمیں لوٹ کر بالکل غارت کر دیتے اور قتل عام کر کے ہماری نسلوں کو مٹا دیتے، تب بھی یہ اتنا بڑا ظلم نہ ہوتا جتنا بڑا ظلم انہوں نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے اخلاقی مفاسد پھیلا کر ہم پر ڈھایا۔ جن جن ملکوں پر ان کا تسلط ہوا وہاں ان سب کی مشترک پالیسی یہ رہی کہ ہمارے آزاد نظام تعلیم کو ختم کر دیں، یا اگر وہ پوری طرح ختم نہ ہو سکے تو اس سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کے لئے حیات اجتماعی میں کوئی مصرف باقی نہ رہنے دیں۔ اسی طرح یہ بھی ان کی پالیسی کا ایک لازمی جزو رہا کہ مفتوح قوموں کی اپنی زبانوں کو ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے باقی نہ رہنے دیں۔ اور ان کی جگہ فاتحین کی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بھی بنائیں اور سرکاری زبان بھی قرار دے دیں۔ مشرق سے مغرب تک تمام مغربی فاتحین نے بالاتفاق یہی عمل تمام مسلم ممالک میں کیا۔ خواہ وہ ڈچ ہوں یا انگریز یا فرانسیسی یا اطالوی یا کوئی اور۔ اس طریقہ سے ان مستعمرین نے ہمارے ہاں ایک ایسی نسل تیار کر دی جو ایک طرف تو اسلام اور اس کی تعلیمات سے ناواقف، اس کے عقیدہ و مسلک سے بیگانہ، اور اس کی تاریخ اور روایات سے نابلد تھی، اور دوسری طرف اس کا ذہن اور انداز فکر اور زاویۂ نظر مغربی سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ پھر اس نسل کے بعد پے در پے دوسری نسلیں ایسی اٹھتی چلی گئیں جو اسلام سے اور زیادہ دور اور مغربی فلسفۂ حیات اور تہذیب و تمدن میں زیادہ سے زیادہ غرق ہو چکی تھیں ان کے لئے اپنی زبان میں بات کرنا موجب ننگ و عار اور فاتحین کی زبان میں بولنا موجب

افتخار بن گیا۔ مغربی فاتح نصرانیت کے لئے خواہ کتنے ہی متعصب ہوں، ان کے فرنگیت مآب غلاموں کو مسلمان ہونے پر شرم آنے لگی۔ اور اسلام کے خلاف بغاوت کا یہ فخریہ اظہار کرنے لگے۔ مغربی فاتح اپنی فرسودہ اور بوسیدہ قومی روایات کا کتنا ہی احترام کرتے ہوں، یہ غلام لوگ اپنی روایات کی تحقیر کرنا ہی اپنے لئے ذریعہ عزت سمجھنے لگے۔ مغربی فاتحین نے مدت العمر مسلمان ملکوں میں رہنے کے باوجود کبھی مسلمانوں کے لباس اور طرزِ زندگی اختیار نہ کئے، مگر یہ غلام لوگ اپنے ہی ملکوں میں رہتے ہوئے ان فاتحین کے لباس ان کے زندگی [illegible] کے طریقے، ان کے کھانے پینے کے ڈھنگ، ان کی ثقافت کے اطوار حتیٰ کہ ان کی حرکات و سکنات تک کی نقل اتارنے لگے، اور اپنی قوم کی ہر چیز ان کی نگاہوں میں حقیر ہو کر رہ گئی۔ پھر مغربی فاتحین کی تقلید میں ان لوگوں نے مادہ پرستی، الحاد، عصبیت جاہلیہ، قوم پرستی، اخلاقی بے قیدی اور فسق و فجور کا پورا زہر اپنے اندر جذب کر لیا اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی۔ کہ جو مغرب کی طرف سے آتا ہے وہ سراسر حق ہے اسے اختیار کرنا ہی ترقی پسندی ہے اور اس سے منہ موڑنے کے معنی رجعت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

مغربی مستعمرین کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ جو لوگ اس رنگ میں جتنے زیادہ رنگ جائیں اور اسلام کے اثرات سے جس قدر زیادہ عاری ہوں، ان کو زندگی کے ہر شعبے میں اتنا زیادہ بلند مرتبہ دیا جائے، اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ سلطنتوں میں اونچے سے اونچے عہدے انہی کو ملے مستعمرین کی فوجی اور سول ملازمتوں میں یہی کلیدی مناصب پر پہنچے۔ سیاست میں انہی کو اہم حیثیت حاصل ہوئی سیاسی تحریکوں کے یہی لیڈر رہنے، پارلیمنٹوں میں یہی نمائندے بن کر پہنچے اور مسلمان ملکوں کی معاشی زندگی پر بھی یہی چھا گئے۔

اس کے بعد جب مسلمان ملکوں میں آزادی کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں تو ناگزیر تھا۔ کہ ان تحریکوں کی قیادت یہی لوگ کریں۔ کیونکہ یہی حکمرانوں کی زبان میں بات کر سکتے تھے۔ یہی ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اور یہی ان کے قریب تر تھے۔ اسی طرح جب یہ ممالک آزاد ہونے شروع ہوئے تو آزادی کے بعد اقتدار بھی انہی کے ہاتھوں میں منتقل ہوا۔

اور مستعمرین کی خلافت انہی کو نصیب ہوئی۔ کیونکہ مستعمرین کے ماتحت سیاسی نفوذ و اثر انہی کو حاصل تھا۔ سول حکومت کا نظم و نسق یہی چلا رہے تھے اور فوجوں میں بھی قیادت کے مناصب پر یہی فائز تھے۔

استعمار کے آغاز سے لے کر اس کے اختتام اور آزادی کی ابتدا تک کی، اس تاریخ کے چند نمایاں پہلو ایسے ہیں جنہیں نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ انہیں نظر انداز کر کے اس وقت کی پوری صورت حال کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا جا سکتا۔

اول یہ کہ مغربی مستعمرین اپنی پوری مدتِ استعمار میں کسی جگہ بھی اس بات پر قادر نہیں ہو سکے۔ کہ عام مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکیں۔ انہوں نے جہالت ضرور پھیلائی اور عوام کے اخلاق بھی بہت کچھ بگاڑ دیے، اور اسلامی قوانین کی جگہ اپنے قوانین رائج کر کے مسلمانوں کو غیر مسلمانہ زندگی بسر کرنے کا خوگر بھی بنا دیا، لیکن اس کے باوجود دنیا کی کوئی مسلمان قوم بھی من حیث القوم ان کے زیر اثر رہ کر اسلام سے باغی نہ ہو سکی۔ آج دنیا کے ہر ملک میں عام لوگ اسلام کے ویسے ہی معتقد ہیں جیسے تھے، وہ چاہے اسلام کو جانتے نہ ہوں، مگر اسے مانتے ہیں اور اس کے ساتھ گہرا عشق رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہیں ہیں، ان کے اخلاق بری طرح بگڑ چکے ہیں اور ان کی عادتیں بہت خراب ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں، اور ان کے معیار جوں کے توں قائم ہیں۔ وہ سود اور زنا اور شراب نوشی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں، مگر چھوٹی سی فرنگیت زدہ اقلیت کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں آپ کو ایسا کوئی شخص نہ ملے گا جو ان چیزوں کو حرام نہ مانتا ہو۔ وہ رقص و سرود اور دوسرے فواحش کی لذتوں کو چاہے چھوڑ نہ سکتے ہوں مگر چھوٹی سی مغرب زدہ اقلیت کے سوا عامۃ المسلمین کسی طرح بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ یہی اصل ثقافت ہے، اسی طرح مغربی قوانین کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے ان کی پشتیں گزر چکی ہیں۔ مگر ان کے دماغ میں آج تک یہ بات نہیں اتر سکی کہ یہی قوانین برحق ہیں اور اسلام کا قانون فرسودہ ہو چکا ہے۔ مغرب زدہ اقلیت ان مغربی قوانین پر چاہے کتنا ہی ایمان لا چکی ہو۔ عام مسلمان ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کے قانون کو برحق مانتی ہے۔ اور اس کا نفاذ

چاہتی ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ علمائے دین ہر جگہ عوام کے قریب ہیں ۔ کیوں کہ وہ انہی کی زبان سے بولتے ہیں ۔ اور اسی عقیدہ و مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں جس کے عوام معتقد ہیں لیکن زمام اقتدار سے وہ کلی طور پر بے دخل ہیں ۔ اور ایک مدت دراز تک دنیوی معاملات سے بے تعلق رہنے کے باعث ان میں یہ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کر سکیں ۔ اور زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر کسی ملک کا نظام چلا سکیں ۔ اسی وجہ سے کسی مسلمان ملک میں بھی وہ آزادی کی تحریک کے قائد نہ بن سکے اور کہیں بھی آزادی کے بعد اقتدار میں وہ شریک نہ ہو سکے ۔ ہماری اجتماعی زندگی میں ایک مدت سے ان کا کام بس وہ ہے جو ایک موٹر میں بریک کا ہوتا ہے ، ڈرائیور مغربیت زدہ طبقہ ہے اور یہ بریک گاڑی کی رفتار کو تیز ہونے سے کچھ نہ کچھ روک رہا ہے ۔ مگر بعض ملکوں میں بریک ٹوٹ چکا ہے اور گاڑی پوری سرعت کے ساتھ نشیب کی طرف جا رہی ہے اگرچہ اس کے چلانے والے اس غلط فہمی میں ہیں کہ وہ فراز پر چڑھ رہے ہیں ۔

تیسری بات یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی ۔ اس کے قائدین اگرچہ وہی مغربیت زدہ لوگ تھے ۔ لیکن کسی جگہ بھی وہ عام مسلمانوں کو مذہبی اپیل کے بغیر نہ حرکت میں لا سکے ، اور نہ قربانیاں دینے پر آمادہ کر سکے ۔ بلا استثنا ہر جگہ انہیں اسلام کے نام پر لوگوں کو پکارنا پڑا ۔ ہر جگہ ان کو خدا اور رسول اور قرآن ہی کے نام پر اپیل کرنی پڑی ۔ ہر جگہ انہیں آزادی کی تحریک کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دینا پڑا ۔ اس کے بغیر وہ کہیں بھی اپنی قوم کو اپنے پیچھے نہ لگا سکتے تھے ۔ اب یہ تاریخ عالم کی عظیم ترین غداریوں میں سے ایک بے نظیر غداری ہے کہ ہر جگہ آزادی حاصل کرنے کے بعد فوراً ہی یہ لوگ اپنے تمام وعدوں سے پھر گئے اور ان کا پہلا شکار وہی اسلام ہوا جس کے نام پر انہوں نے آزادی کا معرکہ جیتا تھا ۔

چوتھی اور آخری بات قابل ذکر یہ ہے کہ ان لوگوں کی قیادت میں مسلمان ملکوں کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے وہ صرف سیاسی آزادی ہے پچھلی غلامی اور اس آزادی میں فرق صرف

یہ ہے کہ پہلے جو زمام اقتدار باہر والوں کے ہاتھ میں تھی اب وہ گھر والوں کے ہاتھ میں ہے لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے کہ جس ذہن کے آدمی جن نظریات اور اصولوں کے ساتھ پہلے حکومت کر رہے تھے، اسی ذہن کے آدمی انہی نظریات کے ساتھ آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ وہی نظام تعلیم جو مستعمرین نے قائم کیا تھا۔ اب بھی چل رہا ہے۔ انہی کے رائج کردہ قوانین نافذ ہیں اور آگے مزید قانون سازی انہی خطوط پر ہو رہی ہے بلکہ مغربی مستعمرین نے مسلمانوں کے قانون احوال شخصیہ (پرسنل لا) پر جو دست درازیاں کرنے کی کبھی ہمت نہ کی تھی، وہ آج آزاد مسلم مملکتوں میں کی جا رہی ہے۔ تہذیب و ثقافت اور اخلاق و تمدن کے جو نظریات مستعمرین دے گئے ہیں ان میں سے کسی چیز کو بدلنا تو درکنار، آج یہ لوگ اپنی قوموں کو اُن سے بھی زیادہ اس تہذیب میں غرق اور ان اخلاقی نظریات کے مطابق مسخ کر رہے ہیں۔ وہ قومیت کے مغربی نظریات کے سوا اجتماعی زندگی کا کوئی دوسرا نقشہ نہیں سوچ سکتے۔ اسی نقشے پر وہ مسلم مملکتوں کے نظام چلا رہے ہیں اور اس کی وجہ سے انہوں نے مسلمان قوموں کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان کے ذہنوں میں الحاد بس گیا ہے اور جہاں جہاں بھی انہیں اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے وہاں وہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اس حد تک خراب کرتے چلے جا رہے ہیں کہ وہ خدا اور رسول اور آخرت کا کا مذاق اڑاتی ہیں۔ وہ اباحیت میں خود مستغرق ہیں اور ان کی قیادت ہر جگہ مسلمانوں کے اندر فسق و فجور اور بے حیائی پھیلاتی چلی جا رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مغربی استعمار کے چاہے کتنے ہی دشمن ہوں، مغربی مستعمرین ان کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان کی ہر ادا پر یہ مرے مٹتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو یہ معیار حق سمجھتے ہیں۔ ان کے ہر کام کی یہ نقل اتارتے ہیں۔ اُن میں اور اِن میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ مجتہد ہیں اور یہ محض اندھے مقلد۔ یہ اُن کی پٹی ہوئی راہوں سے ہٹ کر ایک اِنچ بھی کوئی نیا راستہ نہیں نکال سکتے۔

یہ چار حقائق جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر آپ دنیا کی آزاد مسلمان قوموں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیں تو اس وقت کی پوری صورت حال

اب پر واضح ہو جائے گی، دنیا کی تمام آزاد مسلم حکومتیں اس وقت بالکل کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ وہ اپنی اپنی قوموں کے ضمیر سے لڑ رہی ہیں۔ ان کی قومیں اسلام کی طرف پلٹنا چاہتی ہیں اور یہ ان کو زبردستی مغربیت کی راہ پر گھسیٹ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کہیں بھی مسلمان قوموں کے دل اپنی حکومتوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ حکومتیں اس وقت مضبوط ہوتی ہیں جب حکمرانوں کے ہاتھ اور قوموں کے دل پوری متفق ہو کر تعمیر حیات کے لئے سعی کریں۔ اس کے بجائے جہاں دل اور ہاتھ ایک دوسرے سے نزاع وکش مکش میں مشغول ہوں، وہاں ساری قوتیں آپس ہی کی لڑائی میں کھپ جاتی ہیں اور تعمیر و ترقی کی راہ میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوتی۔

اِسی صورتِ حال کا ایک فطری نتیجہ یہ بھی ہے۔ کہ ملکوں میں پے در پے آمریتیں قائم ہو رہی ہیں۔ مغربیت زدہ طبقے کی وہ چھوٹی سی اقلیت، جس کو مستعمرین کی خلافت حاصل ہوئی ہے، اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ اگر نظام حکومت عوام کے ووٹوں پر مبنی ہو تو اقتدار اُن کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتا، بلکہ جلدی یا دیر سے وہ لازماً ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جائے گا جو عوام کے جذبات اور اعتقادات کے مطابق حکومت کا نظام چلانے والے ہوں۔ اِس لئے وہ کسی جگہ بھی جمہوریت کو چلنے نہیں دے رہے ہیں اور آمرانہ نظام قائم کرتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ فریب دینے کے لئے انہوں آمریت کا نام جمہوریت رکھ دیا ہے۔

ابتداءً کچھ مدت تک قیادت اس گروہ کے سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں رہی اور سول حکام مسلمان ملکوں کے نظم و نسق چلاتے رہے لیکن یہ بھی اسی صورتِ حال کا ایک فطری نتیجہ تھا کہ مسلمان ملکوں کی فوجوں میں بہت جلدی یہ احساس پیدا ہو گیا۔ کہ آمریت کا اصل انحصار انہی کی طاقت پر ہے۔ یہ احساس بہت جلدی فوجی افسروں کو میدانِ سیاست میں لے آیا اور انہوں نے خفیہ سازشوں کے ذریعے سے حکومتوں کے تختے اُلٹنے اور خود اپنی آمریتیں قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب مسلمان ملکوں کیلئے ان کی فوجیں ایک مصیبت بن چکی ہیں۔ ان کا کام باہر کے دشمنوں سے لڑنا اور ملک کی

حفاظت کرنا نہیں رہا۔ بلکہ اب ان کا کام یہ ہے کہ اپنے ہی ملکوں کو فتح کریں اور جو ہتھیار ان کی قوموں نے ان کی مدافعت کے لئے دیئے تھے انہی سے کام لے کر خود اپنی قوموں کو اپنا غلام بنالیں۔ اب مسلمان ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے انتخابات یا پارلیمنٹوں میں نہیں بلکہ فوجوں بیرکوں میں ہو رہے ہیں اور یہ فوجیں بھی کسی ایک قیادت پر متفق نہیں، بلکہ ہر فوجی افسر اس تاک میں لگا ہوا ہے کہ کب اسے کوئی سازش کرنے کا موقع ملے۔ اور وہ دوسرے کو مار کر خود اس کی جگہ لے لے۔ ان میں سے ہر ایک جب آتا ہے تو زعیم انقلاب بن کر آتا ہے اور جب رخصت ہوتا ہے تو خائن و غدار قرار پاتا ہے۔ مشرق سے مغرب تک بیشتر مسلمان قومیں اب محض تماشائی ہیں۔ ان کے معاملات کے چلانے میں اب ان کی رائے اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ان کے علم کے بغیر اندھیرے میں انقلاب کی کھچڑی پکتی ہے اور کسی روز یکایک ان کے سروں پر الٹ پڑتی ہے۔ البتہ ایک چیز میں یہ سب متحارب انقلابی لیڈر متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی ابھر کر اوپر آتا ہے اور اپنے پیش رو ہی کی طرح مغرب کا ذہنی غلام اور الحاد و فسق کا علمبردار ہوتا ہے

اس تاریک حالات میں ایک روشنی موجود ہے جس کے اندر دو حقیقتیں مجھے صاف نظر آرہی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے الحاد و فسق کے ان علمبرداروں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا ہے اور یہ خود ہی ایک دوسرے کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ متحد ہوتے تو ناقابل علاج مصیبت بن جاتی۔ مگر ان کا رہنما شیطان ہے اور شیطان کا کید ہمیشہ ضعیف ہوتا ہے اس کے ساتھ دوسری اہم حقیقت جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمان قوموں کے دل بالکل محفوظ ہیں۔ وہ ہرگز ان نام نہاد انقلابی لیڈروں سے راضی نہیں۔ اور اس امر کے پورے امکانات موجود ہیں کہ اگر کوئی صالح گروہ فکر کے اعتبار سے مسلمان اور ذہنی قابلیتوں کے لحاظ سے قیادت کا اہل ہو تو آخر کار وہی غالب آئیگا اور مسلمان قومیں اس الحاد و فسق کی قیادت سے نجات پا جائیں گی۔

اس وقت کام کا اصل موقع ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے ایک طرف مغربی

طرز کی تعلیم پائی ہے۔ اور دوسری طرف جن کے دلوں میں خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان محفوظ ہے، قدیم طرز کی دینی تعلیم پائے ہوئے لوگ، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اور علم دین کے لحاظ سے ان کے بہترین مددگار بن سکتے ہیں، اگر بدقسمتی سے وہ اُن صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں جو قیادت اور زمام کار سنبھالنے کے لیے درکار ہیں۔ یہ صلاحیتیں فی الحال صرف مقدم الذکر گروہ ہی میں پائی جاتی ہیں اور ضرورت ہے کہ اس وقت یہی گروہ آگے بڑھ کر کام کرے۔ ان لوگوں کو جو مشورے میں دے سکتا ہوں وہ مختصراً یہ ہیں۔

اولاً، ان کو اسلام کا صحیح علم حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ان کے دل جس طرح مسلمان ہیں اسی طرح ان کے دماغ بھی مسلمان ہو جائیں۔ اور یہ اجتماعی معاملات کو اسلامی احکام اور اصولوں کے مطابق چلانے کے قابل بن جائیں۔

ثانیاً، ان کو اپنی اخلاقی اصلاح کرنی چاہیئے۔ تاکہ ان کی زندگیاں عملاً بھی اسی اسلام کے مطابق ہو جائیں جس کو وہ اعتقاداً برحق مانتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ قول اور عمل کا تضاد آدمی کے اندر نفاق پیدا کرتا ہے۔ اور باہر کی دنیا میں اس کا اعتماد ختم کر دیتا ہے آپ کی کامیابی کا سارا انحصار اخلاص اور راستبازی پر ہے اور کوئی ایسا شخص نہ مخلص ہو سکتا ہے، نہ مخلص مانا جا سکتا ہے جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ آپ کی اپنی زندگی میں اگر تناقض ہوگا تو نہ دوسرے آپ پر اعتماد کریں گے اور نہ خود آپ کے دل میں اپنے اوپر وثوق پیدا ہو سکے گا۔ اس لیے دعوت اسلامی کے لئے کام کرنے والے تمام لوگوں کو میری مخلصانہ نصیحت یہ ہے کہ جن جن امور کے متعلق انہیں یہ علم حاصل ہوتا جائے۔ کہ اسلام نے ان کا حکم دیا ہے ان پر عامل ہونے کی اور جن کے متعلق انہیں معلوم ہوتا جائے کہ اسلام نے انہیں منع کیا ہے۔ ان سے اجتناب کرنے کی پوری کوشش کریں۔

ثالثاً، ان کو اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اور تحریر و تقریر کی قوتیں اس کام پر صرف کر دینی چاہیئیں، کہ مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفہ حیات پر تنقید کر کے اُس

بُت کو پاش پاش کر دیں جن کی آج دنیا میں پرستش کی جا رہی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں اسلام کے عقائد و اصول و مبادی اور قوانین حیات کی تشریح و تدوین ایسے معقول طریقوں سے کریں جو نسل جدید کے ذہن کو ان کی صحت کا یقین دلا سکے اور اُن کے اندر یہ اعتماد پیدا کر سکے کہ دورِ حاضر میں ایک قوم ان عقائد و اصول و قوانین کو اختیار کر کے نہ صرف ترقی کر سکتی ہے۔ بلکہ دوسروں سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ یہ کام جتنے صحیح خطوط پر جتنے بڑے پیمانے پر ہوگا، اتنے ہی دعوت اسلامی کے لئے آپ کو سپاہی ملتے چلے جائیں گے، اور یہ سپاہی ہر شعبۂ حیات سے نکل نکل کر آئیں گے۔ اس عمل کا سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہنا چاہیئے۔ تاکہ ایک کثیر تعداد اُن لوگوں کی پیدا ہو جائے جو ایک ملک کے نظام کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لئے درکار ہیں۔ یہ عمل جب تک بتدریج اپنی انتہا کو نہ پہنچ جائے گا آپ کسی اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی توقع نہیں کر سکتے، اور اگر کسی مصنوعی طریقے سے وہ برپا ہو بھی جائے تو وہ مستحکم نہیں ہو سکتا۔

رابعاً دعوت اسلامی سے جتنے لوگ متاثر ہوتے جائیں۔ ان کو منظم ہونا چاہیئے۔ اور ان کی تنظیم کو ڈھیلا اور سست نہ ہونا چاہیئے۔ نظم و ضبط اور سمع و طاعت کے بغیر محض ہم خیال لوگوں کا ایک بکھرا ہوا گروہ فراہم کر دینے سے کوئی کارگر طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

خامساً۔ اس مقصد کے لئے کام کرنے والوں کو عوام میں اپنی دعوت پھیلانی چاہیئے تاکہ عام لوگوں کی جہالت دور ہو اور وہ اسلام سے واقف ہوں اور اسلام و جاہلیت کا فرق جان لیں۔ اس کے ساتھ انہیں عوام کی اخلاقی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیئے اور فسق و فجور کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے اپنا پورا زور لگا دینا چاہیئے جو فاسق قیادت کے اثر سے مسلمان قوموں میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم فاسق ہو جانے کے بعد ایک اسلامی حکومت کی رعایا بننے کے قابل نہیں رہتی۔ عامۃ الناس میں فسق جتنا بڑھے گا۔ اُن کے معاشرے میں اسلامی نظام کا

چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ جھوٹے، بد دیانت اور بدکار لوگ نظامِ کفر کے لئے جتنے موزوں ہیں۔ نظامِ اسلامی کے لئے اتنے ہی غیر موزوں ہیں۔

سادساً، انہیں بے صبر ہو کر خام بنیادوں پر جلدی سے کوئی اسلامی انقلاب برپا کر دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ جو مقصود ہمارے پیشِ نظر ہے اس کے لئے بڑا صبر درکار ہے۔ حکمت کے ساتھ جانچ تول کر ایک ایک قدم اٹھایئے اور دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے خوب اطمینان کر لیجئے۔ کہ پہلے قدم میں جو نتائج آپ نے حاصل کئے ہیں وہ مستحکم ہو چکے ہیں۔ جلد بازی میں جو پیش قدمی بھی ہو گی۔ اس میں فائدے کی بہ نسبت نقصان کا خطرہ زیادہ ہو گا۔ مثال کے طور پر فاسق قیادت کے ساتھ شریک ہو کر یہ امید کی جاتی ہے کہ شاید اس طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو جائے گا۔ اور کچھ نہ کچھ اپنے مقصد کے لئے مفید کام بھی ہو سکے گا۔ لیکن عملی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس لالچ سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دراصل زمامِ امر جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اپنی ہی پالیسی چلاتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ لگنے والوں کو ہر قدم پر ان سے مصالحتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آخر کار بس ان کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعے سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے۔ بڑے پیمانہ پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجئے، لوگوں کے خیالات بدلیئے۔ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجئے۔ اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں۔ ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجئے۔

اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہو گا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہو گا۔ جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی

انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اُسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔

یہ چند کلمات نصیحت ہیں جو دعوت اسلامی کے لیے کام کرنے والوں کے سامنے میں پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہم سب کی رہنمائی فرمائے اور ہمیں دین حق کی سربلندی کے لیے صحیح طریقے سے جدوجہد کی توفیق بخشے۔

وَآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ترجمان القرآن جون ۱۹۶۳ء

مسلمان حکومتوں کا اتحاد

موجودہ صدی کے ابتدائی دَور میں دنیا پر جو اجتماعی فلسفہ چھایا ہوا تھا وہ نیشنلزم کا فلسفہ تھا۔ لوگوں کے ذہن میں انسان کی قومی و اجتماعی زندگی کا کوئی تصور اس کے سوا نہ آتا تھا کہ ہر قوم نہ صرف یہ کہ آزاد و خود مختار رہو بلکہ اس کا ایک ایک فرد اپنی قومیت کا پرستار بھی ہو، دوسری قوموں کو اپنی قوم کے مقابلے میں پست تر رکھنے کی کوشش کرے، اور اپنی قوم کو تمام قوموں پر بالاتر اور غالب کرنے کے لئے جان لڑا دے۔ لوگ اس پر ایمان رکھتے تھے کہ اجتماعی زندگی کی اگر کوئی معراج ہے تو وہ قومی ریاست، (NATION STATE) ہے جس کو خدا کا مقام قوموں نے دے دیا تھا۔

اس تصور کا نقصان عظیم سب سے پہلے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ساری دنیا نے دیکھا۔

اپنی اپنی قومیتوں کے پرستار جب اس جذبے کے ساتھ اٹھے کہ اپنی قوم کو دنیا پر غالب کرنا ہی انسان کی زندگی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اور جب انہوں نے اپنی قومی ریاست کو اپنا معبود اور اپنا الٰہ بنا کر یہ سمجھ لیا کہ اس معبود کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دینا ہی انسانیت کی معراج ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی جنگ میں مختلف قومیں ایک دوسرے کے لئے درندوں سے بدتر ہو گئیں۔ آبادیوں کی آبادیاں کو تباہ کر ڈالا گیا۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے گئے۔ اخلاق اور تہذیب اور آدمیت کی ساری اقدار

پامال کر کے رکھ دی گئیں۔

اپنے اس فلسفے کا یہ ثمرہ جب دنیا نے دیکھ لیا تو پہلی مرتبہ یہ تخیل جنگ عظیم اول کے بعد ابھرنا شروع ہوا۔ کہ قوموں کے درمیان اتحاد کی کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے جس میں ہر قوم اپنی قومی حاکمیت سے کچھ نہ کچھ دست بردار ہو اور مختلف قومیں مل کر ایک مرکزی اقتدار وجود میں لائیں جو قوموں کو تصادم سے بچائے اور ان کے درمیان مصالحت و موافقت کی صورتیں نکالے۔ اس غرض کے لئے ایک لیگ آف نیشنز (OFNATIONS LEAGUE) قائم کی گئی۔ لیکن جس روز وہ وجود میں آئی اسی روز یہ معلوم ہو گیا کہ "بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند" اسی روز سے اس نے ملکوں کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے اور مختلف قوموں کو بڑی بڑی سلطنتوں کے انتداب (MANDATE) میں دینے کا ایک نرالا طریقہ ایجاد کر لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب کمزور قوموں پر حملے کر کے ملک فتح نہ کیے جائیں گے۔ بلکہ لیگ آف نیشنز ان کو تحفے کے طور پر بڑی قوموں کے حوالے کیا کرے گی۔ اسی زمانے میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا تصور پیدا ہوا۔ اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر اس سرزمین میں بسایا جانے لگا۔ جو خالی پڑی ہوئی نہ تھی۔ بلکہ صدہا برس سے اہل عرب اس میں آباد چلے آ رہے تھے۔ یہ گویا سامان تھا قوموں کے باہمی تصادم کو روکنے کا اور ان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا اس کے صاف معنی یہ تھے کہ انسان نے پہلی جنگ عظیم کے تلخ تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، بلکہ اس تجربے کو اور اس تجربے کے متعلق جو باتیں دنیا کے اہل فکر کر رہے تھے، ان کو محض دھوکا اور فریب دینے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا۔ بظاہر نام یہ لیا گیا کہ ہم قوموں کے درمیان موافقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دراصل وہی نیشنلزم اپنے پورے زور شور کے ساتھ قوموں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ اور اسی پر قوموں اور ملکوں کی پالیسیاں بنتی رہیں۔

امن وصلح اور بین الاقوامی انصاف کے سارے دعووں کے باوجود اکیس سال تک کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے پڑتے رہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں فساد کے بیج بوتے

جاتے رہے اور اسلحہ فراہم کرنے کا سلسلہ اتنے بڑے پیمانے پر جاری رہا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ آخرکار دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ جو پہلی جنگ عظیم سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس میں کروڑوں انسان تباہ کر دیئے گئے۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے گئے۔ پوری پوری قوموں کو ان کے وطن سے اکھاڑ کر دوسرے علاقے میں دھکیل دیا گیا۔ پورے پورے ملکوں کی آبادیاں اسیرانِ جنگ میں تبدیل ہو گئیں۔ اور انسان نے انسان پر وہ ظلم ڈھائے جنہوں نے وحشی درندوں کو شرما دیا۔

اس دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کو پھر یہ خوشخبری سنائی گئی۔ کہ اب قوم پرستی کی ماری ہوئی انسانیت کو بین الاقوامی انصاف سے بہرہ ور کیا جائے گا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے "اقوام متحدہ" کو جنم دیا گیا، انسانی حقوق کا منشور بنانے کی باتیں کی گئیں۔ اور ایک سیکورٹی کونسل بنائی گئی تاکہ وہ دنیا میں امن قائم کرے لیکن آپ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ سیکورٹی کونسل کیسا امن قائم کر رہی ہے۔ پچھلے ہی سال ہمیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے کشمیر کے متعلق اس کی قراردادیں، ۱ سال سے دنیا کا منہ چڑا رہی ہیں فلسطین سے دس لاکھ آدمی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ زمین کے ہر کونے سے لائے ہوئے یہودیوں کا قومی وطن بنایا گیا ہے۔ قبرص میں ترک اقلیت کو اس کی آنکھوں کے سامنے فنا کر دینے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ رہوڈیشیا، انگولا، جنوبی افریقہ، ویت نام اور دوسرے بہت سے مقامات پر کھلم کھلا ظلم اور بے انصافیاں جاری ہیں۔ اور "اقوام متحدہ" ان کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ رہا انسانی حقوق کا منشور، تو آج تک قوموں نے اس کی پابندی کا اقرار نہیں کیا کسی ملک نے اس کو اپنے قوانین میں جگہ نہیں دی۔ کوئی ادارہ ایسا وجود میں نہیں آیا جس سے وہ اشخاص گروہ یا قومیں رجوع کر سکیں۔ جن کے انسانی حقوق پر دست درازی کی گئی ہو۔

یہ حالات ہیں جن کو دیکھ کر امن اور سلامتی اور انصاف کی ان بین الاقوامی ایجنسیوں سے دنیا مایوس ہوتی جا رہی ہے اور اب موجودہ زمانے کے مفکرین بڑے زور شور سے

اس خیال کو پیش کرنے لگے ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ کم از کم ذہن وفکر کی دنیا میں یہ بات اب مسلم ہو چکی ہے کہ قوم پرستی اور قومی ریاستوں کی معبودیت دنیا کے مصائب کی جڑ ہے اور انسانیت کو اس وقت تک امن نصیب نہیں ہو سکتا جب تک مطلق العنان قومی ریاستوں کی جگہ ایک عالمی ریاست (WORLD STATE) وجود میں نہ آجائے تمام دنیا کی ایک حکومت ہو مختلف قوموں کو اس میں داخل خود مختاری حاصل رہے۔ ان کے مذہب، ان کی تہذیب، ان کے تمدن، ان کی زبان کے لئے اس میں پورا تحفظ موجود ہو۔ مگر یہ قومیں ان بینڈھوں کی طرح نہ رہیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بلکہ کوئی ایک طاقت ایسی ہو جو دنیا کے معاملات کو درست رکھے اور قوموں کے درمیان صحیح طور پر ان کے حقوق تقسیم کرے۔

لیکن یہ محض ایک تخیل ہی تخیل ہے۔ ایک خوشنما اور پاکیزہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کوئی نظریہ دنیا کے پاس ایسا ہے جو واقعی ایک عالمی ریاست (ورلڈ اسٹیٹ) کو وجود میں لا سکتا ہو۔

کیا عیسائیت اس کی بنیاد بن سکتی ہے؟ کوئی عیسائی صاحب اگر یہاں موجود ہوں تو میں ان سے معذرت چاہتا ہوں لیکن حقیقت تو حقیقت ہی ہے۔ ~~عیسائیت نے~~ سرے سے اسٹیٹ ہی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی ہے۔ ورلڈ اسٹیٹ کا کیا سوال۔ وہ تو پہلے ہی قیصر کے حق میں جہانبانی سے دست بردار ہو چکی ہے۔ اور جہاں تک نوع انسانی کو متحد کرنے کا تعلق ہے۔ عیسائیت نے اس مسئلے سے دلچسپی ضرور لی ہے۔ مگر وہ اس معاملے میں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس وقت بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے نیگرو باشندوں کی عظیم اکثریت اگرچہ عیسائی ہے اور اس کا دہی دین ہے جو امریکہ کی سفید فام نسل کا ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ دونوں میں عیسائیت مشترک ہے۔ دونوں کے نام ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ دونوں کی تہذیب ایک ہے۔ پھر بھی وہ ایک چرچ میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھ نہیں سکتے۔ ایک میز تو درکنار ایک ریستوران میں بھی کھانا نہیں کھا سکتے۔ ایک بس میں

سوار نہیں ہو سکتے۔ ایک محلے میں رہ نہیں سکتے، کہیں گوروں کے علاقے میں کوئی کالا خاندان آبسے تو اس کا گھر پر گولیاں برسائی جاتی ہیں۔ اور کالوں کے بچے گورے بچوں کے ساتھ ایک مدرسے میں پڑھنے چلے جائیں۔ تو بچوں کی ٹانگیں توڑ دی جاتی ہیں۔ یہی صورت حال افریقہ میں ہے۔ جنوبی افریقہ میں گورے عیسائیوں کی اقلیت کالی اکثریت کے ساتھ خود اس کے اپنے وطن میں جو کچھ کر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ براعظم افریقہ میں تو عیسائیت کا عجیب کرشمہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کلیسا اگر کالوں کا ہے تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی کالی ہے۔ اگر گوروں کا ہے تو اس میں حضرت علیہ السلام کی تصویر بھی گوری ہے۔ گویا دو عیسیٰ وجود میں لائے گئے ہیں۔ کالوں کا عیسیٰ کالا اور گوروں کا عیسیٰ گورا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دین کسی عالمی برادری اور کسی عالمی ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

پھر کیا بدھ ازم اس کی بنیاد بن سکتا ہے؟ اس کا حال تو یہ ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات اور اس کی ریاست کے مسائل سے عیسائیت کی بہ نسبت بھی اس نے زیادہ بے تعلقی برتی ہے۔ اس کا پورا لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں انسانی معاملات کو چلانے کے لئے کوئی ہدایت موجود نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی انسان کو دیتا ہے۔ اس غرض کے لئے دیتا ہے کہ دنیا کے اس عذاب خانے سے جس میں کسی نہ کسی طرح وہ آکر پھنس گیا ہے اور جسم کے اندر انسانی روح کی گرفتاری سے جس میں وہ مبتلا ہو گئی ہے۔ اس کو رہائی دلوائی جائے۔ گویا دنیا چلانے اور اس کے معاملات کا انتظام کرنے کے لئے وہ کوئی ہدایت نہیں دیتا۔ بلکہ دنیا سے فرار کرنے کے لئے اور جسم انسانی کی قید سے نکلنے کے لئے وہ راستے بتاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دین بھی کسی عالمی معاشرے اور ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

اب کیا ہندو ازم وحدت انسانی کے لئے کوئی بنیاد فراہم کرتا ہے؟ اس نے تو انسانیت کو جمع کرنے کا نہیں بلکہ اسے پھاڑنے اور تقسیم کرنے کا پروگرام دیا ہے۔ اور اس کے اس پروگرام نے انسانیت کو ایسی بے دردی کے ساتھ پھاڑا ہے جس

کی کوئی نظیر دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں ملتی۔ تاریخ میں آپ کو مفتوحین کے ساتھ فاتحوں کے ظلم و ستم کی بدتر مثالیں ملیں گی۔ مگر اس ظلم کی کوئی مثال نہ ملے گی کہ ایک قوم باہر سے آ کر ملک کو فتح کرنے کے بعد اس کے قدیم باشندوں کو چوہڑے اور چنڈال بنا کر رکھ دے، بیت الخلا صاف کرنے کی خدمت اس کے لیے مخصوص کرے۔ اسے پیدائشی طور پر ناپاک اور اچھوت قرار دے دے۔ اور بچے بچے کے دل و دماغ میں یہ فلسفہ گہرا اتار دے کہ اپنے پچھلے جنم کے اعمال کی پاداش میں یہ پیدا ہی ذلیل و خوار ہوئے ہیں اور اس پیدائشی ذلت سے کوئی ان کو نہیں نکال سکتا۔ دنیا میں صرف آریہ ہی وہ نسل ہے جس نے ہندوستان میں اپنے مفتوحوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے، انہوں نے انسان اور انسان کے درمیان تفریق اور نسل پر نسل کی برتری کے تخیل کو محض کاغذی فلسفے تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ معاشرے کی زندگی میں اسے آخری حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔

اس تفریق و امتیاز کے لیے آپ کو منو کی دھرم شاستر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ ہندو سوسائٹی میں ہر وقت، ہر جگہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔ جنوبی ہند میں تو یہ تفریق اس حد کو پہنچی ہے کہ اگر کوئی شودر بیمار ہو اور کسی برہمن ڈاکٹر کو اس کے علاج کے لیے جانا پڑے تو ڈاکٹر چالیس قدم کے فاصلے پر آ کر رک جائے گا۔ بیچ میں ایک اینٹ ڈال دے گا۔ بیمار اینٹ کو مخاطب کر کے کہے گا کہ مجھے یہ تکلیف ہے اور ڈاکٹر اینٹ کو مخاطب کر کے کہے گا کہ تیرا یہ علاج ہے۔ شودروں کی مختلف اقسام کے لیے مختلف فاصلے ہیں جن سے کم فاصلے پر کوئی شودر برہمن کے قریب چلا جائے۔ تو ناپاک ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سوسائٹی اور یہ تمدنی و معاشرتی نظام اور یہ فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات کبھی انسانوں کو جمع نہیں کر سکتا۔ یہ تو انسانوں کے پھاڑنے والا ہے نہ کہ جمع کرنے والا۔ حد یہ ہے کہ ہندوازم میں اگر کوئی آدمی بحری سفر کرے۔ تو اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا پڑھا لکھا آدمی جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں گیا تو واپس آ کر اس کو بڑے بڑے کفارے ادا کرنے پڑے کیونکہ بحری سفر سے اس کا برہمنوں کے نزدیک بھرشٹ ہو چکا تھا۔ اس نظریے کی بنیاد پر کون

سوچ سکتا ہے کہ وحدت انسانی کے قیام کا بھی کوئی امکان ہے ؟

اسی طرح سے مغربی تہذیب بھی انسانوں کو جمع نہیں کر سکتی۔ وہی تو قوم پرستی کا فتنہ دنیا میں اٹھانے والی ہے۔ اسی نے تو انسانوں کو نیشنلزم کی بیماری میں مبتلا کیا۔ اسی نے تو نیشن اسٹیٹ کو خدا کا مقام دیا۔ وہی تو حیات دنیا کی زینت اور معیار زندگی کی بلندی اور مادی خوشحالی کو انسان کا آخری مقصود اور اس کی کوششوں کی ـــ غایت بناتی ہے۔ اس مقصد حیات کو اختیار کر لینے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ افراد افراد کے مقابلے میں، طبقات طبقات کے مقابلے میں اور قومیں قوموں کے مقابلے میں اس کی خاطر کشمکش کریں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مادی زندگی کے منافع سمیٹنے کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں، یہ تہذیب کبھی کوئی ایسا نظریہ لا کر آپ کو نہیں دے سکتی۔ جو انسانوں کو جمع کر سکے۔ ان کے درمیان صلح اور صفائی پیدا کر سکے۔ اور قوموں کو تصادم کی بجائے تعاون کی راہ پر لگا سکے۔ یہ پھاڑنے والی تہذیب ہے، جمع کرنے والی تہذیب نہیں ہے۔ اس تہذیب کے زیر اثر پہلے تو محض حیوانی جبلت کے تحت انسان، انسان کا شکار کرتا رہا۔ اہل مغرب اسی مقصد کو لے کر امریکہ میں گھسے اور ریڈ انڈینس کی پوری نسل کا قلع قمع کر کے ان کے ملک پر قبضہ کیا۔ افریقہ میں گھسے اور وہاں سے دس بارہ کروڑ غلام لے جا کر انہوں نے اپنے مقبوضات کی آبادکاری کے لئے مویشیوں کی طرح ان سے کام لیا۔ مگر بعد میں انہوں نے ایک مستقل فلسفہ اس کے لئے بنا لیا جس کی بنا پر وہ اپنے اس طرز عمل کو سراسر حق بجانب اور عین تقاضائے فطرت سمجھنے لگے۔ اس فلسفے کی رو سے یہ دنیا ہے ہی ایک رزم گاہ جس میں تنازع للبقاء STRUGLE FOR EXISTENCE) کا عمل جاری ہے یعنی اس کائنات میں زندگی کی بنیاد تنازع پر قائم ہے نہ کہ موافقت پر۔ اس نزاع میں فطرت اس کو باقی رکھتی ہے۔ جو دوسروں کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا فطری ضابطہ ہے اور اسی ضابطہ کے مطابق دنیا میں زندگی کے لائق انواع کا انتخاب ہو رہا ہے، یعنی کمزور کا مٹ جانا اور طاقت ور کا

باقی رہنا ہی فطری انتخاب (NATURAL SELECTION) ہے۔ اس نے فلسفے نے مغربی تہذیب کے پیروؤں کو مطمئن کر دیا کہ اگر وہ کمزور قوموں کو مٹا کر یا دبا کر زمین سے بے دخل کر دیں۔ اور ان کی جگہ خود زمین پر قبضہ کر کے مادی ترقی کے لئے شاندار کرشمے دکھائیں۔ تو یہ کوئی ظلم نہیں ہے۔ بلکہ نظام فطرت یہی کچھ چاہتا ہے۔ اور زمین و آسمان اسی "عدل" پر قائم ہیں۔ یہی فلسفہ اور یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر آج کسی گورے کے ضمیر میں اس بات پر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی کہ امریکہ میں گوری نسل نے ریڈ انڈین نسل کو فنا کر کے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اسی فلسفے کی بنیاد پر آج دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کہ فلسطین میں عرب کوئی ترقی نہیں کر رہے تھے اور یہودیوں نے وہاں جا کر مادی ترقی کے یہ کچھ کمالات دکھائے، لہذا اگر عربوں کو مار مار کر اس ملک سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ دنیا بھر سے لا لا کر یہودیوں کو بسا دیا گیا تو یہ قطعاً کوئی ظلم نہ تھا۔ بلکہ یہ توعین تقاضائے فطرت تھا۔ یورپ اور امریکہ میں آج اسی استدلال سے اسرائیل کے قیام کو حق بجانب ثابت کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فلسفہ جس تہذیب کا ہو، کیا وہ بھی کبھی وحدت انسانی کی بنیاد بن سکتی ہے۔

اب ذرا مارکسزم کو دیکھئے، کیا وہ انسانیت کو جمع کر سکتا ہے؟ شاید وہ اسے اسی وقت جمع کر سکے جب اس کے تصور کے مطابق پوری نوع انسانی میں بس ایک ہی طبقہ باقی رہ جائے گا۔ لیکن جب تک وہ پہلے طبقاتی نزاع برپا کر کے پوری دنیا کو خاک و خون میں لٹا نہیں لے گا۔ اس وقت تک وہ اپنے اس نصب العین تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کبھی اس تک پہنچے گا بھی یا نہیں۔ مگر اس کو پہنچنے کے لیے جس راستے سے وہ گزر رہا ہے اور آگے گزرنا چاہتا ہے۔ وہ عالمگیر جنگ طبقات ہے۔ جس کے ذریعہ سے مار دھاڑ، توڑ پھوڑ اور خونی انقلاب برپا کر کے پہلے تو وہ مزدور طبقے کی ڈکٹیٹر شپ قائم کرے گا۔ پھر صاحب ملکیت طبقات کو فنا کرے گا۔ ان کی املاک چھینے گا۔ ان کو قتل کر کے یا جلاوطن کر کے یا دوسرے کسی طریقے سے ان کا استیصال کرے گا۔ تب کہیں انسان کو وہ جنت نصیب ہو گی جس

میں روئے زمین پر نوع انسانی کا بس ایک ہی طبقہ موجود ہوگا۔ یہ عمل ابھی روس اور چین میں بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اس کے بعد نہ معلوم ساری دنیا میں کتنا کچھ توڑ کر اور پھر بنا کر کتنی مدت میں یہ تکمیل کو پہنچے گا۔ کم از کم آئندہ دس بیس نسلوں کو تو اس سے جمع کی نہیں بلکہ ضرب و تفریق ہی کی امید رکھنی چاہیئے۔ آج کی دنیا جو امن چاہتی ہے بہر حال مارکسی نظریہ و فلسفہ وہ اس کو نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد اگر میں یہ کہوں تو ہرگز غلط نہ کہوں گا کہ اسلام کے سوا ایسا کوئی نظریہ نہ اس سے پہلے تھا نہ اب ہے جو انسانیت کو جمع کر سکے۔ اور ایک عالمی ریاست کی بنیاد دے سکے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جو پوری نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور تمام انسانوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم سب اصل میں ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی "لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔"

پھر وہ ان سے کہتا ہے، کہ تمہارے خالق کی بنائی ہوئی فطرت نے تم کو قوموں اور قبیلوں کی شکل میں اس لئے تقسیم نہیں کیا ہے کہ تم آپس میں لڑو بلکہ اس لئے کیا ہے کہ تم آپس کی جانی پہچان سے ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ آسانی کے ساتھ تعاون کر سکو۔ یہ تقسیم تعارف کے لئے ہے۔ تصادم کے لئے نہیں ہے۔ وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا! ہم نے تم کو اقوام اور قبائل اس لئے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ جہاں تک انسانوں کے قوموں اور قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم ہونے کا تعلق ہے۔ یہ ایک امر فطری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی خاندان میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے قریب ترین لوگ اس کے خاندان ہی کے لوگ ہوتے ہیں، جن سے وہ سب سے پہلے متعارف ہوتا ہے۔ پھر ایک شہر یا ایک بستی میں جو خاندان آباد ہوں وہ آپس میں دوسری بستیوں کی بہ نسبت زیادہ تعارف اور میل جول کے مواقع رکھتے ہیں اور ایسا ہی معاملہ خاندانوں کے اس مجموعے کا بھی ہے جن سے مل کر ایک قوم بنتی ہے۔ انسانوں کے درمیان ربط اور تعامل کی یہی ایک فطری صورت ہے۔ اس لئے انسانوں کے خالق نے ان کو اقوام اور قبائل کی شکل میں جمع کیا ہے۔ اس کا مقصد باہمی تعارف اور تعاون کے لئے ایک بنیاد فراہم کرنا ہے نہ کہ ایک خاندان، یا نسل یا قوم کے

لوگ دوسرے لوگوں کو ذلیل و خوار سمجھیں۔ ان پر اپنا فخر جتائیں ان کو دبا کر خود ان کے سر پر سوار ہو جائیں اور آخر کار اسی کے نتیجے میں قوموں کی وہ آمیزش رونما ہو جو خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیتی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فضیلت کی حقیقی بنیاد کسی خاندان، نسل یا قوم میں پیدا ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اخلاق کے اعتبار سے بلند اور پاکیزہ تر ہونا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" تم میں سب سے زیادہ ذی عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔"

یہ ہے انسانیت کا وہ تصور جو دنیا کے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے۔ اور ان کو ایک برادری بنا کر ایک عالمی معاشرہ اور ریاست قائم کر سکتا ہے۔ آدمی آدمی کے ساتھ ایک سطح پر مل کر اسی وقت برادرانہ تعلق قائم کر سکتا ہے، جب ہر شخص یہ سمجھے کہ میں ایک خدا کا پیدا کیا ہوا ہوں، ایک ہی خدا کے سامنے جواب دہ ہوں، ایک ہی خدا میرا اور تمام انسانوں کا خالق اور رب ہے۔ ایک ہی مادے سے میری اور دوسرے سب انسانوں کی ہڈی بوٹی بنی ہے اور ہم میں سے کوئی بھی اس وجہ سے اچھا یا برا نہیں ہے۔ کہ وہ اتفاقاً کسی باپ کے نطفے اور کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ اچھائی اور برائی جو کچھ بھی ہے، اخلاق اور اعمال کی ہے۔ اچھے اخلاق اور اچھے عمل جس کے بھی ہوں وہ قابل قدر ہے خواہ وہ مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔ اور برے اخلاق و اعمال جس کے بھی ہوں وہ کم تر درجے کا انسان ہے۔ خواہ وہ کالا ہو یا گورا یہی حقیقت ہے جس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تاریخی خطبہ حجۃ الوداع میں بیان فرمایا تھا کہ "کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ نہ کسی گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تمہارے درمیان اگر کوئی شخص عزت والا ہے تو بس وہ جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

اسلام اس بات کو محض ایک نظریے اور فلسفے کے طور پر پیش کر کے نہیں رہ گیا ہے بلکہ عملاً اس نے ایک معاشرہ انہی بنیادوں پر وجود میں لا کر دکھا دیا ہے۔

اس معاشرے میں اس نے مختلف ملکوں، نسلوں اور قوموں کو بالکل مساوی حیثیت سے جمع کر دیا۔ نسل، رنگ، زبان اور قومیت کے سارے امتیازات مٹا دیئے۔ ان کے درمیان اونچ نیچ اور چھوت چھات کی کوئی تفریق باقی نہیں رہنے دی۔ ایک ہی مسجد میں وہ ایک ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ ایک دسترخوان پر کھانے لگے۔ آپس میں شادی بیاہ کرنے لگے اور جملہ حقوق و فرائض میں ان کے درمیان پوری یکسانی پیدا ہو گئی۔ آج جو لوگ اسلام کے بدترین مخالف ہیں ان کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی دین، کوئی مذہب، کوئی نظام تمدن و معاشرت ایسا نہیں ہے جو نسل و رنگ اور زبان و وطن اور قومیت کی تفریقوں کو مٹا کر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری بنانے میں کامیاب ہوا ہو۔ یہ صرف اسلام ہی کی برکت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کا کمال ہے۔ اور قرآن مجید کی تعلیم کی حیرت انگیز معجزانہ تاثیر ہے کہ اس نے عملاً نوع انسانی کو اس طرح ایک امت بنا دیا۔

پھر اس نظریے کی بنیاد پر اسلام نے عملاً ایک عالمی ریاست بھی قائم کر کے دکھا دی۔ خلافت راشدہ کے دور میں جب اسلام عرب سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلا تو دنیا کے تمام مسلمانوں کا ایک ہی امیر اور ایک ہی امام تھا۔ تمام بلاد اسلام میں ایک ہی قانون رائج تھا۔ تمام مسلمان بالکل ایک برادری تھے مشرق و مغرب تک دنیا کے کسی ملک میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا وہ ٹھیک انہی حقوق کے ساتھ اسلامی معاشرے میں شامل ہو جاتا تھا۔ جو عربوں کے حقوق تھے، بلکہ حقوق میں اس کے اور ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے درمیان بھی کوئی فرق و امتیاز نہ تھا۔ ایک حبشی ایک رومی ایک ایرانی، ایک قبطی، ایک بربری کلمۂ اسلام کا قائل ہونے کے بعد ٹھیک اسی صف میں آ کھڑا ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خاندان اور آپ کی اپنی قوم کے لوگ کھڑے تھے۔ اس کے واجبات وہی تھے جو ان کے تھے اس کی حیثیت اور اس کا مرتبہ وہی تھا جو ان کا تھا اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے وہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں بڑی سے بڑی فضیلت حاصل کر سکتا تھا۔

بعد کے ادوار میں اگرچہ مسلمانوں کے اندر بہت سی خرابیاں رونما ہوگئیں۔ مگر اسلام نے مسلمانوں کے اندر جو عالمگیر برادری پیدا کردی تھی وہ اپنی جگہ قائم رہی۔ اس کو کوئی طاقت نہ مٹا سکی۔ مسلمانوں میں ہر طرح کے تفرقے برپا ہوئے۔ قومی و نسلی اور قبائلی اختلافات بھی ابھرتے رہے۔ ان کی ایک عالمگیر سلطنت کی جگہ بہت سی الگ الگ ریاستیں بھی بن گئیں۔ مگر یہ تخیل برابر قائم رہا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک امت ہیں۔ اور کلمۂ اسلام کا ماننے والا خواہ کسی وطن اور کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو۔ خواہ اس کی جلد کا رنگ کچھ ہی ہو، بہرحال وہ ہے مسلمانوں کا بھائی اور مسلم معاشرے میں وہ جہاں بھی چلا جائے اس کے حقوق وہی ہیں جو دوسرے سب مسلمانوں کے ہیں۔ اس تخیل کا یہ کرشمہ دنیا صدیوں تک دیکھتی رہی ہے کہ مشرق سے مغرب تک مسلمان جس ملک میں چاہتا بے روک ٹوک جا سکتا تھا۔ جہاں چاہتا پھر سکتا تھا۔ جتنے دن چاہتا ٹھہر سکتا تھا۔ جو کاروبار چاہتا کر سکتا تھا۔ بڑے سے بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہو سکتا تھا، اور شادی بیاہ میں بھی اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک سے نکل کر دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں سالہا سال تک پھرتا رہا ہے کہیں اس نے علم حاصل کیا، کہیں اس نے تجارت کی، کہیں اس کو وزارت یا فوج کی سپہ سالاری مل گئی، کہیں وہ رہ پڑا اور اس نے شادی کرلی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ ہے۔ جس نے ۲۷ سال دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں پھر کر گزار دیئے اور کہیں اس کو پاسپورٹ یا ویزا کی ضرورت پیش نہ آئی، کہیں اس سے نہ پوچھا گیا کہ تیری قومیت کیا ہے کہیں اسے اپنی معاش کے لئے وسائل فراہم کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ کہیں اسے اقامت کے پرمٹ نہ لینا پڑا، کہیں اس کے قیام کے لئے کوئی مدت مقرر نہ کی گئی۔ بلکہ کسی جگہ اگر اس نے سرکاری ملازمت کرنی چاہی تو وہ بھی بلا تکلف مل گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وہ ہندوستان پہنچا ہے اور یہاں مراکش کے انتہائی سرے سے آیا ہوا وہ شخص مجسٹریٹ بنا دیا جاتا ہے۔ پھر سلطان اس کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیج

دیتا ہے یعنی ڈپلومیٹک سروس تک میں اس کو داخل ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں۔ کہ اس وقت دنیا بھر کی مسلمان ریاستوں کے درمیان محض دولت مشترکہ (COMMON WEALTH) ہی کا نہیں بلکہ شہریت مشترکہ (COMMON CITIZENSNIP) کا تصور بھی پوری طرح کارفرما تھا۔ دنیائے اسلام حقیقت میں ایک دارالسلام تھی۔ اگرچہ اس کے مختلف حصوں میں الگ الگ حکومتیں پائی جاتی ہیں۔ اس دارالسلام کی ہر حکومت کے لئے پوری اسلامی دنیا کی افرادی قوت (MAN POWER) قابل حصول تھی۔ ہر مسلمان ہر مسلم حکومت کا وفادار تھا اور دارالسلام کی حفاظت و مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیائے اسلام میں ہم یہی کیفیت جاری و ساری پاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ دنیا کے اہل فکر آج جس عالمی ریاست کی تمنا ظاہر کر رہے ہیں۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اس کے لئے تمام فکری و نظری بنیادیں فراہم کر دی ہیں۔ بلکہ صدیوں تک وہ عملاً اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔

لیکن اس بات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ موجودہ دور میں مسلمان اپنی اس قیمتی متاع کی قدر و قیمت بھی فراموش کر گئے۔ مغربی قومیں جب اسلامی دنیا پر چھاپے مارتی ہوئی آگے بڑھیں اور ملک پر ملک فتح کرتی چلی گئیں تو پہلے تو ہم نے ان کی تلوار سے شکست کھائی۔ پھر ان کی تعلیم و تہذیب اور ان کے فلسفوں کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ جو غضب ان کی تلوار نہ ڈھا سکتی تھی وہ ان کے فلسفوں نے ڈھا دیا۔ ان کا سیاسی غلبہ ہم پر وہ مصیبت کبھی نہ لا سکا تھا۔ جو ان کا تہذیبی اور فکری غلبہ لے آیا۔ سیاسی غلبہ نے صرف ہمارے جسموں کو جکڑا تھا۔ اس تہذیبی غلبے نے ہمارے دل و دماغ تک بدل ڈالے۔ یہ اسی غلبے کے نتائج میں سے ایک منحوس نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے اہل مغرب کے اس تصور قومیت کو قبول کر لیا جس سے وہ انیسویں صدی تک نا آشنا تھے۔ پھر اس قومیت کے ساتھ انہوں نے قوم پرستی بھی انہی سے سیکھ لی جس کی بنا پر حکومتوں کی پالیسیوں کی بدولت ہر ملک اور ہر نسل کا مسلمان ایک بڑی حد تک اسلام کی بین الاقوامی برادری سے کٹ کر صرف

اپنے ہی ملک اور اپنی ہی نسل کا آدمی بن کر رہ گیا۔ اس کی وفاداری اپنے ہی ملک تک محدود ہو گئی۔ اس کے حقوق بھی اپنے ہی ملک کے حدود میں محصور ہو گئے۔ دوسرے مسلمان اس ملک کے لئے ویسے ہی اجنبی اور غیر بن گئے جیسا کوئی غیر مسلم ہو سکتا تھا، اور تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے دار السلام کی وحدت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جو قوم دنیا میں سب سے زیادہ اس دشنام سے بعید ہو سکتی تھی، جو قوم دنیا میں اس حیثیت سے اٹھائی گئی تھی کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔

"تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوع انسانی کے لئے اٹھائی گئی ہے"

اس نے کفار سے قوم پرستی کا سبق سیکھ کر اس بین الاقوامی وحدت کے ٹکڑے اڑا دیئے جو اسلام کی بدولت اسے مفت ہاتھ آ گئی تھی۔ حالانکہ دوسرے اسے دنیا بھر کی دولت خرچ کر کے بھی حاصل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۔

انیسویں صدی کے وسط سے اہل مغرب مسلمانوں کی اس وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور انہیں قومیت کی پٹی پڑھا رہے تھے۔ اس کا پہلا خمیازہ ہم کو جنگ عظیم اوّل میں اس طرح بھگتنا پڑا کہ ایک مسلمان قوم نے دوسری مسلمان قوم کے خلاف عین اس حالت میں بغاوت کر دی جب کہ وہ دشمنوں سے برسر جنگ تھے۔ اس میں قصور ایک کا نہ تھا بلکہ دونوں کا تھا۔ ایک نے اہل عرب سے تورانی قومیت کا سبق سیکھا تھا اور دوسری نے انہی اہل عرب سے عربی قومیت کا سبق سیکھ لیا تھا۔ ایک ہی استاد کے دونوں شاگرد تھے۔ اور اس کی تعلیم نے دونوں کے ذہن سے یہ بات نکال دی تھی کہ ان کے درمیان اسلام کا بھی کوئی رشتہ ہے۔ ترک اس بات کو بھول گئے تھے کہ جس سلطنت کو وہ لئے بیٹھے تھے وہ اسلامی خلافت کی علمبردار ہے۔ اور اس میں صرف تورانی نسل ہی آباد نہیں ہے، عرب اور دوسرے عناصر بھی آباد ہیں۔ جو اسلام کے وفادار تو ہو سکتے ہیں مگر تورانیت کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ عرب اس بات کو بھول گئے کہ کافروں کے دکھائے ہوئے سبز باغ کے فریب میں آ کر

جن کے مقابلے میں وہ ہتھیار اٹھا رہے ہیں وہ ان کے اپنے ہی مسلمان بھائی ہیں اور جس آزادی کی امید دلا کر انہیں اپنے بھائیوں سے لڑایا جا رہا ہے۔ وہ غلامی کا ایک دوسرا پھندا ہے جسے خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کے گلے میں ڈالنے کا سامان کیا جا رہا ہے قومیت کے نشے نے یہ سب کچھ بھلا کر دونوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور اس کا نتیجہ اس بدترین صورت میں ہمارے سامنے آیا کہ ایک طرف ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑ گئے، ترکوں کے لئے خود اپنے وطن کی آزادی بچانی بھی مشکل ہو گئی۔ اور جب وہ کسی نہ کسی طرح اسے بچا لینے میں کامیاب ہو گئے تو جو بری بھلی خلافت صدیوں سے قائم چلی آ رہی تھی۔ اسے انہوں نے خود ختم کر لیا، سلطنت کا رشتہ دین سے توڑ ڈالا۔ رسم الخط تک تبدیل کر دیا۔ اور دینِ اسلام سے اپنے سارے رشتے کاٹ کر بیٹھ گئے۔ دوسری طرف عربوں کو وہ آزادی نہ مل سکی جس کی خاطر وہ دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں میں کھیل گئے تھے۔ عراق پر انگریز قابض ہو گیا۔ شام اور لبنان پر فرانس مسلط ہو گیا۔ فلسطین انگریزوں کے انتداب (MANDATE) میں دے دیا گیا۔ اور انہوں نے اسے یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا خمیازہ اس قوم پرستی کا جو ہم نے پہلی جنگِ عظیم میں بھگتا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ مشرق سے مغرب تک وہ بہت سی مسلمان قومیں آزاد ہو گئیں۔ جو ایک مدت دراز سے مغربی استعمار کی غلامی میں مبتلا تھیں۔ ان قوموں کی الگ الگ آزاد و خود مختار ریاستوں کا وجود میں آنا تو بہر حال تاریخی اسباب کا لازمی تقاضا ہے۔ جسے ہم نہیں بدل سکتے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سب ریاستیں قومیت اور قوم پرستی کے انہی تصورات کی پیروی کر رہی ہیں جن کی تعلیم انہوں نے اپنے سابق مغربی آقاؤں سے حاصل کی تھی۔ دارالسلام کی واحد قومیت، مشترک شہریت اور دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کا تخیل تو دور کی چیز ہے ان کے اندر ابھی تک یہ شعور و احساس بھی پیدا نہیں ہو سکا ہے کہ ان کے درمیان اسلام کا ایک رشتہ موجود ہے۔ جو انہیں اور ان کی مسلمان آبادیوں کو جمع کر سکتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کا مددگار و خیرخواہ

بنا سکتا ہے۔ ان کی باہمی ترقی کے لئے تعاون کی راہیں کھول سکتا ہے۔ اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے بھی وہ انہیں ایک دوسرے کا رفیق بنا سکتا ہے۔ قومیت کا مغربی تصور ان پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ وہ آج تک اپنی قوم سے باہر کے مسلمان کو ویسا ہی اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہیں جیسا کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے۔ اپنے قومی مفاد کی خاطر دوسری مسلمان قوم سے لڑ جانے میں بھی انہیں کوئی باک نہیں ہے۔ ایک مسلمان قوم کے غیر مسلم دشمن کو دوست بنا لینے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہے۔ ایک مسلمان قوم پر ظلم وستم کے پہاڑ بھی ٹوٹ جائیں۔ تو ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور آج وہ سب خطرے میں مبتلا ہیں۔ کہ بین الاقوامی طاقتوں کے کسی عالمگیر تصادم میں وہ ایک ایک کر کے اپنی آزادی پھر نہ کھو بیٹھیں۔

ان حالات میں یہ ایک بڑی خوش آیند آواز اٹھی ہے کہ مسلمان حکومتوں کے سربراہ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اپنے مشترک مسائل پر غور و فکر کریں۔ اور انہیں حل کرنے کے لئے باہمی تعاون کی کوئی شکل نکالیں عقل کہتی تھی کہ اس آواز کا خیر مقدم کیا جائیگا مگر کان سن رہے ہیں اور آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ غیر مسلموں سے بھی بڑھ کر ہمارے اپنے مسلمان بھائیوں کو سرے سے اس آواز کا اٹھنا بھی ناگوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے نام پر قومی ریاستوں کو جمع کرنا کیا معنی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں جو ساتھ ہی ساتھ یہ نعرہ بھی بلند کرتے جاتے ہیں کہ اشتراکی انقلاب کی قائل ریاستوں کو مجتمع ہو جانا چاہیئے۔ گویا اشتراکیت پر جمع ہونا تو حلال اور طیب ہے۔ البتہ اسلام پر جمع ہونا حرام ہے۔ کسی جامع رشتے کی بنیاد پر اتفاق و اجتماع بجائے خود قابل اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ رشتہ خدا کے دین کا نہیں۔ کارل مارکس کے دین کا ہونا چاہیئے۔ یہ ہے مغربی مستعمرین کا وہ جادو جو ان کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد بھی ان کے شاگردوں کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ استاد چاہے مسیحیت کے تعصب پر مجتمع ہو کر مسلمان قوموں پر ظلم ڈھاتے رہے ہوں اور آج بھی ان کی دشمنی میں کسر نہ اٹھا رکھتے ہوں۔ مگر شاگردکو جب انہوں نے یہ سکھا دیا کہ اسلام کے ساتھ تعلق کا اظہار ہی رجعت پسندی

ہے۔ تو وہ اس رجعیت کا مظاہرہ کر کے اپنی ترقی پسندی کو بٹہ کیسے لگا سکتا ہے۔

مسلمان حکومتوں کے اجتماع کی تجویز پر جتنے اعتراضات قریب کے زمانے میں میں نے سنے ہیں۔ ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رہنماؤں اور مسلمان قوموں کے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے دماغ بالکل الجھے ہوئے ہیں۔ وہ حقائق کو سیدھے اور صاف طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مسلمان ریاستوں کے اجتماع پر اعتراض کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ جبکہ دنیا میں ایک برٹش کامن ویلتھ موجود ہے جس میں شریک ہونے والے ملکوں کے درمیان کوئی رشتہ اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ سب ملک ایک وقت میں انگریز کے غلام رہ چکے ہیں۔ ان کی نہ تہذیب ایک ہے نہ زبان ایک، نہ معاشی زندگی میں وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور نہ ان کے درمیان کوئی جغرافی اتصال پایا جاتا ہے۔ پھر بھی اس برٹش کامن ویلتھ کے وجود پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی طرح افریقہ میں افریقی قوموں کی ایک تنظیم قائم ہے۔ جس کے شرکا میں رنگ کی سیاسی اور سفید فام اقوام کے مقابلے میں سیاہ رنگ لوگوں کے مفاد کی حفاظت کے سوا اور کوئی وجہ اشتراک نہیں ہے اس تنظیم میں تو وہ لوگ بھی شریک ہیں جو مسلمان حکومتوں کے اتحاد پر آج سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ پھر ایک اور اتحاد اشتراکی ملکوں کے درمیان وارسا پیکٹ کی شکل میں۔ اور ایک دوسرا اتحاد براعظم امریکہ کی ریاستوں کے درمیان ریاست ہائے امریکہ کی تنظیم کی شکل میں موجود ہے۔ مگر ان تنظیموں اور اتحادوں پر آج کوئی معترض نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان ریاستیں باہم جمع ہوں تو ان کے اجتماع پر کوئی اعتراض کرنے والا کیا حق رکھتا ہے؟ آخر کس اصول کس نظریے، کس فلسفے کی رو سے وہ اس پر اعتراض کر سکتا ہے۔ ان مسلمان قوموں کے درمیان پاکستان سے مراکو اور مغربی افریقہ تک جغرافی حدود مسلسل مشترک ہیں۔ اور اگر سمندر کے حائل ہونے کو جغرافیائی اتصال میں مانع نہ سمجھا جائے تو انڈونیشیا اور مالیشیا بھی اس اشتراک میں شامل ہیں۔ ان کے درمیان صرف مذہب ہی کا ایک رشتہ نہیں ہے، تمدن اور تہذیب کا رشتہ بھی موجود ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک چلے جائیے، صاف

معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک مشترک تہذیب ہے جس کے چند بنیادی اصول ہر جگہ یکساں جاری و ساری ہیں۔ میں خواہ کسی ملک میں جاؤں، آذان کی آواز میرے کانوں میں آتے ہی فوراً مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ یہاں میرے اپنے بھائی موجود ہیں۔ اور ایک مسجد بھی یہاں ضرور پائی جاتی ہے جس کی جماعت کا میں بھی ویسا ہی ایک ممبر ہوں۔ جیسا اس ملک کے باشندوں میں سے کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ میں جا کر اس میں شریک ہوتا ہوں تو وہاں کوئی مجھے اجنبی نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں ایک دوسرے مسلمان ملک سے آیا ہوا ہوں مسجد کے مقامی حاضرین دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور محبت سے مجھے گلے لگاتے ہیں۔ میں ان کی زبان سے واقف نہیں ہوں۔ مگر السلام علیکم میرے اور ان کے درمیان مشترک ہے خطبے اور نماز کی زبان میرے لئے بے گانہ نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین اور اللہ اکبر پر میرے اور اُن کے درمیان پورا اتفاق ہے۔ نماز کی شکل اور ہیئت انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک ایک ہی ہے۔ جماعت کے لوگ مجھ اکیلے اجنبی کو بھی امام بنا سکتے ہیں۔ اور میں اکیلا اجنبی ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہوں مسجد سے نکل کر میں اس ملک کی مسلم سوسائٹی میں جہاں بھی جاؤں میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا اتحاد موجود ہے۔ میں ہر جگہ ان کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہوں۔ کہ جن چیز کو میں حرام سمجھتا ہوں۔ یہ بھی انہیں حرام سمجھتے ہیں۔ اور پاکی اور طہارت کے جن قواعد کا میں قائل ہوں۔ یہ بھی اُن کے قائل ہیں۔ پھر جس مسلمان ملک میں بھی میں جاتا ہوں۔ اس کے خواص ہی نہیں عوام تک بازاروں اور بسوں اور ہوٹلوں میں جب مجھ سے ملتے ہیں تو میرے ملک کے مسلمانوں کی خیریت اس طرح پوچھتے ہیں۔ جیسے ایک کنبے کے لوگ اپنے رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اچھے حالات سنتے ہیں تو الحمد للہ کہتے ہیں۔ اور خوشی ان کے چہروں پر چمک رہی ہوتی ہے۔ بُرے حالات سنتے ہیں تو اس پر ویسے ہی غمگین ہوتے ہیں جیسے میرے اپنے ملک کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ ان تمام ملکوں کے درمیان نکاح و طلاق و وراثت کے قوانین اس قدر ایک دوسرے کے قریب ہیں کہ ان کے درمیان

باہمی ازدواج تک میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ کیفیت دنیا کی کسی دوسری قوم کے ملک میں جاکر مجھے کہیں اور کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے درمیان جذبات کا، ہمدردی کا اور خیرخواہی کا، تہذیب اور ثقافت کا ایک گہرا اور مضبوط رشتہ موجود ہے۔ جسے آج اس قوم پرستی کے جنون کے دور میں بھی کوئی چیز توڑ نہیں سکی ہے اور اس کے ساتھ جغرافی حیثیت سے بھی ہمارے ملک ایک دوسرے سے از شرق تا غرب متصل ہیں۔ پھر آخر کیوں نہ ہم اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار بننے کے لئے باہم مجتمع ہوں؟ اس پر مزید ایک وجہ ہمارے اجتماع کے لئے یہ بھی ہے کہ جس جغرافی علاقے میں ہمارے ملک واقع ہیں۔ اسے بڑی طاقتوں کی بین الاقوامی کشمکش کے تباہ کن اثرات سے ہمارا ایک ایک ملک اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اس لئے ہمارا متحد ہونا ویسا ہی ضروری ہے۔ جیسا افریقی قوموں کے لئے استعماری طاقتوں کی دستبرد سے بچنے کے لئے متحد اور منظم ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ اگر رنگ کا اشتراک اور جغرافی اتصال اور ایک مشترک مفاد کا موجود ہونا، ان کے متحد اور منظم ہونے کے لئے جائز اور معقول وجہ ہے جس کی بنا پر افریقی قوموں کی تنظیم پر کسی کو اعتراض نہیں ہے، تو اس سے بدرجہا زیادہ گہرے رشتوں کی بنا پر ایک مشترک مقصد کے لئے ہمارا اتحاد کیوں جائز اور معقول نہیں ہے، اور کس بنا پر کوئی صاحب عقل آدمی اس پر اعتراض کرسکتا ہے؟

جو حضرات مذہب کی بنیاد پر مسلمان ملکوں کے متحد ہونے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان سے میں پوچھتا ہوں کہ جب مذہبی تعصب ہی اس ظلم اور زیادتی کی بنیاد ہو جو مغربی قومیں دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں پر کر رہی ہے۔ تو آخر اس سے اپنا بچاؤ کرنے کے لئے وہ لوگ کیوں نہ متحد ہوں جو اس تعصب کے شکار ہو رہے؟ مغربی قومیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس تعصب کو آج تک دل سے نہیں نکال سکی ہیں جو صلیبی لڑائیوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ آپ خواہ ان سے مذہبی رواداری کے کتنے ہی سبق سیکھیں اور مذہبی حیثیت سے اپنے آپ کو کتنا ہی بے حس ثابت کرکے ان کی نگاہ میں سرخرو بننے کی کوشش

کریں۔ وہ نہ آپ کے مسلمان ہونے کو معاف کر سکتے ہیں، اور نہ آپ کو اس کی سزا دینے میں کوئی کسر باقی چھوڑ سکتے ہیں۔ وہ صرف خود ہی ظلم نہیں کرتے بلکہ دنیا میں جہاں بھی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی جھگڑا ہو، ان کی ہمدردیاں غیر مسلم کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ظالم ہو اور مسلمان کیسا ہی سخت مظلوم ہو۔ پہلی ہی جنگ عظیم میں فلسطین پر قبضہ کر کے لارڈ ایلنبی نے جو اعلان کیا تھا۔ وہ آخر کس سے پوشیدہ ہے۔ اسی جذبے کے تحت فلسطین سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دینے اور ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو لا بسانے کا اہتمام کیا گیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کسی دوسری قوم کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کیا گیا ہوتا۔ تو امریکہ اور یورپ کے لوگ اسی اطمینان سے ساتھ اس کو دیکھتے؟ ہندوستان کی تقسیم کے وقت جان بوجھ کر کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو تحفے کے طور پر بھارت کے حوالے کیا گیا۔ اور اس کے بعد ۱۹ سال سے وہاں کی مسلم آبادی کے ساتھ جو ہولناک ظلم ہو رہا ہے۔ اس پر اُن آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا جو ہنگری کے لیے کبھی روتے نہیں تھکتیں۔ حالانکہ ہنگری کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے۔ اس کو اس ظلم سے کوئی نسبت نہیں ہے جو کشمیر میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح قبرص کے ترکوں پر یونانی جو ظلم ڈھا رہے ہیں۔ اہل مغرب کی ساری ہمدردیاں اس معاملے میں ترکوں کے ساتھ نہیں بلکہ یونانیوں کے ساتھ ہیں۔ صرف اس لئے کہ ظالم عیسائی ہیں اور مظلوم مسلمان، اس معاملہ میں امریکہ نے اس گہری دوستی کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا۔ جو ترکی اس کے ساتھ رکھتا تھا۔ افریقہ کے مختلف ملکوں میں جو ظلم، برطانیہ، فرانس، بلجیم، پرتگال اور دوسری عیسائی قوموں نے مسلمانوں پر کیا ہے۔ اس کی تو کوئی نظیر مذہبی تعصب کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی تہذیب کو مٹایا گیا۔ ان کی معاشی طاقت توڑ دی گئی۔ ان کو تعلیم سے محروم رکھا گیا۔ اور کسی شخص کو اس وقت تک تعلیم نہ دی گئی، جب تک وہ عیسائی نہ ہو جائے۔ یا کم از کم اپنا نام تبدیل کر کے عیسائی نام نہ رکھ لے۔ پھر فوج اور دیوانی نظم و نسق میں جن افریقیوں کو بھی جگہ دی گئی وہ زیادہ تر عیسائی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افریقہ کے نئے آزاد ملکوں میں بکثرت ملک جن کی اکثریت مسلمان ہے۔ ان میں یا تو حکومت ہی

عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ یا اگر مسلمان اوپر آئے بھی ہیں تو ان کی فوج اور ان کے دیوانی نظم و نسق میں عیسائی اتنے طاقتور ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت وہاں چلنی سخت دشوار ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی تعصب ہی کی بنا پر دنیا میں ہر جگہ ظلم کے شکار ہوتے رہے ہوں اور آج بھی ہو رہے ہوں۔ وہ آخر اس مذہب کی بنیاد پر اپنے آپ کو ظلم سے بچانے کے لیے کیوں نہ متحد ہوں جس کی وجہ سے ان کو تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ ظالموں کا ظلم پر متحد ہونا زیادہ معیوب ہے یا مظلوموں کا ظلم سے بچاؤ کے لیے متحد ہونا۔

ان وجوہ سے مجھے ان لوگوں پر سخت حیرت ہے۔ جو مسلمان ممالک کے اتحاد کی مخالفت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر ریاستوں کا جمع ہونا غلط ہے اشتراکیت کے نام پر جمع ہو جانا صحیح رنگ کی بنیاد پر جمع ہو جانا بھی صحیح۔ لیکن صرف خدا کے نام پر اور خدا کے دین کے نام پر جمع ہونا بہت بری بات ہے۔

یہ منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں صرف اپنے دینی و ثقافتی اور معاشی مسائل کو حل کرنے، اور صرف اپنی مادی و تمدنی ترقی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے لیے جمع نہ ہو جانا چاہیے۔ بلکہ اپنے دفاع کو متحدہ کوشش سے مضبوط کرنے کے لیے بھی جمع ہونا چاہیے اور کم از کم یہ فکر تو ضرور کرنا چاہیے کہ مسلم ممالک خود اپنے ہاں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دیں۔ تاکہ وہ اپنے دفاع کے لیے روس یا امریکہ یا برطانیہ سے ہتھیار نہ مانگتے پھریں ◆

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

قومی وحدت اور پائیدار جمہوریت کی مضبوط بنیادیں

انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری چیز ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے اس کا اپنا ایک انفرادی مزاج، انفرادی مذاق اور انفرادی ذہن لازماً رہے گا اور یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تمام انسان ہر لحاظ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہو جائیں۔

دوسری طرف اجتماعی زندگی بسر کرنا بھی خود انسان ہی کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے اور یہ اجتماعیت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ انسانی کے درمیان معاملات میں تعاون، خیالات میں موافقت، اغراض و مقاصد میں اشتراک اور اختلافات میں رواداری نہ ہو۔ ایک بڑا معاشرہ تو درکنار، ایک گھر بھی بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس میں رہنے والوں کی انفرادیت بات بات پر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہے اور ان کے اختلافات ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

انسانی فطرت کے یہ دو مختلف اور بڑی حد تک متضاد تقاضے ہیں اور ایک کامیاب نظامِ زندگی کی تعمیر کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ان کے تصادم کو روکا جائے اور ان میں مصالحت کی ایسی راہ تلاش کر لی جائے کہ یہ دونوں تقاضے ایک ساتھ پورے ہو سکیں۔ دنیا میں جہاں بھی تعمیری ترقی ہوئی ہے، اسی وقت ہوئی ہے جب معاشرے نے کچھ ایسے بنیادی اصول اپنا لیے ہیں جن پر اس کے زیادہ سے زیادہ افراد متفق ہوں اور اس اتفاق میں ایسی گنجائشیں رکھی گئی ہوں کہ اختلافِ طبائع کے تقاضے بھی اسی کے اندر پورے ہو جائیں لیکن جہاں ایسا نہیں ہو سکا ہے وہاں تعمیر رک گئی ہے اور تخریبی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔

آزادی کے باوجود ہم نہیں بدلے

پاکستان میں پچھلے کئی سالوں سے جو صورتِ حال رونما ہے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل وجہ اتفاق کی بنیادیں تلاش کرنے میں ہماری ناکامی ہے ہمیں اپنی مرضی

سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنے کا اختیار حاصل ہوئے ایک طویل مدت گزر چکی ہے مگر جہاں ہم پہلے روز کھڑے تھے وہیں آج بھی کھڑے ہیں۔ بے اختیاری کے زمانے میں جو کچھ اور جیسے کچھ ہمارے حالات تھے، اختیار پاکر بھی ہم ان کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے کوئی کامیاب اور قابلِ ذکر کوشش نہ کر سکے۔ ہمارا انتظامی ڈھانچہ اور اس کا مزاج وہی ہے۔ قانونی نظام وہی ہے۔ تعلیمی نظام وہی ہے۔ معاشی نظام وہی ہے۔ اخلاق و معاشرت کا حال وہی ہے۔ مذہبی حالت وہی ہے۔ کسی چیز کی اصلاح و ترقی کے لیے بھی ہم کوئی قدم نہ اٹھا سکے، بلکہ قدم اٹھانے کے لیے اس کی سمت تک متعین نہ کر سکے۔ آزادی کے لیے ہماری سعی و جہد تو اسی غرض کے لیے تھی کہ ہم غلامی کے دور کی حالت پر راضی نہ تھے اور اسے بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے اپنی مرضی استعمال کرنا چاہتے تھے، مگر کوئی چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی مؤثر طریقے سے استعمال نہ کر سکے۔

وہ چیز کیا ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں اختلافات کی فصلِ بہار آئی ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولیوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات نت نئی شان سے ابھرتے رہے ہیں اور ابھرتے چلے آرہے ہیں۔ جو کچھ ایک بنانا چاہتا ہے دوسرا اس میں مزاحم ہوتا ہے، اور دوسرا جو کچھ بنانا چاہتا ہے کوئی تیسرا اسے بگاڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اس صورتِ حال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی ہے۔ بے خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

تعمیری عوامل کی تلاش چنداں مشکل نہیں

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں اختلاف اور مخالفت و مزاحمت کے اندھے جنون سے افاقہ پانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اپنے ذہن کو اُن بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیے جن پر سب یا کم از کم اکثر باشندگانِ ملک متفق ہو سکیں، جن پر متفق ہو کر ہماری قوتیں اپنی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔

ایسی بنیادیں تلاش کرنا درحقیقت مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن وجوہِ نزاع کرید کرید کر نکالنے کے بجائے اساساتِ اتفاق ڈھونڈھنے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ذرا سا زاویۂ نظر بدل جائے تو ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساساتِ اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔ ہم انہیں اپنے مذہب میں پا سکتے ہیں، اپنی تہذیب اور روایات میں پا سکتے ہیں، دنیا کے تجربات میں پا سکتے ہیں، اور عقلِ عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پا سکتے ہیں۔

اتحاد و اتفاق کے پانچ بنیادی اُصول

یہاں ہم چند اُن بنیادی اصولوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن پر اتفاق ممکن ہے، تاکہ سوچنے والے اُن پر غور کریں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم ان اُصولوں کو لیتے ہیں جو ملک میں تعمیری فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے کہ اگر فضا ہی سازگار نہ ہو تو ملک کے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر گفتگو کرنا لاحاصل ہے۔

۱۔ ہر حال میں صداقت و انصاف کا احترام

اوّلین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیے، وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔ اختلاف اگر ایمانداری کے ساتھ ہو، دلائل کے ساتھ ہو، اور اسی حد تک رہے جس حد تک فی الواقع اختلاف ہے، تو اکثر حالات میں یہ مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس طرح مختلف نقطۂ نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آ جاتے ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کو قبول کریں۔ تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مضر نہیں ہو سکتا۔ لیکن کسی معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اُس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ "جنگ میں سب کچھ حلال ہے" کا ابلیسی اُصول اختیار کر کے اس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے، اُس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے، اُس کے نقطۂ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے، سیاسی اختلاف ہو تو اُسے غدار اور

دشمنِ وطن ٹھیرائے، مذہبی اختلاف ہو تو اس کے پُورے دین و ایمان کو متہم کر ڈالے، اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ گویا اب مقصدِ زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ ہے، بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تکدر پیدا ہو جاتا ہے جو تعاون و مفاہمت کے لیے نہیں بلکہ صرف تصادم و مزاحمت ہی کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لیے عارضی منفعت کا کوئی پہلو ہو تو ہو، مگر بحیثیتِ مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے جس سے بالآخر خود وہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے جو اختلاف کے اس بیہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو، ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم خود اپنے لیے چاہتے ہیں۔

۲۔ باہمی رواداری اور دُوسرے کے حقِ رائے کو تسلیم کرنا

دُوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے، اختلافات میں رواداری، ایک دُوسرے کے نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش، اور دُوسروں کے حقِ رائے کو تسلیم کرنا ہے۔ کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے، لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نبھ سکتا۔ پھر اس پر مزید خرابی اس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ "ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جا سکتی، لہٰذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بدنیت ہے"۔ یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے، اختلاف کو مخالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور معاشرے کے مختلف عناصر کو جنہیں بہرحال ایک ہی جگہ رہنا ہے، اس قابل نہیں رہنے دیتی

گروہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر کسی مفاہمت و مصالحت پر پہنچ سکیں۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک مدتِ دراز تک معاشرے کے عناصر ترکیبی آپس کی کشمکش میں مبتلا رہیں اور اس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جب تک کوئی ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے، یا پھر سب لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے۔ بدقسمتی سے نارواداری اور بدگمانی اور خود پسندی کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت ہی کم لوگ بچے ہوئے ہیں حکومت اور اُس کے اربابِ اقتدار اس میں مبتلا ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اس میں مبتلا ہیں۔ مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ بستیوں اور محلوں اور دیہات تک اِن کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے۔ اس کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و اثر رکھتے ہیں اپنی روش تبدیل کریں اور خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور وسعتِ ظرف کا سبق دیں۔

۳۔ اختلاف برائے اختلاف سے اجتناب

تیسری چیز جسے تمام اُن لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں، یہ ہے کہ ہر شخص اپنی قوتیں دوسروں کی تردید میں صرف کرنے کے بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے پر صرف کرے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لیے اُس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے، مگر اس نفی کو اسی حد تک رہنا چاہیے جس حد تک وہ ناگزیر ہو، اور اصل کام اثبات ہونا چاہیے نہ کہ نفی۔ افسوس کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی مذمت کی جائے اور اس کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کر دی جائے۔ بعض لوگ تو اس منفی کام سے آگے بڑھ کر سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں، اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں ہر دوسرا شخص جو موجود ہے اُس کی اور اُس کے کام کی پہلے مکمل نفی ہو جائے۔ یہ ایک نہایت غلط طریقِ کار ہے اور اس سے بڑی قباحتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے تلخیاں

پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے تعصبات اُبھرتے ہیں۔ اس سے عام بے اعتباری پیدا ہو جاتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طرز پر سوچنے کے بجائے تخریبی طرز پر سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

یہ روش خصوصیت کے ساتھ موجودہ حالت میں تو ہمارے ملک کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا خلا پایا جاتا ہے جو ایک قیادت پر سے عوام کا اعتماد اُٹھ جانے اور دُوسری کسی قیادت پر نہ جمنے کا نتیجہ ہے۔ اس خلا کو اگر کوئی چیز بھر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے۔ کیا کچھ بنانا چاہتا ہے، اور کس کے ہاتھوں کیا کچھ بننے کی توقع کی سکتی ہے۔ یہی چیز آخر کار ایک یا چند جماعتوں پر قوم کو مجتمع کر سکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی تعمیری کام ممکن ہو گا۔ لیکن اگر صورت حال یہ رہے کہ ہر ایک اپنا اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسرے کا اعتماد ختم کرنے میں لگا رہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے گا اور ساری قوم بِن سِری ہو کر رہ جائے گی۔

۴۔ جبر و دھونس کی بجائے دلیل و ترغیب

ایک اور بات جسے ایک قاعدۂ کلیہ کی حیثیت سے سب کو مان لینا چاہیے یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ جو کوئی بھی اپنی بات دُوسروں سے منوانا چاہتا ہو وہ جبر سے نہیں بلکہ دلائل سے منوائے، اور جو کوئی اپنی کسی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو وہ بزور نافذ کرنے کے بجائے "ترغیب و تلقین سے لوگوں کو راضی کر کے نافذ کرے۔ محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا ہے، اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اُٹھے اور زبردستی اس کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریقِ کار کا لازمی نتیجہ کشمکش، مزاحمت اور بدمزگی ہے۔ ایسے

طریقوں سے ایک چیز مسلط تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کامیابی کے لیے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضامندی ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے خواہ وہ حکومت کی طاقت ہو یا مال و دولت کی یا نفوذ و اثر کی، وہ بالعموم اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے، بس طاقت کا استعمال کافی ہے لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے، ملکوں کے نظام تہ و بالا کر دیے ہیں اور اُن کو پُر امن ارتقاء کے راستے سے ہٹا کر بے تکے تغیرات و انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے با اثر لوگ اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اور اسی طرح پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انہیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہ چلنے دیں گے۔

۵۔ قومی مفاد کو مقدم رکھنا

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کو ختم کر کے مجموعی طور پر پورے ملک اور ملت کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچنے کا خوگر ہونا چاہیے۔ ایک مذہبی فرقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا، یا ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا، یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے۔ اس کی نہ کسی طرح مذمت کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود دلچسپیوں کی بنا پر تعصب اختیار کرنا شروع کرتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا مقاصد کے لیے معرکہ آرائی پر اُتر آتے ہیں تو یہ چیز ملک اور ملت کیلئے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے۔ اس کو اگر نہ روکا جائے تو ملک پارہ پارہ ہو جائے اور ملت کا شیرازہ بکھر جائے جس کے بُرے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح

ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس فرقے، قبیلے، نسل، زبان یا صوبے سے بھی اس کا تعلق ہو اُس کے ساتھ اُس کی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یہ دلچسپی جب بھی تعصب کی شکل اختیار کرے گی تباہ کن ثابت ہوگی۔ ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کر دیتا ہے، اور تعصب کے مقابلے میں تعصب کشمکش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر بھلا اس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی آپس ہی میں برسرِ پیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے۔ کسی ملک میں اس طرح کی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لیے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ حق دو ضروری شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ ملک کی بھلائی ہی کے لیے خواہاں اور کوشاں ہوں۔ اور دوسری شرط یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت یا مصالحت اصولی ہو اور معقول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مفقود ہوگی اس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لیے مصیبت بنا دے گا۔ اگر ایک پارٹی اپنے مفاد اور اپنے چلانے والوں کے مفاد ہی کو اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور بنا بیٹھے اور اس فکر میں ملک کے مفاد کی پروا نہ کرے تو وہ سیاسی پارٹی نہیں بلکہ قزاقوں کی ٹولی ہے اور اگر مختلف پارٹیاں مسابقت میں ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور مصالحت کسی اصول پر کرنے کے بجائے اختیار واقتدار کے بٹوارے کی خاطر کیا کریں تو ان کی جنگ بھی ملک کے لیے تباہ کن ہوگی اور صلح بھی۔

نظامِ حکومت کی بنیادیں

یہ پانچ اصول تو وہ ہیں جن کی پابندی اگر ملک کے تمام عناصر قبول نہ کر لیں تو یہاں سرے سے وہ فضا ہی پیدا نہیں ہو سکتی جس میں نظامِ زندگی کی بنیادوں پر اتفاق ممکن ہو، یا بالفرض اس طرح کا کوئی اتفاق مصنوعی طور پر واقع ہو بھی جائے تو وہ عملاً کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکے۔ اس کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ بنیادیں کیا ہو سکتی ہیں جن پر ایک صحیح مصالحانہ فضا میں زیادہ سے زیادہ

اتفاق کے ساتھ ملک کا نظامِ زندگی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

① قرآن وسنّت کی بالادستی

ان میں سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن وسنت کو ملک کے آئندہ نظام کے لیے منبعِ ہدایت اور اوّلین ماخذِ قانون تسلیم کیا جائے۔ اس کو بنیادِ اتفاق ہم اس لیے قرار دیتے ہیں کہ ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور وہ اس بنیاد کے سوا کسی اور چیز پر راضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اُن کا عقیدہ اس کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کی تہذیب اور قومی روایات اس کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور ان کی ماضی قریب کی تاریخ بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ ان کے لیے یہ گوارا کرنا سخت مشکل ہے بلکہ محال ہے کہ جس خدا اور جس رسولؐ پر وہ ایمان رکھتے ہیں اُس کے احکام سے وہ جان بوجھ کر منہ موڑ لیں اور اس کی ہدایات کے خلاف دوسرے طریقے اور قوانین خود اپنے اختیار سے جاری کریں۔ وہ کبھی اُن طریقوں کو جاری کرنے میں سچے دل سے تعاون نہیں کر سکتے اور نہ اُن قوانین کی برضا و رغبت پیروی کر سکتے ہیں جن کو وہ عقیدۃً باطل اور غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر آزادی کا جذبہ جس چیز نے بھڑکایا اور جس چیز کی خاطر اُنہوں نے جان ومال اور آبرو کی ہولناک قربانیاں دیں وہ صرف یہ تھی کہ انہیں غیر اسلامی نظامِ زندگی کے تحت جینا گوارا نہ تھا اور وہ اسے اسلامی نظامِ زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔ اب ان سے یہ توقع کرنا بالکل بے جا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ بخوشی اس اصل مقصد ہی سے دست بردار ہو جائیں گے جس کے لیے انہوں نے اتنی گراں قیمت پر آزادی خریدی ہے۔ بلاشبہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اگر کوئی جابر طاقت زبردستی ان کے اس مقصد کے حصول میں مانع ہو جائے اور اُن پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ حیات مسلط کر دے تو وہ اُسی طرح مجبوری کے ساتھ اسے برداشت کر لیں جس طرح انگریزی تسلط واقع ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے برداشت کیا تھا۔ لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ ایک نارضامند آبادی پر جبر سے ایک نظام مسلط کر کے اسے کامیابی کے ساتھ چلایا بھی جا سکتا ہے، وہ یقیناً سخت نادان ہے۔

جن لوگوں کو اس بنیاد سے اتفاق نہیں ہے وہ چار طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ایک، وہ مسلمان جو اخلاق تہذیب اور معاشرت میں اس حد تک مغربی رنگ اختیار کر چکے ہیں کہ اب انہیں اسلامی طرزِ زندگی کی طرف پلٹنے کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ دُوسرے، وہ مسلمان جو مسلمان ہونے سے تو منکر نہیں مگر مغربی افکار و نظریات سے اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں کہ انہیں اب اسلام پر اعتقاد باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دونوں طبقے اپنے مخصوص رجحانات کے سبب سے ایک لادینی (سیکولر) نظام اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں، کیونکہ وہی ان کے مزاج و مذاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتے مگر سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کو لینا چاہتے ہیں اور چوتھے طبقے میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتیں شامل ہیں جو مسلمانوں کے دینی نظام کی بہ نسبت ایک غیر دینی نظام کو ترجیح دیتی ہیں۔

ان میں سے پہلے تین طبقے مسلمانوں کی آبادی میں مجموعی طور پر ایک فی ہزار کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ اب کیا یہ انصاف ہے کہ ملک کا نظام اس بنیاد پر تو تعمیر نہ ہو سکے جسے کروڑوں آدمی چاہتے ہیں اور اُس بنیاد پر تعمیر ہو جسے چاہنے والے چند ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔؟ اگر بالفرض ایسا کیا بھی جائے تو کونسی طاقت ایسے نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ان کروڑوں آدمیوں کا قلبی تعاون حاصل کرے گی؟ ہم ان حضرات سے یہ نہیں کہتے کہ آپ اپنے خیالات کو یک لخت تبدیل کر دیں؛ البتہ جو بات ہم ان سے کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ملک کی بھلائی ایسی ہی بنیادوں پر اُس کا نظامِ زندگی تعمیر کرنے میں ہے جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق ممکن ہو، اور یہ اتفاق بہرحال لادینی پر، یا قرآن بلا سنت پر ممکن نہیں ہے لہٰذا آپ اپنے خیالات جو کچھ بھی چاہیں رکھیں، مگر مزاحمت چھوڑ دیں۔

رہے ہمارے غیر مسلم ہم وطن، تو انہیں پہلے بھی بارہا اطمینان دلایا جا چکا ہے، اور اب بھی یہ اطمینان دلانے کی پُوری کوشش کی جائے گی کہ مسلمانوں کا مذہب آپ پر مسلط نہیں کیا جائے گا، آپ کے مذہب اور تہذیب میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی، آپ کا پرسنل لا آپ کے لیے محفوظ

رہے گا، اور آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہاں عملاً اُس سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے جو دُنیا میں کہیں اقلیتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا یہ مطالبہ آخر کس بنا پر حق بجانب ہو سکتا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کی مرضی کے بجائے اقلیت کی مرضی کے مطابق بنے؟ اور اگر یہاں آپ کے مذہبی قوانین کو رائج نہیں ہونا ہے تو آپ کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہو جاتا ہے کہ یہاں کے ملکی قوانین اسلامی قانون کے اصولوں پر بنیں یا رومن لا کے اصولوں پر؟ آپ کے لیے دونوں یکساں اجنبی ہیں، پھر کس بنا پر آپ ان میں سے ایک کے مخالف اور دُوسرے کے طالب ہیں؟

قرآن و سنّت کو بنیاد بنانے کے خلاف ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن کی تعبیروں میں بکثرت اختلافات ہیں اور کوئی ایک تعبیر متفق علیہ نہیں ہے۔ رہی سنّت تو اس میں صرف تعبیرات ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کیا چیز سنّت ہے اور کیا نہیں ہے۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہ بنیاد ہے جس پر ملک کی آبادی کا کثیر حصّہ مُتفق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی خاص تعبیر کو نہیں بلکہ بجائے خود قرآن کو، اور سنّت کے متعلق کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ بجائے خود سُنّتِ رسولؐ اللہ کو نظامِ زندگی کی بنیاد قرار دے رہے ہیں، اور یہ بنیاد ایک ناقابلِ لحاظ اقلیت کو مُستثنیٰ کر کے تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ رہے اختلافات، تو وہ دو طریقوں سے بآسانی حل ہو سکتے ہیں:۔

اوّل یہ کہ مسلمانوں میں جو گروہ معتد بہ تعداد میں پائے جاتے ہیں (مثلاً حنفی، اہلحدیث، شیعہ) ان سے تعلق رکھنے والے معاملات پر قرآن کی اسی تعبیر اور سنّت کی اسی تشریح کا اطلاق ہو جو اِن کے نزدیک مسلّم ہے۔

دوم یہ کہ جو معاملات تمام ملک سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں وہ تعبیر و تشریح عملاً تسلیم کی جائے جس پر اکثریت مُتفق ہو۔ اور اقلیت کے لیے یہ حق باقی رہے کہ وہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اکثریت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

② جمہوریّت کا قیام

دوسری بنیاد جس پر اتّفاق ہو سکتا ہے، "جمہوریّت" ہے۔ یہ خود قرآن وسنّت کا منشا بھی ہے اور باشندگانِ ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ یہ ہے کہ :-

ملک کسی خاص شخص یا طبقے اور گروہ کا نہیں بلکہ اُن تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں، لہٰذا اس کا انتظام اُن سب کی، یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے اور ان کو اصولاً یہ حق اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے حکمران اپنی آزاد مرضی سے چُنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے اُن کو تبدیل کر سکیں۔

اس تصوّر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت سی شکلیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور بہت سی نئی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بحث اس کی کسی خاص شکل میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی یہاں اختیار کی جاتی ہے اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگانِ ملک کو نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں "جمہوریّت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے اس پر عام لوگوں کا مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہرحال ممکن نہیں ہے اور نہ یہی ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے سب یا اکثر باشندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔ ایسے نظام سے اگر دلچسپی ہو سکتی ہے تو اُسی طبقے کو ہو سکتی ہے جس کی مرضی اُس میں غالب ہو، اور ایک محدود طبقے کی دلچسپی نہ صرف یہ کہ کسی ملک کی فلاح و بہبود کی ضامن نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عام لوگوں کی دلچسپی کی ضد ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ یہ تضاد ایک کشمکش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اس نقصان دہ صورتِ حال میں مبتلا ہونے سے ملک کو بچانا ضروری ہے، اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، پہلے جمہوریت کے اصول کو صدقِ دل سے قبول کریں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں جس میں یہ اصول ٹھیک ٹھیک کارفرما ہو۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جبکہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں اور ایسے عناصر کا زور ہو جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر تجربات کی درسگاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امرِ واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آ جائے کہ اب اپنے بھلے برے کی وہ خود ذمہ دار ہے اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی، لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی مضرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹر شپ یا

اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں اور جب ان حالات کے ردّ و بدل یا بناؤ اور بگاڑ میں اُن کی رائے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں، انہیں اس نقصانِ عظیم سے بہر حال کوئی نسبت نہیں ہے۔

گذشتہ (انتخابات) میں ہمارے ہاں جو حالات بار بار پیش آتے رہے ہیں اُنہیں دلیل بناکر بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ یہ حضرات وقتاً فوقتاً اس کے لیے مختلف قسم کی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ یہاں جمہوریت تو ضرور ہونی چاہیے، مگر اسے قابو میں رکھنے والی ایک بالاتر طاقت بھی ضروری ہے جو اس کو بگڑتے دیکھ کر درست کر دیا کرے اور کوئی یہ پردہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا اور صاف کہتا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی جمہوریت سے ایک خیر اندیش اور مستعد آمریت بدرجہا بہتر ہے، لیکن اگر ٹھنڈے دل سے اُن تمام حالات پر غور کیا جائے جو اب تک یہاں پیش آئے ہیں تو کسی صاحبِ بصیرت کے لیے یہ بات سمجھنی مشکل نہ ہوگی کہ یہاں جو چیز ناکام ثابت ہوئی ہے وہ جمہوریت تھی ہی نہیں۔ جمہوریت تو نام ہی اُس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی و ملکی معاملات کو چلانے کے ذمے دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ کر اپنی غلطیوں کی خود تلافی کرتے چلے جائیں یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہو اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آجائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلّم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ یہاں تو جو چیز قائم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمریت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اب اگر اس کے بُرے نتائج سامنے آگئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے، اور اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اُسے کسی نقاب پوش یا بے نقاب آمریت کے حق میں دلیل ٹھیرایا جائے۔

یہ تو ہے استدلال کی غلطی۔ اب رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں، تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پُرامن طریقے ہی سے قائم ہو، بہرحال پُرامن طریقے سے دفع نہیں ہو سکتی اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں، بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو ـــ جمہوری نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی ـــ اس طرح کا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ آمریت کے اُن نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو بہرحال اس کے فطری نتائج ہیں؟ آمریت خواہ کتنی ہی خیر اندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے، اُس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دُور نہیں ہو سکتیں اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہُوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردّوبدل کسی کھلے طریقے سے نہیں، بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے جنہیں عوام النّاس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے، [illegible]۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر مُتصرّف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پُوری قومی طاقت دلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لیے حرکت میں آ سکے۔ اُس کا آغاز چاہے کیسی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو، انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں، مگر خلاصی کے جتنے پُرامن راستے ہوتے ہیں، وہ اُنہیں چُن چُن کر بند کر دیتی ہے اور مجبوراً

ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزلِ خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔

ان نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی کسی نوع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دے گا، خواہ آمریت کا وہ مقام خود اسی کو کیوں نہ حاصل ہو رہا ہو۔

۴ جمہوریت کی اصل رُوح اور لوازم

اب اگر شرحِ صدر کے ساتھ یہ طے کیا جائے کہ ہمارے ملک کا نظام جمہوری ہی ہونا ہے، تو اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ہم جمہوریت کو اس کی حقیقی رُوح کے ساتھ اختیار کریں اور اس میں آمریت کے لوازم و خصائص کی آمیزش نہ کریں، کیونکہ اس کے بغیر جمہوریت نہ صحیح طریقے پر کام نہیں کر سکتی نہ وہ نتائج دکھا سکتی ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ اس غرض کے لیے ہمیں جمہوریت کے ساتھ ساتھ پانچ مزید اصولوں پر بھی اتفاق کرنا ہوگا:۔

اوّل، تقسیمِ اختیارات کا اصول، یعنی ریاست کے تینوں شعبوں (انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ) کے دائرۂ اختیار کا واضح طور پر الگ ہونا۔

دوم، شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی ضمانت، اور عدلیہ کا ان کے تحفظ پر قادر ہونا۔

سوم، انتخابات کی آزادی اور اس کی حفاظت کے لیے ایسی قانونی و انتظامی تدابیر جن سے یہ اطمینان ہو سکے کہ انتخابات کے نتائج فی الحقیقت رائے عام کے مطابق نکل سکیں گے۔

چہارم، قانون کی حکمرانی، یعنی یہ امر کہ راعی و رعایا کے لیے ایک ہی قانون ہو اور سب اس کے پابند ہوں اور عدالتوں کو یہ حق ہو کہ سب پر بے لاگ طریقے سے وہ اس کو نافذ کر سکیں۔

پنجم، ملازمینِ حکومت کا، خواہ وہ سول سروس سے تعلق رکھتے ہوں یا فوج سے، سیاست میں دخیل نہ ہونا اور ہر اُس ہیئتِ حاکمہ کی اطاعت قبول کرنا جسے باشندوں کی اکثریت آئینی طریقے پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔

یہ پانچوں اصول ایک جمہوری نظام کے لیے لوازم ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے یا ساقط نہ سہی ناقص ہی کر دیا جائے تو جمہوریت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور پھر وہی

خرابیاں ظاہر ہوتی رہتی ہیں جو کسی نہ کسی نوع کی بے نقاب یا نقاب پوش آمریت سے رونما ہُوا کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ملک کے انتظامی فرمانرواؤں کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ وہ کسی وقت جمہور کے نمائندوں کو رخصت کر کے خود ہی حکومت بھی کرنے لگیں اور خود ہی اپنی مرضی کے قوانین بھی بنالیں تو اس میں اور کھلی کھلی بادشاہی و آمریت میں آخر کیا فرق رہ جاتا ہے اور اس طرح جمہوریت کے نام سے فریب کاری کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ یا اگر انتظامی فرمانرواؤں کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ وہ عدالتوں کے ضمیر اور ان کی قدرتِ انصاف پر اثر انداز ہو سکیں تو اس حالت میں اور مطلق العنان جباری میں آخر کیا وجہِ امتیاز ہے؟ ایک جابرانہ نظام میں بھی تو یہی قباحت ہوتی ہے کہ وہاں طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کا حق دلوانا عدالت کے بس میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر ایک جمہوری نظام میں حکمرانوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں لوگوں کی آزادئ ذات، آزادئ تحریر و تقریر، آزادئ اجتماع اور آزادئ نقل و حرکت سلب کر لیں، بغیر اس کے کہ اُن کا جُرم کسی عدالت میں ثابت کیا گیا ہو اور بغیر اس کے کہ کوئی عدالت ان کے معاملے میں یہ تحقیق کرنے کی مجاز ہو کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں، تو ایسے نظام کا آغاز خواہ کیسے ہی جمہوری طریقے پر ہو، اس کا انجام لازماً جمہوریت کی موت پر ہو گا، کیونکہ جمہوریت کبھی ایسے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتی جہاں حکومت پر تنقید کرنا دشوار، اور حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا دشوار تر ہو جائے۔ ایسی جگہ تو جو ایک دفعہ برسرِ اقتدار آجائے گا وہ پھر زبردستی اقتدار پر قابض رہے گا اور اس کا نام بہرحال جمہوریت نہیں ہے۔

(۴) انتخابات آزاد اور آئین و قانون سب کے لیے یکساں ہوں

ایسا ہی معاملہ انتخابات کی آزادی کا بھی ہے۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے جس کو چاہیں حکمرانی کے لیے منتخب کریں اور جب چاہیں اپنی آزاد مرضی سے ان کو تبدیل کر دیں۔ یہ چیز کیسے وجود میں آسکتی ہے اور کس طرح باقی رہ سکتی ہے اگر دباؤ اور لالچ

اور فریب اور حیلوں سے انتخابات کے نتائج اصلی رائے عام کے بالکل برعکس برآمد کیے جا سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں تو لوگوں کو رائے اور انتخاب کا حق دینا اور نہ دینا دونوں برابر ہیں۔

اسی کے قریب اہمیت اس چیز کی بھی ہے کہ ملک میں آئین و قانون اور ضابطہ سب کے لیے یکساں ہو، سب پر غالب ہو اور کوئی اس کی خلاف ورزی کرنے کا مجاز نہ ہو۔ یہ ان بنیادی خصوصیات میں سے ہے جو ایک جمہوری نظام کو ایک شخصی استبداد اور ایک مطلق العنان آمریت سے ممیز کرتی ہیں جہاں راعی کے لیے قانون کچھ اور ہو اور رعایا کے لیے کچھ اور، یا جہاں قانون کی ساری پابندیاں صرف کمزوروں کے لیے ہوں اور طاقت والے ہر وقت آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر اپنی من مانی کر سکتے ہوں اور جہاں عدل و انصاف کی طاقت زورآوروں کے مقابلے میں قانون کو نافذ کرنے سے عاجز ہو، وہاں جمہوریت کبھی قائم نہیں ہو سکتی اور قائم ہو جائے تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ جمہوریت تو سب لوگوں کی برابری کا نام ہے اور برابری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ضابطہ سب کے لیے ایک ہو اور سب پر یکساں نافذ ہو۔

جمہوری نظام ـــــ کامیابی کی شرائط

جمہوریت کی زندگی اور کامیابی کے لیے یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ حکومت کے کارپرداز اور محافظ سچے دل سے جمہوریت کے اصول کو تسلیم کریں، یعنی وہ اس بات کو مان لیں کہ ملک باشندوں کا ہے اور باشندوں کو یہ حق ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو چاہیں اپنے ملک کا کارفرما بنائیں اور مملکت کے کارپردازوں کا (جو حقیقت میں باشندوں ہی کے ملازم ہیں) یہ فرض ہے کہ جن لوگوں کو بھی باشندوں نے کارفرما بنایا ہو ان کے تحت امر رہ کر کام کریں۔ یہ بات اگر ایمانداری کے ساتھ قبول نہ کی جائے اور ملازمین جتھہ بندی کر کے خود یہ طے کرنے لگیں کہ کون کارفرما ہو اور کون نہ ہو، یا کارفرمائی کی باگیں خود اپنے ہاتھ میں لے لینے پر تل جائیں تو صرف یہی نہیں کہ جمہوریت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی، بلکہ درحقیقت اخلاقی حیثیت سے یہ ایک بہت بڑی خیانت اور نتائج کے اعتبار سے پورے ملک کے لیے ایک نہایت خطرناک چیز ہے۔ ایک

شخص کے ملازم اگر جتھہ بندی کر کے خود اسی شخص کو مغلوب کر لیں اور اس کے گھر بار کے مالک بن بیٹھیں تو اس کا نام غداری و خیانت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ پھر جہاں پبلک کے ملازم پبلک کے ساتھ یہ معاملہ کریں وہاں اس حرکت کو اور کیا نام دیا جائے گا؟ رہے اس کے نتائج تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ جہاں ایک مرتبہ ملازمین کو یہ چسکا لگ گیا وہاں ایک جتھہ نہیں، بہت سے حوصلہ مند جتھے وجود میں آئیں گے، ایک دوسرے کے مقابلے میں اقتدار کے لیے کشمکش شروع کریں گے، نیچے سے اُوپر تک سب سازشوں میں لگ جائیں گے اور یہ ساری اکھیڑ پچھاڑ جمہوری انتخابات کے کھلے میدان میں نہیں بلکہ پسِ پردہ دفتروں اور درباروں میں ہو گی۔ اس صورتِ حال میں نظم و نسق کا تباہ ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہمارے ملک کو بہت سے مسائل درپیش ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ لوگوں کی اخلاقی و دینی حالت درست کرنی ہے۔ معاشی بدحالی کا علاج کرنا ہے۔ عام جہالت کو دُور کرنا ہے۔ نظامِ تعلیم کی اصلاح کرنی ہے اور ایسے ہی بہت سے مسائل ہیں، لیکن ان سب سے مقدم یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر اتّفاق کر لیں اور یہ اتّفاق صحیح بنیادوں پر ہو، کیونکہ جب تک یہ نہ ہو گا، ہم اپنے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے نہ تو کوئی لائحہ عمل بنا سکیں گے اور نہ یہی ممکن ہو گا کہ کسی لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لیے ہماری قومی زندگی کے تمام عناصر اور وسائل مجتمع ہو کر کام کر سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس بحران کی دلدل میں ہم مبتلا ہیں اس میں روز بروز گہرے دھنستے چلے جائیں گے۔

ترجمان القرآن، جولائی۔ اگست ۱۹۵۵ء

سُنّت و بدعت کی کشمکش

باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں تقریر

(۲۳ جولائی ۱۹۵۰ء)

حاضرین وحاضرات! آپ سب لوگ اس بات کو جانتے ہیں اور ہر مسلمان کا یہ زندہ ایقان ہے۔ کہ ہمارے لئے حقیقی عہد سعادت رسول اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ کا عہد ہے۔ اس عہد کی خصوصیات اور اس کی برکات کو تفصیل سے ساتھ بیان کرنے کا تو یہ موقع نہیں، کیونکہ جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے اس کا اصل موضوع یہ نہیں ہے لیکن چونکہ ہماری کوششوں کا ہدف اور اصل مقصود وہی عہد ہے۔ اس لئے سب سے پہلے میں مختصر طور پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی خصوصیات اور برکات کیا تھیں۔

عہد سعادت کی خصوصیات

(۱) وحدتِ فکر (۲) وحدتِ نصب العین (۳) وحدتِ جماعت

اس کی اوّلین خصوصیت یہ تھی کہ اس عہد میں ہمارے اندر پوری پوری وحدتِ فکر موجود تھی۔ اللہ تعالےٰ کی توحید، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، قرآن مجید کو

اپنی زندگی کا قانون تسلیم کرنا، آخرت کی جواب دہی و مسئولیت کا یقین ——— یہ وہ چیزیں تھیں جن پر تمام لوگ جو اس عہد کی مسلم سوسائٹی میں شامل تھے ۔ پوری طرح متحد تھے ۔ اگر کچھ فرق تھا تو اس لحاظ سے کہ ایک دیہاتی کا فہم کچھ اور تھا اور صاحب فکر کا فہم اور تھا، فہم کے مدارج میں ضرور فرق تھا لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ ہے یا نہیں ۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اصل ہدایت ہے یا نہیں، ایسا نہیں تھا کہ کوئی ان باتوں کو مانتا ہو اور کوئی ان میں شک رکھتا ہو ۔

اسی طرح دنیوی زندگی کے بارے میں ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ ایک عارضی زندگی ہے ۔ جس کے بارے میں ایک دن جواب دہی کرنی ہوگی ۔ اور اس زندگی کے نتائج آخرت میں ملیں گے اور وہی اصلی اور حقیقی نتائج ہیں ۔

وحدتِ نصب العین

یہ وحدتِ فکر پوری مسلم سوسائٹی میں قائم تھی ۔ پھر اس دورِ سعادت میں وحدت مقصد بھی تھی ۔ پوری جماعت اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کا مقصود اللہ کا کلمہ بلند کرنا معروف کو پھیلانا اور منکر کو مٹانا ہے ۔ ایک ایک فرد جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اس کی زندگی کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے ۔ اس بارے میں بھی کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں تھا ۔

وحدت جماعت،

پھر اُن لوگوں کے اندر وحدت جماعت بھی تھی ۔ پوری جماعت ایک صالح اقتدار کی مطیع فرمان اور ایک مرکز سے وابستہ تھی ۔ کسی قسم کا انتشار اور تفرقہ نہ تھا اور جماعت میں کوئی ابتری نہ تھی ۔

اُس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بحیثیت مجموعی اخلاقِ عامہ کا معیار بلند تھا ۔ اور احترام کی بنا اخلاق پر تھی ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جرم اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے سرے سے تھے ہی نہیں ۔ اور اخلاقی حیثیت سے سب ایک ہی بلند ترین معیار پر قائم تھے

نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوادِ اعظم کا اخلاق بلند تھا۔ گرے ہوئے اخلاق کے نمونے بہت ہی قلیل تعداد میں پائے جاتے تھے۔ نیز چونکہ اس دور میں قیادت کی باگیں صالح ہاتھوں میں تھیں۔ اس لئے اخلاق کے معاملے میں عوام کی نگاہیں ان پر جمتی تھیں اور یہی ان میں سے پاکیزہ ترین لوگ تھے۔ ملک میں جو بگڑے ہوئے لوگ پائے جاتے تھے، وہ گرے اور دبے ہوئے تھے وہ آگے چلنے والے نہیں۔ بلکہ پیچھے رہ جانے والے ہوتے تھے۔ آگے صرف وہ لوگ آتے تھے جو اخلاقی لحاظ سے بہترین اور پاکیزہ اخلاق رکھنے والے تھے۔

عہد سعادت کی برکات:

۳۔ امن و اطمینان

اس عہد سعادت کی برکات میں سے اولین چیز امن و اطمینان تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ ایسی سوسائٹی جس میں صداقت، دیانت اور راست بازی اور انصاف کے اوصاف موجود ہوں۔ اس میں ہر آدمی دوسرے شخص سے معاملہ کرے گا۔ تو پورے اطمینان سے کرے گا۔ کہ وہ ایک ایماندار شخص سے معاملہ کر رہا ہے۔ جو امانت میں خیانت نہیں کریگا جھوٹا قول و قرار نہیں کرے گا، اور بے انصافی سے کام نہیں لے گا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی سوسائٹی میں کتنا امن اور اطمینان ہو گا۔

نیکی میں تعاون اور برائی کو دبانا

پھر ایک عظیم الشان برکت یہ تھی۔ کہ اس دور میں سوسائٹی کا نظام تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے اصول پر قائم تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کا ہر وہ کام جو کیا جا رہا ہو لازم ہے کہ اسے پروان چڑھانے میں سب کے سب شریک ہوں لیکن اگر کوئی بدی سر اٹھائے تو کوئی اس کا ساتھ دینے کے لئے نہ اٹھے۔ بلکہ سب کے سب مل کر اس کے روکنے اور دبانے کے لئے زور لگائیں

یہی وہ چیز ہے جس نے ایک ایسا صالح تمدن پیدا کیا جس میں بھلائیاں پروان چڑھتی تھیں اور برائیاں مٹتی تھیں۔

یہ تو تھیں اندرونی برکات لیکن جب سوسائٹی اعلائے کلمۃ اللہ کے ابتدائی مراحل کو طے کر کے ملک کی اندرونی اصلاح سے فارغ ہوئی تو اس کے بعد یہ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ چند ہی سال کی مدت میں اس کے کارکن اور کارفرما جہاں جہاں پہنچے انہوں نے برائیوں کو مٹایا بھلائیوں کو پروان چڑھایا۔ انصاف کی حکومت قائم کی اور اسی صالح تمدن کو ہر جگہ نشوونما دی جس کی برکات سے وہ خود بہرہ یاب ہو چکے تھے۔

سنت و بدعت کی کشمکش کا آغاز

عہد سعادت کے بعد امت کے دو گروہ

جب یہ عہد سعادت گزر گیا تو اس کے بعد مسلمانوں کی اُمت دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک حصہ اہل بدعت کا اور دوسرا حصہ اہل سنت کا۔

میں بدعت کا لفظ ان محدود معنوں میں نہیں بول رہا ہوں جن میں عام طور پر یہ بولا جاتا ہے اس اصطلاح کے اصل معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نظام اور اسلامی زندگی میں اسلام سے باہر کی کوئی ایسی چیز لے آنا جو اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں ــــ مدرسے کا ایک نظام اور اس کی ایک خاص فضا ہوتی ہے جس کا اساتذہ کو خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کرائے اور وہاں اس کے بیٹھنے کے لئے صوفہ لا کے رکھ دے اور ایک خادم کھڑا کر دے جو اسے پنکھا جھلتا رہے۔ تو مدرسے کے اساتذہ صاف صاف کہہ دیں گے کہ اس نظام میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں، یہاں کسی اجنبی چیز کو لا داخل کرنے کی حرکت نہیں کی جا سکتی۔ بخلاف اس کے اگر ایک لنگڑا بچہ مدرسے میں داخل ہو تو باوجودیکہ

مدرسے میں لاٹھی اور لکڑی لے کے آنا قاعدے کے خلاف ہے لیکن لنگڑے بچے کو اجازت دی جائے گی کہ وہ لکڑی کا سہارا لے سکے۔ کیونکہ یہ اس کی ایک حقیقی ضرورت ہے لیکن صوفے اور پنکھا جھلنے والے خادم کے لئے مدرسے کے نظم میں کوئی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی ـــــ اس مثال سے آپ بدعت کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ اسلام میں کسی ایسی چیز کو لا کے داخل کر دینا جو اس کے اصولوں اور اس کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی ہو، بدعت کی تعریف میں آتی ہے۔ جب کہ سنت کا مطلب اس طریقے کے مطابق کام کرنا ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نظام کو قائم کیا تھا۔ اسلام میں جن معاملات کے لئے صاف صاف حکم نہ ملتا ہو۔ ان کے بارے میں قرآن و سنت کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اور ان کے تقاضوں کو سمجھ کر کوئی حکم نکالنا بدعت نہیں، اجتہاد ہے۔ اور یہ عین سنت کے مطابق ہے۔ یہی سنت کا طریقہ تھا جس پر دورِ سعادت کے لوگ قائم تھے۔

بعد میں جب بدعت کا آغاز ہوا تو امت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔

(۱) ایک طرف اہل بدعت تھے۔ جو بیرونی فلسفوں، بیرونی مذہبوں اور بیرونی تہذیبوں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے باہر سے کچھ چیزیں لا کر اسلام میں کھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

(۲) دوسری طرف اہل سنت تھے جو صدقِ دل سے اس بات کو مانتے تھے کہ ہمارے اصول، ہمارا نظام اور ہمارا تمدن وہ رہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے وقت میں تھا۔ اس گروہ کی پوری کوشش یہ تھی کہ زندگی ٹھیک انہی اصولوں پر قائم رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تھے۔

اصل سبب انتشار، بدعت

ان دونوں گروہوں میں کشمکش بنی امیہ کے دور میں شروع ہو گئی اور آج تک

چلی آرہی ہے۔ بنو امیہ نے ملوکیت اور قیصریت کی بدعت کو لاکے اسلام میں داخل کر دیا۔ اہل سنت نے اسے روکنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی، کوڑے کھائے۔ بال بچے کٹوا دیئے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں تاکہ بدعت کا یہ سیلاب پھیلنے نہ پائے۔ پھر آگے چل کر بنو عباس کے زمانے میں بیرونی فلسفے، بیرونی مذاہب اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات داخل ہونے شروع ہوئے۔ اہل بدعت وہ سارے کام کرنا چاہتے تھے جن سے اسلامی زندگی مسخ ہو۔ دوسری طرف اہل سنت برابر کوشش کرتے رہے کہ بدعتوں کے دروازے بند ہوں اور صحیح اسلام اپنی اصلی صورت میں قائم رہ سکے۔

اسلامی سوسائٹی میں بدعت کا ظہور اصل سبب انتشار ہے لفظ انتشار اجتماع کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں اجتماع کی بنیاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی، قرآن کے اتباع، اللہ تعالے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے حجت ہونے پر ہے۔ اس لئے ہر وہ چیز جو اس بنیاد سے ہٹانے والی ہو، سبب انتشار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کے فضل سے مسلمان کبھی بدعت پر جمع نہیں ہوئے گمراہیاں ضرور پھیلیں۔ لیکن یہ بات کبھی نہیں ہوئی۔ کہ ساری امت بدعت پر جمع ہو جائے۔ امت کی اکثریت اور اس کا سوادِ اعظم ہمیشہ سنّت کو پسند کرتا رہا۔ اور اسی کا احترام کرتا رہا۔ اپنے سارے بگاڑ کے باوجود مسلمانوں نے بدعت کو کبھی پسند نہیں کیا۔ آج بھی دیکھ لیجئے کہ اگرچہ تاریخ میں بڑے بڑے بادشاہ، بڑے بڑے سپہ سالار اور جرنیل اور بڑے امیر اور دولت مند گزر چکے ہیں، لیکن کیا ان میں سے کسی کی عقیدت بھی مسلمان عوام میں اس درجے کی ہے جیسی امام ابو حنیفہؒ امام احمد بن حنبلؒ اور شاہ ولی اللہ جیسے آئمہ کی ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان چاہے کتنے ہی بگڑ گئے ہوں ہر حال وہ بدعت کو ناپسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بڑی دردناک ہے کہ اگرچہ ہماری اکثریت ہمیشہ بدعت پیدا کرنے والوں پر ناک بھوں چڑھاتی ہی رہی ہے۔ ہمارے اندر سیاسی اور معاشی اقتدار کی باگیں صدیوں سے اہل بدعت ہی کے ہاتھوں چلی آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظام زندگی درست ہو کر عہد سعادت کی طرف نہ پلٹ سکا

فرنگی غلبے کا دور اور اہل بدعت کی اقسام

اس کے بعد وہ دور آیا کہ اہل مغرب ساری دنیا پر چھا گئے کہیں تو مسلمان ملکوں پر ان کی حکومتیں براہ راست قائم ہو گئیں۔ اور کہیں مغرب کے عالمگیر غلبے کے اثر سے وہ قومیں جو آزاد سمجھی جاتی تھیں علمی و ذہنی اور معاشی حیثیت سے غلام بن گئیں۔

۱۔ منحرفین

اس دور میں اہل بدعت کی دو قسمیں سارے ملکوں میں پھیل گئیں۔ ایک قسم ان اہل بدعت کی تھی۔ یہ اسلام سے کھلم کھلا منحرف ہو گئے۔ ان کو تعلیم اور اقتدار نے یہ سبق دیا کہ تم اسلام پر چل کر ترقی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انہیں یقین ہی نہ رہا کہ فی الواقع اسلام زندگی کا نظام بننے کے قابل ہے بھی۔

عملی حیثیت سے اہل بدعت کی اس قسم نے غیر اسلامی طور طریقوں اور غیر اسلامی اقدار کو پوری طرح قبول کر لیا۔ اور حلال و حرام کی تمیز کو خارج از بحث قرار دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے گھروں کو اور اپنی اولاد کو سراسر غیر اسلامی تہذیب میں رنگ دیا۔ اور پھر پوری کوشش شروع کی کہ ان کی ساری قوم اسی رنگ میں رنگ جائے

اہل بدعت کی یہ قسم اس مرحلے پر تمام مسلمان ممالک میں پیدا ہوئی۔ اور کوئی ملک اس سے بچ نہیں سکا۔

۲۔ محرفین

دوسری قسم اہل بدعت کی وہ ہے جن کے نزدیک ساری اقدار، اصل معیار

خیر و شر، تہذیب کے اصول اور علوم و افکار کی حقیقتیں قابل قبول وہی ہیں۔ جو مغرب سے آئی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے انہیں اسلام سے جو پیدائشی عقیدت ہے۔ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ جدھر جائیں۔ اسلام بھی ان کے پیچھے پیچھے ادھر گھومتا جائے۔ اس مقصد کے لئے یہ نیا اسلام تصنیف کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جو ان کی پسندیدہ اقدار کے مطابق ہو۔ اس نئے اسلام کی اصل بنیادیں قرآن و حدیث نہیں ہیں۔ بلکہ اصل بنیادیں وہ مغربی افکار ہیں جو فضا میں چھائے ہوئے ہیں۔ ان حضرات میں سے بعض نے حدیث کو تو نظام دین میں سے بالکل خارج کر دیا ہے اور اگر بعض نے حدیث اور فقہ کو لیا بھی ہے تو اس طرح کہ وہ چیزیں جو ان کا ساتھ دے سکیں۔ ان کو اختیار کر لیا جائے اور بقیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

اہل بدعت کی یہ قسم بھی تمام مسلمان ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اور خود ہمارے ملک میں بھی موجود ہے لیکن اب تک کسی ملک میں بھی عام مسلمانوں کی اکثریت نے ان اہل بدعت کو پسند نہیں کیا۔ اور نہ کسی جگہ کی اکثریت ان کے حق میں ہموار ہو سکی ہے۔ ترکی، ایران، مصر وغیرہ میں سے کوئی جگہ بھی ایسی نہیں۔ جہاں عوام نے اہل بدعت کی رہنمائی کو حقیقی معنوں میں تسلیم کیا ہو اور اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہو یہ گروہ ہر جگہ اقلیت میں ہے۔

اور اس کے خلاف ہر جگہ کش مکش جاری ہے کہیں نمایاں طور پر اور کہیں دبی دبی۔

یہ البتہ بدقسمتی کی بات ہے کہ کوئی ایک مسلمان ملک بھی ایسا نہیں ہے جس کے آزاد سیاسی نظام میں اقتدار کی باگیں اہل سنت کے ہاتھ میں ہوں۔ ہر جگہ اقتدار پر قبضہ اہل بدعت ہی کا ہے۔ اور چونکہ یہ لوگ اپنی سوسائٹی کے۔ اپنے گھر سے ہیں اس لئے پوری بے باکی کے ساتھ تعلیم کی طاقت کو، پولیس اور فوج کی طاقت کو

اور معاشی طاقت کو اس مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ کہ سوسائٹی کے مزاج کو بہ حیثیت مجموعی (convert) کر دیا جائے۔ یہ صورت احوال سارے ملکوں میں ہے اور اس کی وجہ سے ایک کشمکش سارے ملکوں میں ہو رہی ہے۔

اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ خود ہمارے ملک میں تقسیم سے پہلے کی صورت حالات کیا تھی۔

تقسیم سے پہلے کی صورتِ حالات

تقسیم سے پہلے یہاں بعض ایسے اسباب کارفرما تھے کہ اس برصغیر میں سارے ملکوں سے اسلام کا اثر زیادہ گہرا تھا۔ گزشتہ تین سو برس میں اسلام کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرنے کی جتنی معقول تحریکیں اٹھیں ان میں سے سب سے زیادہ اسی ملک میں اٹھیں حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک اسی برصغیر میں اٹھی۔ پھر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی طرف سے اسلام کو زندہ کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد بھی متعدد کوششیں نہایت معقول اور زبردست طریق سے کی گئیں کسی دوسرے ملک میں اس قدر معقول کوششیں نہیں ہوئیں۔

یہ ایک بڑا سبب تھا کہ اسلام سے عقیدت، اسلام کے فہم اور اس کے بارے میں زندگی کے لئے رہنمائی کے قابل ہونے کا یقین جتنا یہاں تھا اور کہیں نہیں تھا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اس ملک پر باہر کی ایک قوم حکمران تھی جس کے مٹھی بھر آدمی حکومت کر رہے تھے۔ وہ اس بات کی جرأت بھی نہ رکھتے تھے اور ان کے پاس ایسے ذرائع بھی نہ تھے کہ ہماری اندرونی زندگی میں پوری طرح گھس کر اسے اندر سے مسخ کر سکیں انہوں نے باہر سے ہر طریقے اختیار کر کے تعلیم، معاشرت اور تمدن پر اثر ڈالا کہ ان کی تہذیب سے مطابقت رکھنے والی جتنی بدعات ہیں ان کو فروغ حاصل ہو اور بدعات کے علمبرداروں کو چھانٹ چھانٹ کر اوپر لایا جائے۔ یہ ساری کوششیں بیرونی قوم نے کیں۔

لیکن سوسائٹی میں گھس کر اندر سے تبدیل کرنے کا موقع اس کو نہ مل سکا۔ تاہم یہ امرِ واقعہ ہے۔ کہ انگریز کی سرپرستی اور پشتیبانی کے تحت اس ملک میں زندگی کے ہر شعبے کی قیادت و رہنمائی اہل بدعت ہی کو حاصل رہی، وہی پیش پیش رہے۔ معاملات کی باگیں انہوں نے ہی سنبھالیں اور وہی ذریعہ بنے حاکم و محکوم کے درمیان رابطہ کا۔ حاکم نے آسمانِ فرماں روائی سے جو نعمتیں بھی نازل کیں انہی اہل بدعت کی وساطت سے کیں۔ اور محکوم نے جتنی دعائیں خداوندانِ مجازی سے کیں، انہی کی وساطت سے کیں۔ اس طرح سیاست و معیشت میں قیادت انہیں کے ہاتھ میں رہی۔

اہل بدعت کا تیسرا گروہ، منافقین

مگر قوم چونکہ اسلام کی معتقد تھی۔ اس لئے یہاں اہل بدعت کا ایک تیسرا گروہ بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا۔ یہ گروہ منافقین کا گروہ ہے۔

یہ لوگ تھے تو "منحرفین" اور "محرفین" کے ہم خیال لیکن انہوں نے چولا بدلا اور دعویٰ کیا کہ تجدید و احیائے اسلام کا کام ہمارے ہاتھوں سے ہو گا۔ چنانچہ اس گروہ کو سب سے زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ اور یہی گروہ تقسیم سے پہلے کی صورت حالات میں بتدریج قوم کی سیاسی امامت پر قابض ہوتا چلا گیا۔

مسلمان قوم نے جب یہ محسوس کیا کہ ہندو قوم کے اقتدار کے نیچے ان کی کوئی زندگی نہیں ہے تو ان میں پاکستان کا مطالبہ پیدا ہوا اور اس مطالبے کے لئے سیاسی تحریک نمودار ہوئی۔ اس وقت جس چیز نے تمام مسلمانوں کو متحرک کیا وہ صرف یہ امید تھی کہ پاکستان اگر قائم ہو گا تو اس میں اصل اسلام کو پھر تازہ اور زندہ کیا جائے گا۔ پورا نظامِ زندگی اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے گا۔ سوسائٹی کا مقصدِ زندگی وہی ہو گا جو مسلمان کا مقصدِ زندگی ہے۔ اس امید پر قوم مِن حیث القوم مطالبہ پاکستان کے لئے میدان میں نکل آئی۔ اور اس کے لئے جو جدوجہد کی گئی۔ اس میں مخلص اہل سنت اور

دین سے محبت رکھنے والے عوام، دین سے منحرف اور منافقین سب متفق ہو گئے۔

یہاں ایک افسوسناک صورت حالات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس جدوجہد میں جو اہل خلوص تھے انہوں نے تو صرف کام کرنے سے غرض رکھی اور جو منحرف اور منافق تھے انہوں نے نام سے غرض رکھی اور جاہ کے حصول پر توجہ کی۔ چنانچہ اس تحریک کے دوران میں اہل خلوص عام طور پر پیچھے رہ گئے۔ کیونکہ وہ جاہ طلب اور اور اقتدار کے لئے جدوجہد کرنے والے نہ تھے لیکن منافقین نے پوری کوشش کی۔ کہ پاکستان بنے تو پورا نظم ونسق ہمارے ہاتھوں میں آ جائے۔ انہی حالات میں ۴۷ء کا انقلاب واقع ہوا۔

یہ انقلاب آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ جس گروہ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس انقلاب کے دوران میں اس کا رویہ کیا تھا جتنی لوٹ کھسوٹ ہوئی ہے انہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اموال متروکہ پر ناجائز قبضے حاصل کرنے اور اپنے عزیزوں دوستوں کو دلوانے کے لئے انہی نے تگ و دو کی ہے معاشی ذرائع پر بھی یہی قابض ہوئے۔ اقتدار کی کنجیوں پر انہی کو قبضہ حاصل ہوا۔ قوم لٹ رہی تھی۔ اور یہاں گلچھرے اُڑ رہے تھے۔ مخلص کارکن جن کی قربانیوں سے ہی دراصل یہ انقلاب ہوا تھا۔ دودھ میں سے مکھی کی طرح الگ نکال پھینکے گئے اور ان کو وہ کچھ بھی نہ ملا جس کے وہ واقعی مستحق اور حاجت مند تھے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد

اس کے بعد جب انقلاب کا دور گزر گیا۔ اس گروہ نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا۔ وہ تمام مواعید جو تحریک پاکستان کے دوران میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے کئے گئے تھے۔ انہیں کھلم کھلا بھلا دیا گیا۔ اور صاف صاف کہا گیا کہ کون کہتا ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا؟ پاکستان تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں ہو گا۔ بلکہ

یہ ایک غیر مذہبی (Secular) اسٹیٹ ہوگا۔ لوگوں کی طرف سے جب ان باتوں کو سن کر بدلنے وعدے یاد دلائے جانے لگے تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ کونسا اسلام چاہتے ہو؟ شیعہ کا؟ سُنی کا؟ اہل حدیث کا؟ اور پھر فرمایا گیا کہ (First Deserve Than Desire) یعنی پہلے اہل بنو اور پھر خواہش کرو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمام سرکاری ذرائع سے مہم یہ شروع کر دی گئی۔ کہ غیر اسلامی تہذیب کو فروغ دیا جائے۔ اس نوع کی کوششوں کا مدعا ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسلام کے متعلق (Confused) ہو جائیں۔

اسلامی نظام کا مطالبہ

۱۹۴۸ء کے آغاز میں جماعت اسلامی نے عوام کو ایک مطالبہ مرتب کر کے دیا۔ جس کے ذریعے ان حضرات کے سامنے متعین شکل (Concrete Form) میں یہ بات رکھ دی گئی کہ اس چیز کا نام ہے اسلامی نظام، اور یہ چیز ہمیں درکار ہے۔ یہ مطالبہ ایسا تھا کہ جس کے بارے میں شیعہ، سنی، وہابی، حنفی کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے یہ نہ کہا ہو کہ ہاں اسلامی حکومت اس کا نام ہے، اس مطالبہ میں متعین طور پر بتا دیا گیا تھا کہ اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے۔

۱- جس میں حاکمیت اللہ کی تسلیم کی جائے۔

۲- جس میں وہ تمام قوانین منسوخ کر دیئے جائیں جو اسلام کے خلاف پڑتے ہوں۔

۳- جس میں بنیادی قانون شریعت اسلامی کو قرار دیا جائے۔

۴- جس میں حکومت اپنے تمام معاملات میں حدود اللہ کی پابند ہو۔

یہ مطالبہ متعین چیز تھی۔ اس میں نظام اسلامی کی آئینی تعریف کر دی گئی تھی۔ پھر اس کے اوپر جو اعتراضات اٹھائے گئے ان کا بھی بروقت جواب دیا گیا۔

ایک اعتراض یہ اٹھایا گیا کہ مختلف فرقوں میں سے آخر کس کے مسلک کے مطابق نظام اسلامی بنے گا۔

اس کے جواب میں واضح کر دیا گیا کہ دنیا بھر کے مسلمہ جمہوری اصول کے مطابق نظام باشندگانِ ملک کی اکثریت کی رائے سے بنے گا اور چلے گا۔ اور جو اقلیتی گروہ اکثریت سے اتفاق نہ کرنا چاہیں گے ان کے پورے پورے حقوق کو محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔

پھر کہا گیا کہ غیر مسلموں کی بڑی تعداد پاکستان میں بستی ہے، وہ کیسے گوارا کرے گی۔ کہ یہاں کا نظام اسلام کے اصولوں پر چلے۔

اس پر جواب دیا گیا کہ اکثریت جن اصولوں پر ایمان رکھتی ہے۔ نظام تو وہ بہرحال انہی کے مطابق بنائے گی۔ رہے غیر مسلموں کے حقوق سو ان کے تحفظ کا سختی سے اہتمام کیا جائے گا۔

اس طرح جو اعتراضات کئے گئے ان کے بروقت جوابات سے برسرِ اقتدار طبقہ کا ناطقہ تنگ ہو گیا۔ اور ممکن نہ رہا کہ عوام کو مسلسل (confuse) کیا جا سکے۔

جب حالات یہاں تک پہنچے۔ تو ان حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی کہ یہ ساری شرارت ایک جماعت کی ہے اور اس جماعت میں بھی ایک شریر ایسا ہے۔ جو ان کی حرکتوں کا اصل ذمہ دار ہے۔ چنانچہ جھوٹ اور مکر کی تمام توپوں کا رُخ اس ایک جماعت اور اس ایک شخص کی طرف پھیر دیا گیا۔ آپ شاہد ہیں کہ ان حضرات نے کیا کیا طوفان اٹھائے۔ پھر اس ایک شخص کو میدان سے ہٹا دیا گیا لیکن بعد میں یہ غلط فہمی رفع ہو گئی کہ "ساری شرارت" ایک شخص اور اس کے چند ہمنواؤں کی ہے۔ بلکہ ان پر یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت اس مطالبہ کی پشت پر ہے کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہونا چاہیئے۔ تمام اہل سنت یعنی وہ لوگ جو قرآن اور سنت رسول ؐ کو حجت مانتے ہیں۔ مطالبے کے پیچھے ہیں اور یہ ان کے دلوں کی آواز ہے۔ چنانچہ اس آواز کا دباؤ برابر بڑھتا گیا جس کے نتیجے میں قرارداد مقاصد پاس کرنی پڑی۔

قراردادِ مقاصد کی آئینی حیثیت ۔

۱۔ ایک آئینی

۲۔ دوسرا عملی

لوگ ان دونوں حیثیتوں کو بالعموم گڈمڈ کر دیتے ہیں ۔ یہاں یہ چیز سمجھ لینی چاہیئے کہ قراردادِ مقاصد کی دو حیثیتیں ہیں ۔ ایک آئینی ۔ دوسری عملی ۔

اس قرارداد کی آئینی حیثیت یہ ہے کہ تمام باشندگانِ پاکستان کی طرف سے ان کے مطالبے کی بنا پر دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے والے نمائندوں نے یہ قرارداد پاس کی ہے ۔ انہوں نے پوری قوم کی طرف سے کلمہ اسلام پڑھا ہے ۔ یہ اسمبلی درحقیقت قوم کی زبان ہے پس دستوری حیثیت سے قوم اگر کلمہ پڑھ سکتی تھی تو اپنی اسی زبان سے پڑھ سکتی تھی ۔ چنانچہ قوم نے جب کلمہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو اپنی زبان کو مجبور کیا کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھے ۔ دستوریہ کے کلمہ پڑھ لینے سے اب ریاست کی اصولی حیثیت متعین ہو گئی ہے ۔

اس قرارداد کے ذریعے پہلی چیز جس کا اقرار کیا گیا ہے یہ ہے کہ کائنات کا فرمانروا اللہ تعالیٰ ہے ۔ اگرچہ صاف صاف طریقے سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ پاکستان کا بادشاہ ہے لیکن پاکستان بہرحال کائنات کا جزو ہے ۔ اللہ تعالےٰ کی سلطنت کا ایک حصّہ ہے

دوسری چیز یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو اختیارات ، باشندگانِ ملک کی وساطت سے اُن کے منتخب نمائندوں کے ذریعے حدود اللہ کی پوری پابندی میں استعمال کرنے کے لئے تفویض کئے ہیں ۔ وہ ایک مقدس امانت ہیں ۔ اس اقرار میں حسب ذیل تین پہلو اہم ہیں

(۱) ریاست کے اختیارات مستقل بالذات نہیں ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے تفویض کردہ ہیں ۔ خلافت کا تصور ٹھیک یہی ہے کہ حکومت تفویض کردہ اختیارات کی حامل ہوتی ہے ۔

(۲) یہ اختیارات کسی شخص یا خاندان کو تفویض نہیں کئے بلکہ باشندگانِ ملک کی

...... وساطت سے ان لوگوں کو عطا کئے گئے ہیں۔ جو منتخب کئے جائیں۔ یہ تصور اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت اور تھیوکریسی دونوں سے ممیز کرتا ہے۔ مغربی جمہوریت میں باشندگان ملک خود حاکم ہوتے ہیں۔ تھیوکریسی میں ایک طبقہ حاکم ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں حاکم اللہ تعالےٰ ہے اور اسی نے نیابتی اختیارات پورے باشندگانِ ملک کو سونپے ہیں۔ اور باشندگانِ ملک انہیں ریاست کے حوالے کرتے ہیں۔ اسلامی جمہوریت عمومی خلافت (Popular vicegerency) ہے۔ یہ یورپ کی مذہبی حکومت[1] اور لادین حکومت دونوں سے الگ ایک تیسری چیز ہے۔

(۳) مقدس امانت کے الفاظ حکومت اور اس کے مناصب اور اختیارات کی حیثیت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں ان الفاظ کی تشریح یہ ہے کہ اختیارات کو خدا کی مقررہ کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک مسلمان "حدود اللہ" کا کوئی تصور اس کے سوا نہیں رکھتا کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے جو حدیں مقرر کر دی ہیں۔ ان کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

ان باتوں کی وجہ سے اس کے وہی معنی ہیں۔ جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہیں پس اس کلمے کو ادا کرنے کی وجہ سے ہماری ریاست اصولی حیثیت سے اسلامی ہو گئی ہے۔

قرار دادِ مقاصد کی عملی حیثیت

اب اس قرار داد کی عملی حیثیت کو لیجئے۔

درحقیقت یہ ایک ایسی بارش تھی جس سے پہلے نہ کوئی گھٹا اٹھی اور نہ جس کے

---

[1] ہماری کتاب مذہبی حکومت اور اسلامی حکومت کا فرق ملاحظہ ہو۔

بعد کوئی روئیدگی پیدا ہوئی۔ اس قرارداد کے پاس ہونے سے دو چار روز پہلے تک بھی اس بات کے کوئی آثار نہ تھے اور کوئی واقعہ ہونے والا ہے اس بارش سے پہلے ٹھنڈی ہوا تک نہیں چلی۔ بلکہ اس کے برس جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک اچانک حادثہ تھا۔ جو آیا اور گزر گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرارداد اس طرح پاس کی گئی ہے جس طرح ایک ہارا ہوا جواری اپنا آخری داؤ پھینکتا ہے جس زمانے میں یہ پاس ہوئی اس زمانے میں میں تو جیل کی کھڑکیوں میں سے جھانک سکتا تھا لیکن آپ حاضر تھے، کیا ان لوگوں میں اس واقعہ کے ایک ہفتہ قبل بلکہ ایک دن پہلے بھی کوئی ایسی تبدیلی پائی گئی جس سے آپ سمجھتے ہوں کہ ان کی اقرار میں یا ان کے نقطۂ نظر میں عملاً کچھ فرق آرہا ہے؟ ——— ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے، تو اس میں تبدیلی یکایک ایک منٹ میں نہیں آتی۔ وہ پہلے سے کچھ بدلتا ہے۔ پہلے اسلام کی طرف رغبت ہوتی ہے پھر وہ اسے سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے الغرض اس میں کوئی ایسا تمہیدی فرق ضرور رونما ہوتا ہے جس کے بعد وہ ارتقا کرتے کرتے جا کر کسی سے کہتا ہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ پھر کلمہ پڑھنے کے بعد اس میں کچھ بھی اخلاص ہوتا ہے۔ تو وہ جا کر خود معلوم کرتا ہے کہ مجھے نماز سکھاؤ، مجھے اسلام کی دوسری تعلیمات بتاؤ۔ وہ لباس کو بدلتا ہے، نام کو بدلتا ہے، اپنی دوستیوں کو بدلتا ہے۔ اور دوستیوں اور دشمنیوں کے معیار بدلتا ہے۔ یہ ساری چیزیں وہ کرتا ہے اور یہ ایک فطری حقیقت ہے۔ دنیا میں اور کسی جگہ آپ نہ دیکھیں گے کہ کوئی واقعہ ایسا اچانک ہو جائے۔ کہ نہ پہلے سے اس کے کچھ آثار موجود ہوں، نہ بعد میں اس سے کوئی نتائج نمودار ہوں لیکن یہاں حکومت کے رویے میں قرارداد مقاصد سے ایک دن پہلے تک بھی کوئی تغیر نہیں آیا۔ اور نہ اس کے بعد کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ایک آدمی اگر کوئی عمارت بنانے کا اعلان کرتا ہے۔ تو اور کچھ نہیں کرتا، تو کم از کم اینٹ چونا، لکڑی اور کنڈیاں وغیرہ ہی فراہم کرتا ہے

رائج مزدوری کی تلاش کرتا ہے لیکن یہاں اسلامی نظام کی تعمیر کا اعلان کیا جاتا ہے اور اس کے لئے کسی طرح کی کوئی تیاری نہیں کی جاتی۔ نہ اس کے پہلے نہ اس کے بعد۔

میں نے اور میرے رفقا نے جب اخبارات میں یہ خبر پڑھی تو ہم سب کو قرارداد مقاصد کے پاس ہو جانے سے بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں بڑے اچنبھے میں مبتلا ہوا کہ اخبارات کے ذریعے اس قسم کے کوئی آثار معلوم نہ ہوئے تھے کہ کسی طرح کے تمہیدی تغیرات ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے پاس ہونے کے بعد برابر انتظار رہا کہ اب تغیر شروع ہوتا ہے۔ اب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ لیکن جب کچھ نہ ہوا تو میرے دل نے گواہی دی کہ ان حضرات کے قرارداد مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی میم صاحبہ کسی مسلمان نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرانا چاہے اور وہ اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لئے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کے لیے کلمۂ اسلام پڑھ لے لیکن نہ اس کلمے سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی تغیر آئے، نہ اس کے بعد کوئی تبدیلی رونما ہو جیسی میم صاحبہ وہ پہلے تھیں ویسی ہی میم صاحبہ وہ بعد میں رہیں۔ ہمارے ہاں اسلام کا نام لینے والوں یعنی قرارداد مقاصد پاس کرنے کا حال بھی ان میم صاحبہ کا سا ہے۔

دستور سازی

اب اگر اعتراض کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ صاحب ابھی تو نیا آئین بن رہا ہے۔ اسے مکمل ہو جانے دیجئے۔ پھر دیکھئے گا کہ یہ کیا کیا کرامتیں دکھاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی کوئی تیاری تو معلوم ہو۔

اگر یہ لوگ اسلام کا نام لینے میں مخلص ہیں تو وقت ضائع کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ مکان کا نقشہ مکمل کرنے میں اگر دیر ہے تو اینٹ چونے کی فراہمی کی کچھ فکر تو شروع کر دیں لیکن آثار اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہاں ساری تیاری مغربی تہذیب کو فروغ

دینے کے لیئے کی جا رہی ہے۔ اور سرکاری خرچ پر سرکاری سرپرستی میں پوری کوشش ہو رہی ہے کہ اسلامی اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی جائیں جس طرح قرارداد مقاصد سے پہلے لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ اسی طرح اب قرارداد مقاصد کے بعد بھی عوام میں ذہنی انتشار پھیلانے کے لیئے عجیب اسلام کی عجیب تاویلیں کی جا ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ لوگ اسلام کا واضح تصور حاصل کریں۔ اور متحدہ طاقت سے اسلامی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیں۔ ان کے دماغوں میں الجھنیں پیدا ہو جائیں۔

دستور سازی کا کام جس کے جلد انجام پانے کی امیدیں دلائی جا رہی ہیں۔ وہ کن لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے؟ آپ خود جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے قرارداد مقاصد کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ سب دستوریہ کی سب کمیٹیوں میں شریک ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو اسلام کے متعلق اتنا نہیں جانتے کہ وہ ہے کس چیز کا نام جو نہیں جانتے کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے، جنہیں نہ قرآن سے تعلق ہے نہ حدیث سے، جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اسلام کا نظام امریکہ کے نظام سے ملتا جلتا ہے۔ اسلامی دستور سازی کے لیئے اس کام کے جاننے والوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لے دے کے ایک مولانا شبیر احمد عثمانی تھے لیکن ان کی وفات پر کسی ایک عالم دین کی خدمات بھی حاصل نہیں کی گئیں۔

اسلامی دستور کا علم رکھنے والے کو دستوریہ میں شامل کرنے کے بجائے ایک مجلس ادارۂ تعلیمات اسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی ہے۔ اس ادارے کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے قوم کو دھوکا دیا جائے، اور اسے بہلایا جا سکے۔ یہ مجلس دستوریہ سے علیحدہ ایک کمرے میں بیٹھتی ہے اور اس سے جو سوالات پوچھے جاتے ہیں یہ ان کے جوابات لکھ دیتی ہے۔ یہ سب کچھ در پردہ ہوتا ہے

پبلک کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ سوال کیا پوچھے گئے۔ جواب کیا دیئے گئے اور جوابات کے کن حصوں کو قبول کیا گیا اور کن کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ ان وجوہ سے اس ادارے کی آئینی اور قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک ڈھونگ ہے ہاں اگر کچھ علما خود دستوریہ کے اندر موجود ہوں تو ان کی رائے پبلک کو بھی معلوم ہو لیکن ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر کچھ لوگ سوالات کے جوابات جو چاہیں لکھتے رہیں۔ ان کی دستوری حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کس قسم کا دستور بنا ڈالیں، اور وہ کہاں تک اسلامی نظام کے مطابق ہو اور کہاں تک اس کے خلاف ہو۔ ایسی حالت میں اس دستور ساز اسمبلی پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اسلام کے جاننے والے اس میں شریک نہیں ہیں۔

عوام کو بے بس کرنے کے انتظام

اس سے بھی زیادہ تشویشناک صورت حال یہ ہے کہ حکومت مسلسل اپنے آپ کو ایسے ہتھیاروں سے مسلح کر رہی ہے کہ اگر کوئی ایسا غلط دستور پاس کر کے قوم کے سر منڈھ دے جس کو ملک کی اکثریت قبول کرنے پر تیار نہ ہو، تو قوم اس پوزیشن میں نہ ہو کہ اسے بدلوانے کی کوشش کر سکے۔ بلکہ حکومت کے ہاتھ اتنے مضبوط ہوں کہ وہ جتنے لوگوں کو چاہے، پکڑ کے جیلوں میں بند کر سکے۔ اس مقصد کے لئے سیفٹی ایکٹ اور سرحد کرائم ریگولیشن ایکٹ وغیرہ جیسے قوانین موجود ہیں۔

اور دوسری طرف اسی مدعا کے لئے ایک ایسا قانون بنایا گیا ہے۔ جس کی رو سے حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنے جس عہدہ دار ملازم کو چاہے راستے سے ہٹا سکے۔ اس کو اخباری زبان میں پروڈا ایکٹ کہا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر کسی وزیر، گورنر یا کسی سرکاری عہدہ دار کے متعلق یہ شبہ ہو کہ یہ خیانت اور بددیانتی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس پر مقدمہ چلا دیا جائے گا لیکن ہائی کورٹ معاملے کی

تحقیقات کرنے کے بعد جو فیصلہ دے گا۔ وہ فیصلہ نہیں ہوگا۔ بلکہ محض ایک رپورٹ ہوگی۔ یہ رپورٹ بھی پبلک کے سامنے نہیں لائی جائے گی۔ بلکہ چپکے سے گورنر جنرل کو بھیج دی جائے گی۔ اور گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ وہ چاہیں تو قبول کرلیں۔ چاہیں تو رد کردیں۔

اس ایکٹ کو جو شکل دی گئی ہے وہ صاف صاف شہادت دیتی ہے کہ یہ دراصل اس غرض کے لئے بنایا گیا ہے کہ جو عہدہ دار منشأ عالی کے مطابق کام نہ کریں ان کو دھر لیا جائے اور جن کی روش منشا عالی کے مطابق ہو وہ چاہے کتنی ہی خیانتیں کریں۔ ان کو نہ پکڑا جائے۔ یہ ایکٹ دراصل نظام حکومت کو خیانتوں اور بددیانتیوں سے پاک کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ صرف وزرا اور عہدے داروں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں۔ کہ کن کن بڑے لوگوں نے کیا کیا خیانتیں کی ہیں لیکن کسی کو پوچھا تک نہیں گیا۔ اور اگر کسی طرف سے رضاءِ عالی کے خلاف پتہ تک ہلا۔ تو اسے فوراً جکڑ لیا گیا۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ سروسز کو مٹھی میں لے لیا جائے اور جس طرح چاہیں ان کو مجبور کیا جاسکے۔

یہ ساری تدابیر اس لئے اختیار کی جارہی ہیں کہ ہمارے اہل بدعت ایک شدید قسم کی ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے عوام پر جو کچھ مسلط کردیں وہ اسے برداشت کریں۔ اور گاڑی جدھر چل رہی ہے اسے چلنے دیا جائے۔

اب میں آپ کو بتاؤں گا کہ ان حالات میں ہم نے اپنا پروگرام کیا بنایا ہے۔

جمہوریت کیوں ضروری ہے؟

ہم نے اس بات کو سوچ سمجھ کر بطور اصول کے اختیار کیا ہے۔ کہ صحیح نظام وہی ہے جو جمہوری طریقوں سے بنایا جائے نہ کہ "انقلابی" ذرائع سے۔ انقلابی ذرائع سے میری مراد خفیہ سازشیں، خلافِ قانون حرکات، اور مار دھاڑ کے طریقے ہیں کسی نظام کو بدلنے

سکے سلئے یہ نہایت غلط طریقے ہیں۔ اگر کوئی حکومت عوام پر زبردستی مسلط کر کے طاقت کے بل پر چلائی جائے تو ذہنوں کو اس کے مطابق ڈھلے نہ ہونے کی وجہ سے لازماً خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آپ کسی نظام کے اصول، اس کے مزاج اور اس کے منشا کو لوگوں کے ذہن میں اتار دیں اور عوام کی نظر انتخاب خود اسے پسند کرنے لگے تو اس طرح کا تغیر پائیدار اور صحیح ہوگا۔ پھر ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت جو نظام قائم ہے اس کو بدلنے کے لئے، اور ہم جو نظام چاہتے ہیں۔ اسے قائم کرنے کیلئے سیدھے اور صاف جمہوری طریقوں سے کام کریں ہم خود بھی اس اصول کے پابند ہیں اور حکمرانوں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم ایسے حالات کو ملک میں برقرار رہنے دیجئے کہ سیدھے اور صاف طریقوں سے کام کرنا ممکن رہے۔ ایسے حالات پیدا نہ کیجئے کہ برسر اقتدار لوگ عوام کی مرضی کے خلاف جیسا نظام چاہیں بنا دیں، اس میں ملک و قوم اور حکومت کسی کی بھلائی نہیں۔ جہاں ایسے حالات قائم رہنے دیئے جائیں کہ عوام کی رائے سے حکومت کے تبدیل ہو جانے کے لئے کافی ہو، وہاں بغیر کسی خون خرابے کے بغیر کسی افراط و تفریط کے اور بغیر کسی انتہا پسندی کے تغیرات پرسکون طریقے سے ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایسے انقلابی" ذرائع کو استعمال کرنے کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی جو قومی زندگی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیں۔ بلکہ اس قسم کے حالات میں تبدیلیاں ایسے فطری طریق سے آتی ہیں جیسے ایک نابالغ بچہ بلوغ کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہرحال قوم، ملک، حکومت اور اسلام سب کی خیر اسی میں ہے کہ ملک میں جمہوری انقلاب کے لئے راستہ کھلا رکھا جائے اور قوم کو تہ و بالا کر دینے والے انقلاب کی راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔

اس مقصد کے پیش نظر ہماری پہلی کوشش یہی ہے۔ کہ پاکستان بھر میں نئے انتخابات کا مطالبہ کیا جائے ہمیں موجودہ دستوریہ پر یہ اعتماد نہیں کہ وہ اسلامی دستور تیار کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی نالائقی کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔ وہ پارلیمنٹ کی حیثیت میں موجودہ حکمرانوں پر بندش (check) لگانے کے قابل بھی نہیں ہے بلکہ الٹا ان کی خواہشات کی آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔

وہ حکمرانوں سے یہ بھی پوچھنے کی جرأت نہیں رکھتی کہ ملک کا خزانہ کس طرح خرچ کیا جا رہا ہے۔ اسے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ کہ ہمارے حکمران دوسرے ملکوں سے کیا معاملات کر رہے ہیں۔ اور کیسی کیسی ذمہ داریاں قوم کے سر لے رہے ہیں۔ موجودہ دستور میں اتنی جان نہیں ہے، کہ وہ ان سے اتنا پوچھ سے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو۔ آخر کس سے پوچھ کر کر رہے ہو؟

پس ہم چاہتے ہیں کہ عام انتخابات ہوں۔ جن کے ذریعے ایسے لوگوں کو منتخب کیا جائے جو اسلامی دستور کو بنانے اور چلانے کے اہل ہوں۔ اور اس کا عزم رکھتے ہوں۔ اِن انتخابات کے نتیجہ میں ایک بہتر قسم کی دستور ساز اسمبلی بھی بنے اور ایک بہتر قسم کی حکومت قائم ہو۔ جو قرار داد مقاصد کے منشا کے مطابق لوگوں کو تعمیری طور پر تیار کرے۔

مرکزی انتخابات کے ساتھ ساتھ ہم چاہتے ہیں کہ تمام صوبوں میں بھی نئے انتخابات ہوں۔ کیونکہ اسلامی نظامِ زندگی کو قائم کرنے کا کام تنہا مرکز کے کرنے کا نہیں بلکہ صوبوں کی حکومتوں کو بھی اس میں بہت بڑا حصہ لینا ہوگا۔

انتخابات میں جماعت اسلامی کا فیصلہ شرکت

دوسرا فیصلہ ہم نے یہ کیا ہے۔ کہ پنجاب کے انتخابات میں ہم پوری قوت سے شریک ہوں۔ اور اس بات کی کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ صالح لوگ منتخب ہوں۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم خود امیدوار نہیں ہیں۔ کہ ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے کوشش کریں اور نہ ہم پارٹی ٹکٹ پر اپنا کوئی آدمی کھڑا کریں گے۔ جن لوگوں نے ہمارے متعلق اس طرح کی بدگمانی سے کام لیا ہے۔ ان کی بدگمانی غلط ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ عوام کو اس طرح تربیت دی جائے کہ ان کی نگاہِ انتخاب اٹھے تو صالح آدمیوں ہی پر اٹھے اور ان کے اندر یہ تلاش پیدا ہو جائے کہ صالح آدمی کون ہے۔

اب تک تلاش وہ یہ کرتے رہے ہیں کہ ان کی برادری کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ان لوگوں کو ووٹ دیتے رہے ہیں۔ جن کو کسی برسر اقتدار اور ہر دلعزیز گروہ نے

ٹکٹ دے دیا ہے لیکن انہوں نے یہ جائزہ کبھی نہیں لیا کہ جسے وہ ووٹ دے رہے ہیں۔ وہ آدمی کس قسم کا ہے۔ اس کا کیریکٹر کیسا ہے۔ اس نے ماضی میں کیا کیا، اس کا حال کس طرح کا ہے۔ اور اس سے مستقبل کے بارے میں کیا امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اب تک ہمارے عوام نے دھوکے کھائے ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو منتخب کیا ہے جنہوں نے امانت داری کا ثبوت نہیں دیا۔ بلکہ قوم سے خیانت کی ہے۔ عہدوں سے ناجائز فائدے اُٹھائے ہیں اور قوم کی خدمت کے بجائے ذاتی فوائد پر نظر رکھی ہے اب ہم چاہتے ہیں کہ ان کے اندر ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کی طلب پیدا ہو جو صالح ہوں اور بھروسے کے قابل ہوں۔ ہم بجائے اس کے کہ ان سے یہ کہیں کہ ہمیں ووٹ دو۔ یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ یہ نظام زندگی جو قائم کرنا ہے۔ اس کے لئے آدمی تلاش کرو۔ اب ہندوؤں اور انگریزوں سے لڑنے کا سوال درپیش نہیں ہے کہ چالاک لوگوں کی ضرورت ہو، بلکہ اب تو سوال یہ ہے کہ آپ کی زندگی کا نظام قرار دادِ مقاصد کے مطابق تعمیر کرنے کے لئے موزوں ترین لوگ کونسے ہیں۔

مقصد جب متعین ہے تو اب اس مقصد کے نقطۂ نظر سے دیکھئے کہ اسے پورا کرنے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں۔

صحیح نمائندے کی تعریف

اس وقت جو متعین مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے مطابق ہی صالح نمائندے کی تعریف کی جا سکتی ہے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے دیکھنے کی چیزیں چار ہیں۔

(۱) اس کی اپنی ذاتی زندگی اور گھر کی زندگی اس پر گواہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسلام کو مانتا ہے اور سچے دل سے اس کا پیرو ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ایک کندۂ ناتراش تک اس بات کو نہ جان سکے کہ کون شخص ایسا ہے جس کی زندگی بتا رہی ہے کہ وہ اسلام کا سچا پیرو ہے اور کون ایسا ہے جو دھوکے کے طور پر اسلام کا نام لیتا ہے۔

(۲) گرد و پیش کے جن لوگوں سے اس کے معاملات ہوں، جن سے اس کا لین دین ہو، دن رات کا سابقہ ہو اور معاشرت اور ہمسائیگی کا تعلق ہو۔ وہ اس کی ایمانداری کے گواہ ہوں اور اس پر اس حیثیت سے بھروسہ کرتے ہوں کہ وہ جھوٹا آدمی نہیں ہے۔ ناجائز الاٹمنٹیں کرانے والا نہیں ہے، رشوت نہیں لیتا۔ بلکہ اس کے کیریکٹر پر عام لوگ اعتماد کرتے ہیں۔

کیا فی الواقع لوگ یہ نہیں جانتے ہیں کہ سوسائٹی میں جھوٹے اور حرام خوری کرنے والے لوگ کون ہیں اور سچے اور دیانتدار کون ہیں؟ اگر لوگ مرض کا علاج کرانے کے لئے یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر اچھا ہے، مقدمہ لڑنے کے لئے یہ جان سکتے ہیں کہ فلاں وکیل قابل ہے اور خرید و فروخت کرنے کے لئے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں تاجر بھروسے کے لائق ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ یہی بات نہ جان سکیں کہ اسلامی نظام زندگی کی تعمیر کے لئے ان کے درمیان کون سے لوگ ایسے ہیں جن پر بھروسہ کیا جائے۔

(۳) وہ دین اسلام کو بھی جانتا ہو اور دنیا کو بھی سمجھتا ہو۔ دونوں آنکھیں رکھتا ہو، ایک آنکھ کا اندھا نہ ہو یعنی وہ جانتا ہو کہ اسلام کے تقاضوں کے مطابق دنیا کے معاملات کس طرح چلائے جا سکتے ہیں۔

(۴) وہ خود امیدوار نہ ہو۔ اور حصولِ منصب کے لئے خود کسی طرح کی کوشش نہ کرے۔

کوئی شخص ذرا سا بھی غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اقتدار کی کرسیوں کے لئے خود کوشش کرتا ہے وہ ذمہ داریوں پر نگاہ نہیں رکھتا، بلکہ ان کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد پر نگاہ رکھتا ہے، اپنے فائدے کے لئے وہ پبلسٹی کرتا ہے، موٹریں دوڑاتا ہے، دعوتیں کھلاتا ہے، خوشامدیں کرتا ہے، وہ اگر پینتالیس ہزار لگاتا ہے تو اس لئے کہ اس تجارت سے پینتالیس لاکھ کماؤں گا۔

اس معاملہ میں نبیؐ کے واضح احکام موجود ہیں جیسے کہ آپ نے فرمایا۔

اس کام (یعنی حکومت) میں ذمہ داری کا منصب کسی ایسے شخص کو نہ دیا جائے جو خود اس کی درخواست یا حرص رکھتا ہو۔

پھر حدیث میں ہے کہ حضرت ابو موسےؓ اشعری کے ساتھ دو آدمی نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دونوں نے درخواست کی کہ ان کو کوئی عہدہ دیا جائے اس پر نبی صلعم نے صاف صاف الفاظ میں فرمایا۔

ان اخونکم عندنا من طلبہ۔ تم میں سے خائن ترین وہ ہے جو اس (عہدے) کی درخواست کرے۔

اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سخت شرمندہ ہوئے۔ کہ میں ان کو کیوں ساتھ لایا۔

اس حدیث نبویؐ کے مطابق ہم عوام الناس کو تیار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اپنے حلقے یا اس کے باہر ان صفات کے لوگوں کو خود تلاش کریں اور ان سے خود کہیں کہ ہماری نمائندگی کرو۔ پھر تعارف (Convassing) اور جدوجہد وہ نہ کریں بلکہ یہ کریں۔

اس سلسلے میں جو دوسرے عملی سوالات پیش آئیں گے وہ جیسے جیسے سامنے آتے جائیں گے، ان کو ہم حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ بہر حال یہ ایک نیا تجربہ ہے جو ہم کرنے لگے ہیں۔

غنڈہ پن کا مقابلہ

یہ ہم کو خوب معلوم ہے کہ انتخابی جدوجہد کس چیز کا نام ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ میدان کتنا گندہ کر دیا ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے شرکت انتخاب کے ارادے کے اظہار کے ساتھ ہی ہر طرف سے کیچڑ اچھالی جانے لگی ہے شریف آدمی کے لئے اس میدان میں داخل ہونا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اور جو کوئی اس میں داخل ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ گندی کیچڑ میں سے ہو کر ہی چلے اور اس پر بہر حال کیچڑ پڑے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ گندے کیریکٹر کے لوگ ہی آگے بڑھیں اور

شرافت کو ادھر رخ کرنے کی جرأت نہ ہو سکے ۔

اب جب کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ غنڈہ گردی کی گندگیوں کو ایسی کوششوں کی راہ میں مستقل رکاوٹ بنا دیا گیا ہے جن کا مقصد حکومت کو صالح ہاتھوں میں منتقل کرنا ہو ۔ تو ہم بہر حال یہ قربانی بھی دیں گے کہ ان ساری گندگیوں کو برداشت کریں ۔ موجودہ غیر اسلامی اقتدار کو گوارا کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں ۔ لہذا اسے بدلنے کے لیے لعن طعن کرنے والی زبانوں کی بھی کوئی پرواہ نہیں کریں گے ۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کامیاب ہونگے یا ناکام، لیکن ہم یہ ضرور دکھانا چاہتے ہیں کہ شریف آدمی غنڈہ پن کا کس طرح مقابلہ کرتا ہے

معاشی مسائل کا اسلامی حل ۔

ہمارا تیسرا اہم فیصلہ یہ ہے کہ ہم معاشی مسائل کو اسلامی طریقہ پر حل کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشی مسائل کو حل کرنے میں ارباب حکومت جس کوتاہی سے کام لے رہے ہیں اس کی وجہ سے طبقاتی آگ بھڑکنے کے آثار ہر طرف شروع ہو گئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس کو بھڑکنے نہ دیا جائے ۔

جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک ایسا کامل نسخہ ہمارے پاس موجود ہے جس کے ذریعے آپریشن کئے بغیر صحت ہو سکتی ہے تو اسے کیوں نہ آزما دیکھا جائے اور خواہ مخواہ آپریشن ہی پر اصرار کیا جائے ۔ ہم اس نسخے کو آزما کر دیکھنا چاہتے ہیں ۔

یہ واقعہ ہے کہ معاشی مسئلے کا حل اسلامی طریق پر صحیح معنوں میں اسی صورت ہو سکتا ہے ۔ جب کہ سیاسی اقتدار صالح ہاتھوں میں موجود ہو ۔ سیاسی اقتدار کے بغیر اس مسئلے کو پوری طرح حل نہیں کیا جا سکتا ۔ تاہم موجودہ حالات میں جب کہ اقتدار صالح ہاتھوں میں موجود نہیں ہے اور جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ یا تو کرنا چاہتے نہیں یا کرنا جانتے نہیں ، ہم اپنی استطاعت کے مطابق سیاسی طاقت کے بغیر اصلاح کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں اس پر پوری طرح توجہ دیں گے ۔

اس وقت ہمارے سامنے بڑے دو مسائل ہیں۔

جاگیرداری و زمینداری

پہلا مسئلہ جاگیرداری و زمینداری کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے مہینے ڈیڑھ مہینے کے دوران میں ہمارے مسلک کو نہایت غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ ہم جاگیرداری کو جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ہم جاگیرداروں کے پشت پناہ ہیں بعض لوگوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اطلاعات نشر کیں کہ بڑے بڑے جاگیردار جماعت کے مرکز میں آ کر ہم سے مل رہے ہیں ـــ شاید یہ گھر سے چلتے ہوئے وہ ان حضرات کے نام پوسٹ کارڈ لکھ کر ڈال دیتے ہوں گے کہ ہم فلاں لوگوں سے ملنے جا رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ آئندہ جاگیریں اور زمینداریاں قائم کی جائیں یا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ پہلے سے جو جاگیریں اور زمینداریاں چلی آ رہی ہیں ان کا کیا ہو۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ جاگیریں اسلام کا چھٹا رکن ہے، اور وہ ضرور قائم کی جائیں یہ تو حکومت کا حق ہے اور وہ چاہے تو آئندہ کے لئے اسے جاری نہ رکھے۔

سوال صرف اتنا ہے کہ پہلے سے جو جاگیریں اور زمینداریاں چلی آ رہی ہیں ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ اس معاملے میں محض یہ بات کہ اخبارات کسی طبقے کے خلاف لکھ رہے ہیں یا عوام شور مچا رہے ہیں۔ اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ کسی طبقہ کے حقوق ختم کر دیئے جائیں اور اس کی املاک ضبط کر لی جائیں۔ اس اصول کو اگر ایک دفعہ مان لیا جائے۔ تو پھر معاملہ جاگیروں پر ہی ختم نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کے بعد اور مطالبے ہوں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ کل اس بات کے لئے شور مچے کہ فلاں شخص کی آزادی سلب کر لی جائے۔ اور پھر پرسوں اس بات کے لئے ہنگامہ برپا کیا جائے کہ فلاں کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ جہاں کوئی اصول و قانون نہ ہو، بلکہ محض شور اور ہنگامے کو اصول مان لیا جائے وہاں تو انسانی حقوق میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی معاملہ کرنے کے لئے یہ بھی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے کہ پچھلا نظام چونکہ غلط تھا اس لئے اس کئے ہوئے سارے معاملات کالعدم قرار پانے چاہئیں۔ اس بنیاد کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو ایک ایک کپڑا جو آپ پہنے ہوئے ہیں۔ اس کی تاریخ کا کھوج لگانا ہوگا، اور پھر زمین ہی نہیں، ساری ملکیتوں — مکانوں، موٹروں، کپڑوں کے متعلق یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ یہ سب کا سب چھین لینا چاہیئے۔ دراصل عوام کو دھوکہ دینے کے لئے اس قسم کی مبالغہ انگیز باتیں کی جاتی ہیں۔

کوئی معقول آدمی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بجائے خود یہ فعل کہ حکومت خدمت یا کام کے بدلے میں کسی کو زمین عطا کرے۔ فی نفسہ جائز ہے۔ اگر ایک حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ خدمت کے معاوضے میں روپیہ سواری یا مکان کسی کو دے تو کوئی معقول دلیل اس امر کے حق میں نہیں ہے کہ حکومت زمین نہ دے۔ اگرچہ زمین دینا کوئی فرض بھی نہیں ہے محض اس بنا پر کہ کسی حکومت نے کسی زمین کو دیا ہے۔ اسے ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو کام خود نبی صلعم نے کیا ہو یا اکابر صحابہ نے کیا ہو اسے ناجائز کہنے میں کچھ تو تامل کرنا چاہیئے۔

جاگیروں کی تحقیق کے لئے تین اصول

البتہ سوال یہ اٹھانے کا ہے کہ اگر حکومت نے اگر عطیہ دیا ہے تو وہ جائز قسم کا ہے یا ناجائز قسم کا۔ جو بات میں بار بار کہتا رہا ہوں۔ اور جسے مجلس شوریٰ نے بھی اپنے ریزولیشن میں بیان کر دیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جائز اور ناجائز کی تحقیق کی جائے۔ اور اس تحقیق کے لئے تین اصول ہیں۔

۱۔ حکومت نے جو عطیہ کسی کو دیا ہے وہ کس قسم کی زمینوں میں سے دیا ہے۔ آیا غیر مملوکہ افتادہ (موات) زمینوں میں سے یا سرکاری مقبوضہ (خالصہ) زمینوں میں سے۔ یا کیا لوگوں کی مملوکہ زمینیں چھین کر کسی کو عطیہ دیا ہے اور اصل مالکوں کو کاشتکار بنا دیا ہے۔

اگر پہلی دو قسم کی زمینوں میں سے دیا ہے۔ تو اس پہلے اصول کی حد تک معاملہ جائز

ہے، لیکن اگر تیسری قسم کی زمینوں میں سے دیا ہے تو وہ قطعاً ناجائز ہے اور اسے منسوخ ہونا چاہیے۔ یہی کام حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے کیا تھا۔

۲۔ جاگیروں کو جانچنے کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ حکومت نے عطیہ کن خدمات اور کس قسم کی اغراض کے لئے دیا ہے۔ آیا پبلک کی حقیقی خدمات کے صلے میں دیا یا پبلک مفاد کے خلاف؟ اگر پبلک مفاد کے لئے کوئی صلہ دیا گیا ہو اور وہ "مودت" اور "خالصہ" زمینوں میں سے دیا گیا ہو تو وہ جائز ہو گا، لیکن پبلک مفاد کے لئے بھی اگر لوگوں کی مملوکہ زمینوں کو زبردستی کسی کے لئے جاگیر بنا دیا گیا تو جائز اغراض کے لئے دیا ہوا عطیہ بھی ناجائز ہو گا۔ رہے وہ عطیے جو پبلک کے مفاد کے خلاف حکمران طاقت نے اپنے مفاد کے لئے دیئے ہوں وہ سراسر ناجائز ہیں، چاہے جائز قسم کی زمینوں میں سے کیوں نہ دیئے گئے ہوں۔

۳۔ کسی عطیہ کے جائز ہونے کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ جائز زمین میں سے جائز پبلک خدمات کے صلے دیا گیا ہو۔ بلکہ تیسری بات تحقیق کرنے یہ بھی ہے کہ اعتدال سے دیا گیا ہو۔ میں یہ واضح کر دوں کہ اسلام میں اعتدال کی شرط کے معنی یہ ہے کہ اصول کفالت کے مطابق عطیہ اس حد تک دیا گیا ہو کہ متوسط درجہ کی صالح زندگی گذاری جا سکے۔ نہ یہ کہ ایک شخص بیس بیس موٹریں رکھ سکے اور اس کے ایک ایک کتے کو دودھ پلانے کے لئے ایک ایک گائے بندھی ہو۔ کفالت کی حد سے زائد اگر عطیہ دیا گیا ہو تو وہ بے اعتدالی کی تعریف میں آتا ہے اور اس میں سے صرف معتدل حد تک کہ جتنا ایک شخص کی کفالت کرنے کے لئے کافی ہو باقی رکھ کر بقیہ کو واپس لے لینا چاہیئے۔

میں اور میری جماعت یہ چاہتی ہے کہ اس مسئلے کو اس طرح حل کیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہماری دانست میں ملک میں کوئی عالم دین ایسا نہیں ہے جو اس اصول کو تسلیم نہ کرتا ہو کہ اسلام کے دیئے ہوئے بنیادی حقوق میں سے

ایک حق یہ بھی ہے۔ کہ کسی شخص کے قبضے سے کوئی چیز اس وقت تک نہ نکالی جائے جب تک قبضہ ناجائز ثابت نہ ہو یا کوئی ایسا جرم نہ عائد ہو جائے جس کی وجہ سے حکومت کو اس کی ملکیت کے سلب کرنے کا حق پہنچا ہو۔ اس اصول کے ہوتے ہوئے جب تک کہ باقاعدہ تحقیقات سے ثابت نہ کر دیا جائے کہ فلاں فلاں عطیات ناجائز ہیں ہیں آخر کس بنا پر چند اخبارات کے شور مچانے پر اسلام کے اصولوں کو بدل دوں[1]۔

زمینداروں اور مزارعان کے تعلقات کی اصلاح

اس کی چھان بین کے بعد جن لوگوں کے پاس بھی زمینیں رہ جائیں ان کو مطلق العنان نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے مزارعوں پر جس طرح چاہیں ظلم وستم کرتے رہیں، جس طرح اب تک کرتے رہے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان کو اسلامی حدود کا پابند بنایا جائے۔ اور ان کے وہ تمام حقوق ساقط کر دیئے جائیں جو انہوں نے زبردستی قائم کر رکھے ہیں۔

اسلامی حدود کا مطلب یہ ہے کہ سیدھی طرح صفائی سے زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان شرکت کا معاملہ ہونا چاہیئے۔ اگر بٹائی اور لگان کے معاملہ میں افراط وتفریط ہو رہی ہے۔ تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ قانونی طور پر افراط وتفریط کو روک دے۔ اور جائز منصفانہ شرح مقرر کر دے۔ اس مقررہ شرح سے زائد ایک حبہ وصول کرنے کی جرات کسی کو نہ ہو۔

اس کے علاوہ عشر وزکوٰۃ کی تحصیل کا باقاعدہ انتظام کیا جائے تاکہ اس سے مستحقین کی ضروریات پوری ہوں۔ وراثت کا اسلامی قانون جاری ہو اور زمینوں کو بانٹ کر مستحقین

---

[1] اس مرحلے پر تقریر کے دوران میں یہ سوال کیا گیا کہ جو جاگیریں جائز مقاصد کے لئے دی گئی تھیں۔ لیکن اس کا استعمال اب اصل مقاصد کے لئے ہو ہی نہیں رہا۔ تو ان کا کیا ہو گا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ ایسی جاگیریں جو خدمات کا صلہ نہ ہوں۔ بلکہ کسی جائز خدمت کو جاری رکھنے کے لئے دی گئی ہوں، ان کے بارے میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس خدمت کو اب بھی جاری رکھنا مطلوب ہے یا نہیں؟ اگر مطلوب نہ ہو یا ان کا استعمال صحیح نہ ہو رہا ہو تو ان کو واپس لیا جا سکتا ہے۔

تک ان کے حق پہنچائے جائیں۔

زمینداریوں کا جائزہ

یہی معاملہ زمینداریوں سے بھی کرنا پڑے گا۔ ان پر بھی باقاعدہ نگاہ ڈال کر دیکھا جائے کہ ان کی نوعیت کیا ہے۔ زمینداریوں کی ہمارے ہاں دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔

ایک وہ جو یا تو کسی نے خود خریدی ہوں یا وراثت میں پائی ہوں اور یہ پتہ چلانا ممکن ہی نہ ہو کہ ان کی اصل کیا ہے۔

دوسری وہ جن کی حیثیت مالگذاری کی ایجنسیوں کی تھی اور بعد میں ان کے مالکانہ حقوق دے دیئے گئے۔ اس قسم کے زمیندار دراصل تحصیل کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے حقوق ملکیت بے جا طور پر حاصل کئے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ منسوخ ہو جانے چاہئیں۔ اس قسم کی زمینداریوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جائز ملکیتیں صرف وہ ہیں جن کو یا تو خود کسی نے خریدا ہو یا میراث میں پایا ہو۔

اسلام میں جاگیرداریوں اور زمینداریوں کی اصلاح کے لئے ان اصولوں پر باقاعدہ کارروائی کئے بغیر اور کوئی طریقہ نہیں ہے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن اور حدیث کے سوا اور کسی چیز کو حجت ماننے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ جو لوگ باہر کے نظریات سے مرعوب ہیں اور باہر کے نظریات لا کر میرے سامنے رکھتے ہیں۔ ان سے میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام سے باہر کے نظریات کو میں قبول نہیں کر سکتا۔ میرے لئے صرف قرآن اور احادیث حجت ہیں۔

محنت کار۔

دوسری طرف ہمارے سامنے محنت پیشہ اور محنت کش طبقے کا مسئلہ ہے ہم اس اصول کے قائل ہیں کہ جو کوئی محنت پیشہ اور محنت کش طبقوں سے محنت لیتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ محنت کرنے والے کی ضروریات کو پورا کرے چاہے وہ محنت کش کسی کارخانہ کا مزدور ہو یا

حکومت کے کسی محکمہ کا ملازم، ہم اس کو جائز ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ایک شخص تو دو ہزار، چار ہزار روپے ماہانہ وصول کرے، چاہے وہ ایک بیوی اور ایک ہی بچے کی کفالت کا ذمہ دار ہو۔ اور دوسری طرف وہ محنت کش جس کی پوری قوتیں آپ لیتے ہیں۔ اس کے کنبے کے افراد چاہے کتنے ہی زیادہ ہوں، پینتالیس روپے ماہوار پر کام کرے یہ بالکل کھلی کھلی زیادتی ہے۔ قابلیتوں میں تفاوت ہو سکتا ہے۔ اور اس کا جائز حد تک لحاظ کیا سکتا ہے۔ یہ بلاشبہ زیادتی ہوگی۔ کہ ایک کام میں جس میں زیادہ قدر و قیمت کی محنت کرنی پڑتی ہو اسے اس کام کے برابر قرار دیا جائے جس میں کم قدر و قیمت کی محنت کرنی پڑے لیکن یہ بھی غلط ہے کہ کسی کا پورا وقت لینے کے بعد اس کی ضروریات کی کفالت نہ کی جائے۔

ظاہر بات ہے کہ جب تک سیاسی اقتدار نہ ہو، اس پروگرام پر عمل نہیں کیا جا سکتا حکومت ایسی ہونی چاہیئے۔ جو ان اصلاحات کو عملاً نافذ کرے، حکومت کے ذرائع و وسائل کو ہاتھ میں لئے بغیر نہ تو جاگیروں اور زمینداریوں کی چھان بین کا کام کرنا ہمارے لئے ممکن ہے۔ نہ محنت کش طبقہ اور سرکاری ملازمین کے حقوق کو اسلام کے مطابق بحال کیا جا سکتا ہے لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا ہم چاہتے ہیں کہ غیر سیاسی اور غیر سرکاری حیثیت سے جو کچھ ممکن ہو وہ کریں۔

ہم دیہات میں جا کر زمیندار اور مزارع کے درمیان اسلام کے مقرر کردہ حقوق کا احترام پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ غلط اور ناجائز چیزوں کو رضا کارانہ طور پر چھوڑ دیں اور صرف جائز اور صحیح کو قائم رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جو مالکان زمین اصلاح پذیری پر تیار نہ ہوں ان کو ظلم سے روکنے کے لئے ہم کاشتکاروں کو اسلامی طریق پر منظم کرنا چاہتے ہیں، تاکہ دباؤ ڈالنے کی ممکن جائز صورتیں اختیار کر سکیں۔

دباؤ ڈالنے کے معاملے میں ہمارے اور غیر اسلامی نظریات رکھنے والوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ ان کا مقصد دباؤ ڈالنے سے یہ ہوتا ہے کہ طبقاتی کشمکش کی آگ مشتعل ہو۔

اور ایک مسئلہ حل ہو تو کوئی اور خرابی پیدا ہو جائے اور کسی صورت میں جھگڑا اٹھنے نہ پائے۔ ہم دباؤ اس لئے ڈالنا چاہتے ہیں کہ جائز حقوق اور جائز مطالبات تسلیم کر لئے جائیں۔ اور جو مسائل درپیش ہیں وہ حل ہوں۔ تاکہ آگ بھڑکنے کی بجائے بجھے۔ دباؤ ڈالنے میں ہمارے اور ان کے درمیان فرق ضرور ہوگا۔ لیکن دباؤ ڈالنا انہیں کا اجارہ نہیں۔

اخلاق و کردار کی اہمیت

میں اس بات کی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اخلاق کی اہمیت پر کیوں زور دیتے ہیں۔ دراصل روزمرہ کے معاملات میں جتنا دخل اخلاقی فیاضی کو ہے اتنا قانون کو نہیں ہے اگر ایک میاں بیوی یہ طے کر لیں کہ وہ صرف قانون کے دیئے ہوئے حقوق پر معاملہ کریں گے اور ہر وقت وہ قانون کی کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے ہوں۔ تو دو دن سے زیادہ نباہ ممکن نہیں ہے۔ انسانی زندگی اگر درست ہو سکتی ہے اور معاملات اگر درستی سے طے پا سکتے ہیں تو صرف اخلاقی فیاضی کے بل پر۔ اخلاقی فیاضی سے صالح تمدن پیدا ہوتا ہے۔ جس میں کش مکش نہیں ہوتی بلکہ تعاون کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ قانون کے زور سے صالح تمدن پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سوسائٹی میں اخلاقی فیاضی پیدا کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ لوگ صرف قانون کی کتاب اور لکھے ہوئے معاہدوں پر ہی ہر معاملہ کا فیصلہ نہ کریں بلکہ باہم مصالحتی طریقوں سے کام لیں۔ یہ سپرٹ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک خدا ترسی اور اخلاقی فضیلت لوگوں میں پیدا نہ ہو۔ پس ہماری اولین کوشش یہ ہے کہ جھگڑے جلدی سے جلدی نمٹیں اور لوگوں میں مصالحانہ تعلقات پیدا ہوں اور تمام معاملات زیادہ سے زیادہ صالح بنیادوں پر استوار ہوں۔

حضرات! یہ ہے وہ کام جسے ہم کرنا چاہتے ہیں۔

حرفِ آخر۔

اگر آپ کو یقین ہے کہ یہ کام صحیح ہے تو پھر آپ کا اپنی جگہ پر بیٹھا رہ جانا غلط ہے صدیوں

سے یہ ایک کش مکش ہے جو سنت اور بدعت کے درمیان چلی آرہی ہے اب ہر شخص کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس کا تعاون کس کے ساتھ ہے۔ یہ کش مکش اگر یونہی جاری رہی۔ اور اہل سنت کے مقابلے میں بدعت کو پورے اختیارات اور اس کی جڑیں مضبوط ہوگئیں تو پھر یہاں بھی ترکی کے سے حالات رونما ہوں گے کہ وہاں فریضہ حج ۲۵ سال تک بند رہا اور اہلِ دین دم بخود بیٹھے رہے مسلمان عورتیں غسل کے لباس میں علانیہ سمندروں کے کنارے غسل کرنے لگیں اور مسلمان علما کچھ نہ کر سکے ۔

جن لوگوں کی ہمدردیاں بدعت کے ساتھ ہیں۔ وہ پورے انشراح کے ساتھ اس کا ساتھ دیں لیکن جو لوگ سنت کے مسلک کو صحیح سمجھتے ہوں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ ہم سنت ہی کو قائم کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو اس مقصد پر صرف کریں ۔

اخلاقیات اجتماعیہ

اور

اس کا فلسفہ

مولانا محترم کی یہ نایاب اور تاریخی اہمیت کی طویل تحریر "اخلاقیات اجتماعیہ اور اس کا فلسفہ" برصغیر کے ممتاز ماہ نامہ "ہمایوں" لاہور میں اس کی پہلی قسط فروری ۱۹۲۴ء کے شمارہ میں شائع ہوئی پھر یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ یہ تحریر وہیں سے لے کر شائع کی جا رہی ہے۔

اخلاقیات کا موضوع

عقلیات کے نقطہ نظر سے اگرچہ اصل نفس نفس عاقلہ ہے، لیکن اخلاقیات اور نفسیات کے دائرہ میں نفس عاقلہ کوئی چیز نہیں۔ یہاں سارا دارومدار نفس اجتماعی پر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دنیا افراد کی نہیں، بلکہ جماعتوں کی ہے اور چونکہ یہ علوم جماعتوں سے بحث کرتے ہیں اس لئے افراد کے نفس عاقلہ کی گفتگو ان میں بالکل خارج از بحث ہے اخلاقیات کا یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ افراد کی کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے۔ کیونکہ جماعت سے افراد کا جدا ہونا اور اس جدائی کے بعد بحیثیت ایک انسان کے زندہ رہنا بالکل ناممکن ہے پھر جب اپنی کوئی مستقل بالذات ہستی ہی نہیں رکھتے تو ظاہر ہے کہ نفس عاقلہ کو کیا اہمیت دی جا سکتی ہے۔

عقلیات کے نفس عاقلہ کے خلاف سب سے پہلے یہ آواز ارسطو نے بلند کی تھی جو اس وقت تو صرف بلند ہی ہو کر رہ گئی۔ مگر بعد میں اتنی گونجی کہ اب ایک تسلیم شدہ حقیقت ہو گئی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ کوئی شخص مستقل بالذات نہیں ہو سکتا اور جو شخص یہ دعوے کرتا ہے اس سے کہہ دو کہ وہ انسان نہیں ہے اس کا شمار جانوروں میں ہے یا دیوؤں میں۔ اور یہ بالکل سچ ہے۔ اجتماعی نقطہ نظر سے کسی ایسے انسان کا نہ کوئی نصب العین

ہو سکتا ہے اور نہ اس کا حصول ممکن ہے۔ کیونکہ افراد کا نصب العین صرف اجتماعیت میں مضمر ہے اور جماعتی زندگی ہی میں اس کا تحقق ممکن ہے پس جب انسان کا کوئی نصب العین ہی نہیں تو وہ دائرہ انسانیت سے خارج ہے اور وہ یا جانور ہے کہ جانوروں کا بھی کوئی نصب العین نہیں ہوتا، یا دیوتا ہے کہ دیوتاؤں کی بھی زندگی ایک نصب العین کے لئے جینے سے مبرا ہوتی ہے۔ حکمائے متاخرین میں ہیگل بھی اس خیال کا بڑا مؤید ہے اس کے نزدیک افراد کا نصب العین سلبی یا ایجابی دونوں حیثیتوں سے اجتماعی زندگی سے ساتھ ایک ناقابل انفکاک تعلق رکھتا ہے اور اس لیے اس کا وجود و تحقق بہر حال حیات اجتماعی کا پابند ہے۔

یہ بحث عمیق اور نازک ہے، یہاں اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا ہمارے مقصد کو سمجھنے کے لئے محض اتنا جان لینا کافی ہے کہ انسانی زندگی کا نصب العین صرف ابنائے نوع سے تعلق ہی میں مضمر ہوتا ہے، خالص انفرادی زندگی میں اس کا تحقق ممکن نہیں، جماعت ایک عضوی وحدت ہے، اس کے اجزا باہم ایک دوسرے سے اسی طرح وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے کے ویسے ہی محتاج ہیں جیسے ایک حیوانی جسم کے اعضا، باہم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اصلی حیات کا حکم جس طرح ایک عضو پر نہیں۔ بلکہ پورے جسم یعنی مجموعہ اعضا کے وجود پر لگایا جاتا ہے، اسی طرح ایک فرد کی زندگی بھی کوئی صحیح انسانی زندگی نہیں۔ بلکہ پوری جماعت کے ایک جز کی حیثیت سے وہ معتبر ہوتی ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں ہر فرد کے نصب العین کا اتمام دوسرے افراد کی اعانت پر موقوف ہے، اس کے بغیر قطعاً ناممکن ہے پس سمجھ لو کہ اخلاقیات کا موضوع جماعت ہے اور افراد سے۔ جو کچھ بھی اس کو بحث ہے وہ محض اس حیثیت سے ہے کہ وہ جماعت کے اجزا ہیں

اخلاق کی غایت

عام طور پر اخلاق کی غایت تکمیل نفس سمجھی جاتی ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں،

علمِ اخلاق افراد سے بحث ہی نہیں کرتا۔ اس کا موضوع بحث صرف جماعت اور اجتماعیت ہے اس لیے اس کی غایت محض تکمیل نفس انفرادی نہیں ہو سکتی بلکہ نفسِ اجتماعی کی تکمیل ہونی چاہیئے۔ ہر چند افراد کے اخلاق کی بہتری پر جماعت کے اخلاق کی خوبی منحصر ہے اور اس لیے علم الاخلاق افراد سے بھی بحث کرتا ہے۔ مگر تم غور کرو تو خود سمجھ جاؤ گے کہ افراد سے اس کا بحث کرنا صرف تکمیل نفس اجتماعی کی خاطر ہے اور اس لیے غایت مقصود جماعت ہی ہے نہ کہ افراد۔ اسی لیے تم دیکھو گے کہ جہاں کہیں افراد کے ذاتی مقاصد جماعت کی اغراض سے ٹکرا جاتے ہیں، یا ان کے مفاد مصالح جماعت کے مفاد مصالح سے متضاد واقع ہوتے ہیں، تو علم الاخلاق جماعت کا ساتھ دیتا ہے اور جو اجتماعی مشین کے ایسے پرزوں کو الگ کر دینے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے عمل میں حارج ہوتے ہیں۔

انانیت و اخوانیت

اخلاقیاتی نقطہ نظر سے ذاتی اور اجتماعی اغراض و مقاصد میں ایک نازک فرق ہے۔ ذاتی اغراض کی طلب کا نام انانیت ہے اور جماعتی اغراض کی طلب کا نام اخوانیت۔ ان دونوں کے تعلق اور دائرہ عمل کی تحدید جتنی ضروری ہے اتنی ہی مشکل ہے اسپنسر نے ان حدود کو متعین کرنے کی بہت کوشش کی ہے مگر باوجود انتہائی وضاحت اور تفصیل کے اس کی بحث کا نتیجہ جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفائی کے ساتھ کوئی ایک لائن قائم نہیں کر سکا۔ وہ کہتا ہے کہ انانیت و اخوانیت دونوں میں سے کسی ایک میں بھی اگر افراد پسندی سے کام لیا جائے تو خود اسی کی بربادی لازم آتی ہے اگر ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کا بندہ ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی ایک کی بھی اغراض حاصل نہ ہوں گی، کیونکہ کسی فرد کی ذاتی غرض بغیر دوسروں کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اگر ہر شخص اپنی زندگی دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کر دے تو یہ بھی دونوں کے لیے مضر ہوگا، کیونکہ اگر ہر شخص اپنی خدمت آپ نہ کرے گا اور اپنی بہتری و خبرگیری سے بے پروائی برتے گا تو وہ اپنے آپ کو بھی برباد کرے گا اور اپنے اندر دوسروں کی فلاح کاری و

واعانت کی جو استعداد رکھتا ہے اسے بھی نقصان پہنچائے گا پس ہمارا مقصد نہ محض انانیت ہونا چاہیئے اور نہ صرف اخوانیت، بلکہ وہ ان دونوں کے بین بین رہنا چاہیئے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے انانیت واخوانیت ساتھ ساتھ زندہ رہ سکتی ہیں۔ ورنہ یا تو ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی یا ایک فنا ہو گی اور ایک باقی رہے گی اور یہ دونوں حالتیں تقاضائے فطرت کے خلاف ہیں۔ اسپنسر نے اس کے ساتھ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ کہ جماعت جس قدر حد تکمیل سے قریب تر ہوتی جائے گی اسی قدر انانیت واخوانیت میں یکسانیت پیدا ہوتی جائے گی ——— یہ اسپنسر کی طویل بحث کا خلاصہ ہے، ایک حد تک خوب ہے اور بعض حیثیتوں سے اس کے خیالات قابلِ تسلیم ہیں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ جس روح میں اسپنسر انانیت واخوانیت کے درمیان تفریق کرتا ہے اس سے علم الاخلاق متفق نہیں۔ ان دونوں اخلاقی حالتوں میں تباین ضرور ہے، مگر نہ اتنا جتنا اسپنسر کو نظر آتا ہے۔ اخلاق کا یہ ایک معمولی درجہ ہے کہ انسان اپنی خدمت اور خبر گیری کے ساتھ ساتھ جماعت کی خدمت اور خبر گیری کرتا ہے وہ لوگ جو ایسا کرتے ہیں، عام اخلاقی سطح سے کچھ زیادہ بلند نہیں تکمیلِ اخلاق کا درجہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے، ہیگل کہتا ہے کہ "نفس کی حقیقی اور آخری تکمیل صرف مقاصدِ اجتماعیہ ہی کی تکمیل میں ممکن ہے" تکمیلِ اخلاق کا صحیح معیار دراصل یہی ہے اور تم دیکھ لو کہ دنیا میں جب کبھی کوئی اخلاقی انقلاب ہوا ہے، تو وہ ایسے ہی لوگوں کی کوششوں سے ہوا ہے جنہوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھو کہ علم الاخلاق افراد کش ہے اور جماعتوں پر افراد کی زندگیوں کو قربان کرنا چاہتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو افراد کی تباہی لازم آتی ہے اور افراد تباہ ہونے کے بعد جماعت کا وجود کب باقی رہا؟ نہیں بلکہ علم الاخلاق کا مقصد انانیت واخوانیت میں اتنی یگانگت پیدا کرنا ہے کہ بیگانگی کا پردہ اٹھ جاتے، افراد جماعت کی فلاح کو عین اپنی فلاح سمجھیں، اور جماعت سے الگ (یعنی جماعت کے خلاف) انکے منافع و مصالح کا کوئی وجود ہی نہ ہو ایسی حالت میں انانیت واخوانیت کے درمیان کوئی فرق نہیں باقی رہتا اور دونوں ایک ہو جاتی ہیں کیونکہ جب اپنی ذات کی فلاح

اندیشی ساری جماعت کی فلاح و بہبود کے نقطہ نظر پر مبنی ہو تو اس کو ذاتی فلاح اندیشی کہنا ہی غلط ہے وہ تو عین جماعت کی فلاح اندیشی ہے۔ جب ذاتی خواہشیں اجتماعی فائدوں ہی کے لئے ہوں، ذاتی منافع اجتماعی منافع کے ماتحت ہوں اور ذاتی ترقی کا اصل مقصد اجتماعی ترقی ہی ہو تو ذات اور جماعت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ کیونکہ اس صورت میں ذات کی فلاح جماعت کی فلاح کے لئے مددگار ہے۔ اور جز کی تکمیل، کل کی تکمیل کے لئے معاون۔ بعض علمائے اخلاقیات اس حالت کو "عالمِ عقلی" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جب "نفسِ اجتماعی" کی ہمہ گیری نے "نفسِ عاقلہ" کو بے حقیقت کر دیا تو اس پر "عالمِ عقلی" کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں! اس حیثیت سے کہ اس میں عقلیت کو بہت دخل ہے، اس فلسفہ کو فلسفۂ عقلی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم یہ ایک بہت ہی پیچیدہ ماحول ہے۔

اخلاقیات اور سیاسیات

ارسطو کہتا ہے کہ "انسان ایک سیاسی حیوان ہے"! ان چند لفظوں میں اس نے صفحوں کی بحثیں سمیٹ کر رکھ دی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سیاسیات کو عموماً اتنا محدود سمجھا جاتا ہے کہ اچھے خاصے لکھے پڑھے آدمی بھی اخلاقیات کو اس کا ایک جز سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ مگر قدمائے یونان نے اسے بہت وسیع معنوں میں لیا ہے جس سے ان کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخلاقیات و سیاسیات دونوں توام ہیں۔ اور دونوں میں ایسا گہرا رابطہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ علم الاخلاق افراد کے باہمی تعلقات رابطوں سے بحث کرتا ہے اور علم السیاست افراد و جماعات کی تنظیم سے۔ دونوں قدم قدم پر ایک دوسرے سے مدد لیتے ہیں۔ اور معاملات میں اکثر ان کو ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ اس مسئلہ پر قدیم حکمائے یونان نے بہت وضاحت سے بحث کی ہے۔ موجودہ حکما کو اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہے اس لئے یہاں اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا جائے گا وہ صرف حکمائے یونان کے خیالات ہونگے اور ان میں بھی زیادہ تر ارسطو اور افلاطون کے۔

افلاطون اجتماعیت کا عاشق تھا۔ اس نے اپنی ساری توجہ انفرادی محاسن اخلاق کی

تحقیق و تفتیش اور حد بندی کی بجائے محاسن اجتماعی اور جماعات کی صحیح شیرازہ بندی کے اصول دریافت کرنے میں صرف کی، اور اس کے لئے اس نے ایک ایسے نظام حکومت کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کی جس کے ماتحت جماعت، جماعت کی حیثیت سے اور افراد اجزاء جماعت کی حیثیت سے انتہائی ترقی تک پہنچ سکیں۔ وہ جماعت کی فلاح کو نظام حکومت کی بہتری میں ڈھونڈھتا ہے۔ اس کے نزدیک کوئی جماعت اخلاقی پستی سے نہیں نکل سکتی تاوقتیکہ نظام سیاست ایک بلند معیار پر قائم نہ ہو، اور اس کا خیال ہے کہ ایک اچھی حکومت کے ممیزات و خصوصیات دریافت کر لینے کے بعد اجتماعی محاسن کا حصول بہت آحسان ہے اس مسئلہ پر اس نے اپنی مشہور تصنیف "جمہوریت" میں بہت وضاحت سے بحث کی ہے وہ ایک معیاری حکومت کا خاکہ کھینچتا ہے جسے اخلاقی و سیاسی اعتبار سے اب بھی ایک بہترین حکومت کا دستور اساسی کہا جا سکتا ہے۔ اس نے یونانیوں کی عام تقسیم کے مطابق اپنی خیالی حکومت کو چار بنیادوں پر قائم کیا ہے، حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت۔ ظاہر ہے کہ جس حکومت کا مایۂ خمیر یہ فضائل اخلاق ہوں گے۔ وہ جماعت انسان کے لئے کس قدر مفید اور فطرتِ انسانی کے کس قدر قریب ہوگی۔ افلاطون ان چاروں اصولوں کی حکومت دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے ماتحت اسے یقین ہے کہ انسانی جماعت اخلاق کے درجۂ کمال کو پہنچنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ افلاطون کے اس نظریہ پر ڈاکٹر سیجوک نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اخلاقیات" میں بالتفصیل بحث کی ہے، مگر سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون ڈاکٹر بسنکٹ کی کتاب Companion to Plate's Republic میں ملے گا۔

اس کے بارے میں ارسطو بھی افلاطون سے پیچھے نہیں۔ انسان کے مدنیت پسند ہونے کی نسبت اس کا عقیدہ یقین و اذعان کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے۔ اس نے اخلاقیات پر جو کتاب لکھی ہے، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگرچہ اب اس موضوع پر ایک بہت بڑا سرمایہ پیدا ہو گیا ہے مگر وہ سب اسی دریا کی نکلی ہوئی نہریں ہیں۔ اس کی ساری بحث اس خیال پر مبنی ہے کہ علم الاخلاق، علم السیاست

کا ایک جزو ہے اور وہ اس اصول کے ماتحت بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے ایک ایسے نظام حکومت کو تلاش کرتا ہے جو بہترین فضائل اخلاق پر قائم ہو اگرچہ اس کے نزدیک زندگی کا ایک معیار ایسا بھی ہے جو سیاسی زندگی سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ مگر اس زندگی کو بھی وہ شہریت کی بنیاد پر قائم کرتا ہے اور اسے اپنی خاص اصطلاح میں نظری و فکری زندگی سے تعبیر کرتا ہے جسے ہم علمی و حکمی زندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ارسطو کی اس بحث کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سیاسیات اخلاقیہ پر بہت زیادہ غور کیا تھا اور اس نقطہ پر پہنچا تھا جس سے آج تک ہم ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکے۔ آج کل سیاست کے اس حصہ کو جس کا تعلق اخلاقیات سے ہے "فلسفہ اجتماعی" کہا جاتا ہے۔ اخلاقیات اور سیاسیات میں باہم جو علاقہ ہے اس پر ڈاکٹر میر ولی الدین نے مناہج اخلاقیات میں مفصل بحث کی ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے مندرجہ بالا خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اخلاقیات کا بہترین مقصد ایک ایسے نظام حکومت کی تخلیق تھا جس کے ماتحت رہ کر عوام اپنی اخلاقی تکمیل کر سکیں۔

رواقیین کا مذہب

دعوت رواقیہ کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جبکہ یونانی تمدن کا بہترین زمانہ گذر چکا تھا اور ان کی تہذیب و شائستگی، علوم و فنون، اخلاق و سیاست سب کچھ رومیوں کے پاؤں تلے روندے جا رہے تھے پس چونکہ رومیوں کے غلبہ سے کوئی توقع باقی نہ رکھی تھی کہ یونانی اپنا پہلا سا عروج دوبارہ حاصل کر سکیں گے، اس لئے رواقیین نے آفاقیت کی دعوت دینی شروع کی۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ ملک و وطن اور جماعت و اجتماعیت کی قید سے آزاد ہو کر ہمہ وطن زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ ایک نیکوکار آدمی کو کسی رشتہ اجتماعی کی پابندی ضروری نہیں، انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اس کو آزاد ہی رہنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے فلسفہ اخلاق کی بنیاد "سارا جہان ہمارا" کا عقیدہ تھا۔ اگرچہ اس وسعت

نے اجتماعی روابط کا عدم وجود بالکل ہی برابر کر دیا تھا، تاہم وہ اتنا ضرور تسلیم کرتے تھے کہ اچھا آدمی شہری" ہوتا ہے ـــــ اس میں شک نہیں کہ رواقیین کی بعض تعلیمات نہایت عمدہ تھیں، لیکن اس وجہ سے کہ ان کے ہاں اجتماعی روابط کا تعین بالکل نہیں ہے" ان کا سارا نظام اخلاق بے معنی اور ناقابل عمل ہو گیا ہے۔ اسی لئے اخلاقیات کے دائرہ میں عام خیال ہے کہ رواقیین کی تعلیمات محض لفظی گورکھ دھندا اور خیالی طلسم آرائیاں ہیں۔

مسیحیت کا فلسفۂ اخلاق

مسیحیت کا فلسفۂ اخلاق بھی رواقیہ کے اخلاقی اصولوں سے ملتا جلتا ہے، بلکہ وہ تو انسان بحیثیت انسان کے شرف پر رواقیہ سے زیادہ زور دیتا ہے اور اس کا دامن شرف و فضیلت گنہگاروں تک وسیع ہے۔ اس کی بنیاد بھی بلا قید ملک و ملت کے سارے عالم کی محبت پر قائم ہے، اور جگہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ افراد کی ہستی بالکل مستقل بالذات اور مستغنی عن الاجتماع ہے۔ اس نظریہ کے خاص الفاظ یہ ہیں کہ ہر شخص کو اپنی نجات کی راہ آپ نکالنی چاہیئے اور زندگی کا اعلیٰ نصب العین حاصل کرنے کے لئے تمام اجتماعی رشتے، تمام خونی تعلقات اور تمام نسلی روابط قطع کر دینے چاہئیں۔ اس نے تشبیہ باللہ کے خیال کو بھی زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مگر یہ رہبانیت کی تعلیم مسیحیت کے اس عہد تک مخصوص ہے جس میں اسے ایک بالکل مخالف دنیا سے مقابلہ کرنا تھا اور اجتماعی زندگی میں اس کو کامیابی نظر نہ آتی تھی۔ لیکن جب اس نے دنیا کو فتح کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی اور ایک وسیع انسانی آبادی اس کے علَم کے نیچے آ گئی تو اس کی اخلاقی تعلیم نے اپنا رخ بدلا اور وہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ اس عقیدہ کی تبلیغ کرنے لگی کہ انسان کو اخلاق کا درجۂ کمال حاصل کرنے کے لئے خدا اور مخلوق دونوں سے اتحاد و اتصال رکھنا چاہیئے" اور یہ اجتماعیت کی کھلی تعلیم ہے۔[1]

---

[1] یہاں اس بارہ میں اسلام کے مذہب کو قصداً نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ اول تو اسلام کا فلسفۂ اخلاق خود اخلاق خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر ایک سیر حاصل بحث کے بغیر تو دیکھنے والے کا بھی جی نہیں

غرض قدیم یا جدید جس نظامِ اخلاق پر نظر ڈالی جائے اس میں اصولاً انسان کو مدنی الطبع تسلیم کیا گیا ہے اور کسی نہ کسی طرح یہ بات ضروری تسلیم کی گئی ہے کہ حیات انفرادی کی تکمیل سے زیادہ حیات اجتماعی کی تکمیل اہم، ضروری اور مفید ہے۔ اس لئے ہمارے فلسفہ اخلاق کو حیات اجتماعی ہی سے بحث ہونی چاہیئے۔

نظریہ اجتماع کا عملی ظہور

اس سلسلہ میں تمہیدی مباحث ختم کرنے سے پہلے ہمیں بھی ضرور دیکھنا چاہیئے کہ اس اجتماعی نظریہ کا عملی ظہور دنیائے واقعیت میں کس حد تک نظر آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے مخبوط الحواس آدمیوں کے باقی ہر شخص کی زندگی ایک اجتماعی شیرازہ میں بندھی ہوئی ہے۔ اس کے تمام افعال و اعمال ایک مرتب نظام جمعیت کے ماتحت واقع ہوتے ہیں اور وہ یوم

بقیہ حاشیہ صفحہ ہو سکتا ہے دوسرے یہ بات قارئین کرام میں سے ہر شخص پر واضح ہے کہ اسلام سے زیادہ دنیا کا کوئی مذہب اجتماعیت پر زور نہیں دیتا۔ انسان کو مدنی الطبع تسلیم کرتے ہوئے شریعت اسلامی نے اسے ایک اچھا شہری بنانے کے لئے جیسی سخت تاکیدیں کی ہیں کسی اور شریعت نے نہیں کیں۔ لا رہبانیۃ فی الاسلام کہہ کر اس نے تجرید و تنہائی کی مخالفت کی۔ ید اللہ علی الجماعۃ کہہ کر اس نے جماعت کی فضیلت ظاہر کی۔ نکاح کی تکمیل ایمان کے لئے ضروری قرار دے کر اس نے ہر متبع شریعت کے لئے لازم کر دیا کہ وہ عائلی زندگی اختیار کرے جو اجتماعیت کی بنیاد ہے۔ پھر دیکھو کہ اس نے عبادات میں جماعت کو اس قدر زیادہ اہمیت دی ہے کہ بعض عبادات کا تو سب سے زیادہ ضروری جز جماعت ہی ہے بغیر اس کے وہ عبادت ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً نماز جمعہ اور نماز عیدین غرض اسلام کے فلسفہ اخلاق پر اگر اچٹتی ہوئی نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بنیاد اجتماعیت پر رکھی گئی ہے، اور انفرادی فضائل بھی سب کے سب ایسے ہی ہیں جنہیں جماعت سے گہرا تعلق ہے۔ اگر فرصت ہوئی تو انشاءاللہ کسی صحبت میں اس موضوع پر بحث کی جائے گی۔

پیدائش سے لے کر لمحۂ وفات تک اسی نظم ونسق اور اسی پابندی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ نظام ہر شخص کو ایک سلسلہ میں باندھے ہوئے، ہر ذی عقل ہستی کا مطمح نظر اسی نظام میں پوشیدہ ہے اور اس کو اخلاقیات کی اصطلاح میں نظام اجتماعی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی بندشیں اتنی قوی اور عالمگیر ہیں کہ کوئی شخص اصلی معنوں میں آزادی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وحشی سے وحشی افراد بھی اجتماعی اصول کے دائرہ سے باہر نہیں جس قوم، نسل یا جماعت سے ان کا تعلق ہے اس کے رسوم و عادات کی بندھنوں میں وہ ضرور جکڑے ہوئے ہیں یہی اخلاقی فضا جس میں وہ رہتے ہیں ان کی خواہشوں کی اصل دنیا ہوتے ہیں اور سوائے اس صورت کے کہ ان کے دماغ میں کوئی فتور واقع ہو جائے اور کسی حالت میں وہ اس نسل یا جماعت سے اپنے تئیں الگ نہیں کر سکتے۔ نہ اس کے مقابلہ میں اپنی ذات کو کوئی مستقل بالذات ہستی تصور کر سکتے ہیں اور نہ اپنے اخلاق و عادات اس قوم کے اجتماعی اخلاق و عادات سے مختلف اختیار کر سکتے ہیں۔

یہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے کہ مل جیسا انفرادیت پسند بھی اس کو نہ صرف تسلیم کرتا بلکہ اس پر زور دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ "اجتماعیت اس قدر لازمی اور فطری شے ہے کہ بعض غیر معمولی حالات، یا عمداً راہب ہو جانے کے سوا، انسان جماعت سے اپنی ذات کے بالکل جدا ہو جانے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ نوع انسان عہد وحشت کی حیوانی زندگی سے جتنی دور ہو جاتی ہے" اتنا ہی یہ رشتہ مضبوط ہوتا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسانیت روز بروز اجتماعیت کی زیادہ محتاج وطلب گار ہوتی جاتی ہے۔ اس کے لئے جو چیز جتنی زیادہ ضروری ہے، فطرت انسانی اس کو حاصل کرنے کی اتنی ہی زیادہ کوشش کرتی ہے۔ اور افراد کے دماغوں میں یہ بات جاگزیں ہوتی جاتی ہے کہ وہ جماعت کا ایک لاینفک جزو ہے۔

مل کا یہ عقیدہ کامٹ سے ماخذ ہے مگر وہ اپنے فلسفہ سے اس عقیدہ کو اچھی طرح مطابق نہیں کر سکا جس کی وجہ سے اس مسئلہ کے اکثر گوشہ ہائے بحث و نظر بالکل تشنہ رہ گئے ہیں تاہم ان خیالات کے لئے اس کی کتاب "افادیت" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

وحدت اجتماعی:۔ جب ہم کسی گروہ کو ایک مذہب، ایک زبان، ایک قانون اور

قریب قریب ایک ہی فضائے ذہنی میں حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کی اس یگانگت و اتحادیت کے باعث اسے ایک جسم، ایک مشین اور ایک صاحب برگ و بار درخت سے مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ گروہ ایک متحدہ فضا میں زندگی بسر کر رہا ہے یہ صحیح ہے کہ اس یگانگت کے بعد بھی ان میں انفرادی امتیازات باقی رہتے ہیں اور افراد بحیثیت افراد کے اپنی فردیت کو کھو نہیں دیتے مگر اپنی جماعت کے رسوم و قوانین اور روابط و علائق میں وہ ایسے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اجتماعیت کا اثر انفرادیت پر پورا پورا غالب رہتا ہے اور اجتماعی قوتیں انفرادی حیات کی تعمیر و تخریب پر گہرے اثرات رکھتی ہیں۔

اسی بنا پر کچھ عرصہ سے اکثر علمائے اخلاقیات میں یہ خیال بہت عمومیت کے ساتھ پھیل گیا ہے کہ جماعت ایک عضوی وحدت ہے۔ اس خیال کا وسیع معنوں میں یہ مفہوم ہے کہ جس طرح کسی ذی حیات جسم کے اعضا میں مشترک زندگی کام کرتی ہے، اسی طرح کی مشترک مدنیت افراد کی زندگی میں بھی کارفرما ہوتی ہے، اس لئے جسم کی وحدت عضوی کی طرح جماعت بھی ایک وحدت اجتماعی ہے بعض علماء نے اس نظریہ کو تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور وہ انسانی جماعتوں کی ساخت کو حیوانی و نباتی اجسام کی ساخت سے مماثل بتلاتے ہیں چنانچہ اسپنسر نے اپنی اصول اجتماعیات میں اسے "عضویت اجتماعی" سے اور اسٹیفن نے اپنی کتاب حکمت اخلاقیہ میں نسیج اجتماعی شے سے اس کو تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ دونوں نے اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ اور دلچسپ مثالوں میں ظاہر کئے ہیں مگر حق یہ ہے کہ اسٹیفن نے جو طریقہ ادا اختیار کیا ہے وہ اسپنسر سے بڑھ گیا ہے۔ ایک طویل بیان کے بعد آخر میں وہ کہتا ہے کہ وحدت اجتماعی حیوانات کی وحدت عضوی کی طرح کوئی ایسی قائم و ثابت شے نہیں جو اشخاص و افراد کو باہم اس طرح وابستہ رکھتی ہو جیسے کسی جانور کے اعضاء باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ اس سے ایک معنوی وحدت مراد ہے۔

بہرحال سب کا مقصود صرف یہ ہے کہ شخصیت و انفرادیت کوئی شے نہیں اصل چیز اجتماعیت ہے جس کے مقابلہ میں شخصیت کے مستقل بالذات وجود کا تصور ہی ناممکن ہے اسی اجتماعیت پر افراد کی اخلاقی زندگی کا دارومدار ہے اور یہی اخلاقیات کی بنیاد ہے جو لوگ

اجتماعیت کے روابط سے علیحدہ ہو کر اپنے مستقل بالذات وجود کو جماعت سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں، ان کی اخلاقی روح مردہ ہوتی ہے کیونکہ انسانی زندگی جن رسوم، جن عقائد اور جن قوانین کی فضا میں نشوونما پاتی ہے وہ سب اجتماعیت ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ پس اخلاقی زندگی سے بحث کرتے وقت اشخاص و افراد کی زندگی کے بجائے جماعات کی زندگی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

اس مسئلہ پر بریڈلے، بلکنٹ، میور ہیڈ اور میکنزی نے بہت وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں تاہم اس مضمون کی آئندہ بحثوں میں ناظرین کو بعض مفید اشارات ملیں گے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ہر شخص کے دل میں فطرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اجتماعیت کو انفرادیت پر اس قدر ترجیح کیوں دی جاتی ہے، حالانکہ اجتماعیت کی عمارت انفرادیت ہی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اور جماعت، جماعت ہی اس وقت بنتی ہے جب افراد یکجا جمع ہوتے ہیں، پس جبکہ جماعت کے عناصر ترکیبی افراد ہیں تو کیا وجہ ہے کہ عناصر پر تو زور نہیں دیا جاتا ہے اور تمام تر توجہ ان کے مرکب پر صرف کر دی گئی ہے؟ اگر افراد، فرداً فرداً بداخلاق ہوں تو جماعت جو انہی سے مرکب ہے، کیونکر نیک اخلاق ہوگی اور اگر فرداً فرداً نیک اخلاق ہوں، تو جماعت کیسے بداخلاق ہو سکتی ہے؟ غور کرو تو اس کا جواب خود تمہیں مل جائے گا۔ بیشک جماعت کے عناصر ترکیبی افراد ہی ہیں اور افراد کے حسن و قبح ہی پر جماعت کے حسن و قبح کا انحصار ہے، مگر علم الاخلاق جو جماعت پر زور دیتا ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ افراد کوئی چیز نہیں بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے فرد بحیثیت فرد کوئی شے نہیں بلکہ اس کا وجود ایک جزوِ جماعت کی حیثیت سے معتبر ہے۔ فرد میں خلقِ حسن پیدا کرنے کے لئے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اپنے جماعت سے اچھے تعلقات رکھے اور جماعت کا ایک اچھا جز ثابت ہو اسی طرح ایک فرد کو برے اخلاق سے محفوظ رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ وہ

۔ جماعت کا برا جز نہ ثابت ہو اور ابنائے جماعت سے برے روابط نہ رکھے پس اگرچہ تعلق افراد ہی سے ہے مگر مقصود جماعت ہے اور افراد سے اسی لئے تعلق ہے کہ وہ جماعت کے اجزا ہیں۔ مثال کے طور پر دیوار کو لو وہ دراصل اینٹ چونے سے مرکب ہوتی ہے اور اس کی مضبوطی وخوبی کا انحصار اینٹ چونے ہی کی خوبی ومضبوطی پر ہے۔ مگر کبھی اینٹ کی مضبوطی کو اس لئے نہیں دیکھا جاتا کہ وہ بجائے خود مضبوط ہو بلکہ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دیوار کا ایک اچھا جزو بنے پس مقصود اینٹ کی مضبوطی نہیں ہوتی بلکہ دیوار کی مضبوطی ہے اور اینٹ سے جو کچھ بھی تعلق ہوتا ہے وہ دیوار ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعورِ انفرادی بذات خود نامکمل ہے اور اپنی تکمیل کے لئے اپنے سے کامل تر عالم کا محتاج ہے۔ اگرچہ اجتماعیت کے علاوہ ایک اور بھی ایسے ہی عالم کا تخیل ممکن ہے، اور اگر یہ بات ہمارے موضوع سے خارج نہ ہوتی تو ہم اس عالم کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کرتے، مگر ایسے عالم کا تخیل خواہ ممکن ہو یا نہ ہو، یہ بات بہرحال تسلیم کی جائیگی کہ تکمیلِ انفرادیت کے لئے واقعی اگر کوئی عالم ہے تو وہ عالم اجتماعی ہی ہے اور اگر یہ سچ ہے کہ جماعت سے الگ افراد کی کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے۔ اور ان کا نشو ونما تمام تر جماعت ہی کے اندر ہوتا ہے تو پھر جس طرح تم آئیڈیالسٹک مائنڈ کو ماننے پر مجبور ہو، کیونکہ جماعت کے بغیر آئیڈیالسٹک مائنڈ کا تحقق ناممکن ہے، ہمارے ارتقا کی لازمی راہ رابطۂ اجتماعی ہے اور اس سے الگ ہو کر ہم ہرگز اپنی تکمیل نہیں کر سکتے اور نہ اپنے مقاصدِ حیات میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

خاتمہ مباحثِ تمہیدی

ہرچند ابھی ان تمہیدی مباحث پر بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے، خصوصاً حقیقتِ نفس نفسِ اجتماعی اور نفسِ آفاقی، اور ان کے باہمی تعلقات پر گفتگو کرنی بہت ضروری ہے لیکن ان مباحث کو چھیڑنے سے مابعد الطبعیاتی مباحث بھی چھڑ جائیں گے جن پر سیر حاصل بحث

کرنے کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ہم ان مباحث کی تحقیق و تفتیش کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں، اور اگرچہ اخلاقی نصب العین کی کامل تحقیق کے لئے یہ بحثیں ضروری ہیں۔ مگر یہاں ناظرین کو صرف اسی پر قناعت کرنی چاہیئے کہ اخلاقی زندگی پر عام اجتماعی اثرات بہت زیادہ اہم اور قوی ہیں۔

احساس اخلاقی

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے بتلانا چاہیئے کہ احساسِ اخلاقی جسے اصطلاحِ اخلاق میں ضمیر سے تعبیر کرتے ہیں کیا شئے ہے؟ عام طور پر ضمیر اس اخلاقی قوت کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے برے اعمال پر ملامت کرتی اور ایسے برے اقدامات سے روکتی ہے اور اسی لئے اسے نفس لوامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اگر ضمیر کی حقیقت اور اس کی تخلیق کے مواد اساسی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کے ساتھ ایک ناصح کی صورت میں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتی ہے اور کھوٹے کھرے کو پرکھنے کے لئے اللہ کے ہاں سے انسان میں کسوٹی کے طور پر رکھ دی گئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ انسان کی جماعت کے خیالات عقائد اور رسوم کے اثرات سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص کسی ایسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے جس میں شراب پینا، چوری کرنا، جوا کھیلنا اور ایسے ہی دوسرے کام ثواب سمجھے جاتے ہیں تو اس کا ضمیر کبھی اسے ملامت نہیں کرے گا۔ مگر برخلاف اس کے جس شخص کی قوم میں انہیں برا سمجھا جاتا ہے وہ خواہ ان اعمال سے مجتنب نہ رہے۔ مگر وہ ایک ندامت اور اخلاقی تکلیف ضرور محسوس کرتا ہے۔ تم روز دیکھتے ہو کہ ایک ہندو گائے کاٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مگر ایک مسلمان اسے خوشی کے ساتھ کاٹتا اور کھاتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان سؤر کی صورت دیکھ کر لاحول پڑھتا ہے مگر ایک عیسائی کے نزدیک اس کا کھانا کوئی معیوب حرکت نہیں، وجہ صرف یہ ہے کہ ہندو کا ضمیر جس ماحول میں پیدا ہوا ہے وہ مسلمان سے مختلف ہے اور مسلمان کے ضمیر نے جس ماحول میں جنم لیا ہے وہ عیسائی سے متضاد۔ اسی لئے علمائے اخلاقیات نے تسلیم کیا ہے کہ ضمیر کی تشکیل میں اجتماعی ماحول کا بہت بڑا اثر ہے خصوصاً مل نے اپنی

مشہور کتاب "افادیت" میں تکالیف اخلاقیہ پر بحث کرتے ہوئے اس پر بہت توجہ صرف کی ہے۔ اسی طرح بریڈلے نے مباحث اخلاقیات میں اسٹیفن نے "اخلاقیات" میں، کلیفرڈ نے "اساس اخلاقیات" میں اور ڈیوی نے "خاکہ اخلاقیات" میں اس پر بہت وضاحت سے بحث کی ہے، مگر حق یہ ہے کہ ہیگل نے ضمیر کی حقیقت، اور اس کی تشکیل پر سب سے زیادہ تشفی بخش طریقہ سے بحث کی ہے یہاں گنجائش نہیں کہ ان تمام مباحث کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ اختصار کے ساتھ صرف اتنا بتلایا جاسکتا ہے کہ مسلمہ طور پر ضمیر اس احساس کو کہتے ہیں جو کسی اصول کی پابندی یا عام پابندی سے انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ اصول بعض اوقات انسان کے ذاتی بھی ہوتے ہیں اور انسان اکثر ان پر بیباکی کے ساتھ عمل بھی کرتا ہے مگر ان پر اجتماعیت کا اثر اتنا غالب ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی اجتماعی مسلمات کے خلاف اپنے ذاتی اصول کی پابندی میں کوئی عمل کرتا ہے تو خاص صورتوں کے سوا اس کا ضمیر خود مطمئن نہیں ہوتا مثلاً ایک شخص یہ اصول اختیار کرتا ہے کہ جب ذاتی ضروریات زیادہ ستائیں اور کسی جائز طریقہ سے انہیں پورا نہ کیا جاسکے۔ تو حسب ضرورت چوری کر لینی چاہیئے اور اس اصول کی پابندی میں وہ چوری کر لیتا ہے، تو اگرچہ وہ اپنے خیال کے مطابق ایسا کرنے کو مناسب حرکت سمجھتا ہے تاہم چونکہ اجتماعی مسلمات کی رُو سے چوری ایک اخلاقی جرم ہے اس لئے اس کا ضمیر اس پر مطمئن نہیں ہوتا اور وہ ایک قسم کی ندامت ضرور محسوس کرتا ہے پس معلوم ہوا کہ آدمی کا ضمیر اپنی قوم اور جماعت کے نظام اخلاق سے وابستہ ہوتا ہے۔

ضمیر نما احساس

اس احساسِ ضمیری کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جو کلیتاً اجتماعی ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ احساس انسان کے دلی اطمینان کے باوجود اس کو ندامت اور تکلیف پہنچاتا ہے، مثلاً ایک شخص اپنی سوسائٹی کی بیجا قیود و رسوم سے بیزار ہے اور ان کو اچھا نہیں سمجھتا لیکن اگر ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اپنے دل میں مطمئن ہونے کے باوجود

سوسائٹی میں کم و بیش ندامت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص میں کوئی جسمانی نقص (مثلاً یک قسمتی یا اور کوئی ایسا ہی عیب) ہو تو اگرچہ وہ یہ جانتا ہے کہ جسمانی نقائص کی اصلاح اس کے دائرہ قدرت سے باہر ہے، مگر پھر بھی وہ اس پر شرماتا ہے یہ احساس ضمیری احساس نہیں، کیونکہ اس میں انسان دلی اثر نہیں محسوس کرتا۔ مگر اسے اصطلاحاً ضمیر نما احساس کہا جا سکتا ہے اور یہ اکثر حالات میں خود ضمیری احساس سے بہت زیادہ قوی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم کسی کی غیبت کرتے ہو یا کسی کے مال میں خیانت کرتے ہو، تو باوجودیکہ یہ سخت اخلاقی جرم ہیں۔ مگر تمہیں ان پر ایک تھوڑی سی ندامت محسوس ہوتی ہے۔ جو کچھ دیر بعد زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی جلسہ میں تقریر کرتے وقت تمہاری زبان سے کوئی کلمہ غلط نکل جاتا ہے یا تم راستہ میں پھسل کر گر پڑتے ہو تو باوجودیکہ تم کو اپنی معذوری کا پورا یقین ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی تمہیں اتنی شرم آتی ہے کہ بعض اوقات کئی کئی دن تک اس کا خیال ستاتا رہتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اخلاقی احساس خواہ ضمیری ہو یا ضمیر نما محض اجتماعی اثرات سے پیدا ہوتا ہے اور اسی لئے جس احساس کے ساتھ اجتماعی تعلقات کا جتنا زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی وہ قوی ہوتا ہے۔

اخلاقیات میں اجتماعیت کو جو دخل حاصل ہے اسے اس حد تک بیان کرنے کے بعد اب ہم اصل موضوع پر بحث شروع کرتے ہیں مگر اس سے پہلے یہ اعتراف کر لینا ضروری ہے کہ ہم بحث تمام پہلوؤں پر ان صفحات میں محض ایک سرسری نظر ڈال سکیں گے کیونکہ اول تو اس وسیع موضوع کی تفصیلی بحث کے لئے ایک رسالہ کے صفحات کسی طرح گنجائش نہیں نکال سکتے۔ دوسرے تفصیلات میں پڑنے سے ہم اخلاقیات کی حدود سے آگے بڑھ کر سیاسیات اور فلسفہ اجتماع کی بحثوں پر پڑ جائیں گے جس کے لئے پہلے ان کے مبادی کا بیان ضروری ہوگا اور اس طرح کلام بہت طویل ہو جائے گا۔ اسی لئے تم دیکھو گے کہ ہم نے ہر جگہ اجمال سے کام لیا ہے اور صرف یہ کوشش کی ہے کہ تمہیں فلسفہ اخلاق سے ایک گونہ شناسائی ہو جائے۔

۲۔ نظامِ اخلاق

نظامِ اخلاق کیا شئے ہے؟ اس کو مختصراً یوں سمجھو کہ وہ ایک جماعت کے رسوم عادات، قوانین اور عقائد و خیالات کی ایک مجموعی ہیئت ہے جو اس جماعت کے ہر فرد پر حاوی ہوتی ہے۔ اس کو مدنیت سے ایک خاص علاقہ ہے۔ جو قوم مدنیت سے جتنی دور ہے اس کا نظامِ اخلاق اتنا ہی سادہ اور مختصر ہے اور جو قوم مدنیت میں جتنی بڑھی ہوئی ہے اس کا نظامِ اخلاق اتنا ہی وسیع اور پر تکلف ہے۔ اس کی تشکیل میں آب و ہوا، اس قوم کی جائے وقوع اور دوسری قوموں اور جماعتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا بھی بہت بڑا اثر ہوتا ہے کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو انسان کی صاف اور سادہ فطرت میں سب سے پہلے تصرف کرتی اور اسے کسی ایک رنگ میں رنگتی ہیں۔ مثلاً ایک قوم پہاڑوں میں رہتی ہے۔ جہاں کی آب و ہوا اسے قوی ہیکل بنا دیتی ہے اور جہاں کی پتھریلی اور غیر آباد سرزمین میں اس کے لئے ضروریات بہم پہنچانے کے سامان کم ہوتے ہیں لازمی طور پر اس کا نظامِ اخلاق وحشیانہ ہوگا اور وہ آس پاس کی سرسبز زمینوں کے رہنے والوں پر لوٹ مار کرکے روزی حاصل کرتے کرتے ایک قزاقانہ نظام کو پرورش کرے گی۔ اسی طرح ایک دوسری قوم کسی جزیرہ میں رہتی ہے جہاں سمندر اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے وہاں وہ اپنے دائرہ کو محدود پاکر سمندر کی وسیع دنیا کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جہاز بناتی ہے، سمندر میں نکل کھڑی ہوتی ہے، دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں کے حالات دیکھتی ہے ان سے اپنی ضروریات لیتی اور اپنے ملک کی چیزوں کا ان کو خریدار بناتی ہے اور اس طرح ایک تاجرانہ نظامِ اخلاق ان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے اور اسباب بھی ہیں جو ایک اخلاقی نظام کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔

اس نظامِ اخلاق کو افراد کی ذہنیت، ان کے نفس کی تکمیل اور ان کے عقائد و اعمال میں بہت بڑا دخل حاصل ہے اور چونکہ انسانی طبائع مختلف ہوتی ہیں کوئی ذہین ہوتا ہے اور کوئی غبی، کوئی نیک ہوتا ہے اور کوئی بد۔ اور قوی الارادہ ہوتا ہے اور کوئی ضعیف الارادہ

اس لئے توازن قائم نہیں رہتا اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت کے قوی افراد ضعیف افراد پر قابو پا جاتے ہیں ان کو اپنی خواہشات کا غلام بنا کر ان کے اخلاقی درجہ کو گرا دیتے ہیں۔ اور ان کے سے لیے اخلاقی ترقی اور تکمیل نفس کی راہوں کو مسدود کر کے جماعت میں ایک اخلاقی فساد پیدا کر دیتے ہیں علم الاخلاق کا مقصد یہ ہے کہ اس حالت کو درست کرے اور نظامِ اخلاق میں عدل قائم کرے۔

عادلانہ نظامِ اخلاق

ایسے نظام کو جو عدل کے اصول پر قائم کیا گیا ہو اخلاقیات کی اصطلاح میں عادلانہ نظامِ اخلاق کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایک ایسا نظام اجتماعی ہے جو بقدرِ امکان ہر شخص کو اپنی زندگی کی تکمیل اور نصب العین کے حصول میں مدد دے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر آزاد خود مختار لیکن ایک ہی کل کے پرزوں کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ، ایک دوسرے کا صحیح تمدنی صورت میں محتاج، مگر ہر قسم کی بیجا قیود اور پابندیوں سے محفوظ اپنے فرائض کی ادائیگی میں پورے شوق و محنت سے مصروف، اور اپنی محنتوں کے نتائج سے کامل طور پر بہرہ مند اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرنے کے لئے ہر شخص کی راہ کھلی ہو چھوٹے بڑے کی اس میں تمیز نہ ہو، امیر و غریب اور قوی و ضعیف کا امتیاز اٹھ جائے ضعیف قوی کا غلام نہ ہو اور طاقتور کمزور کو نہ کھا جائے۔ ایسے نظامِ اجتماعی کا تقاضہ یہ ہے کہ جو شخص راہ عدل سے تجاوز کرے اور اخلاقی فساد کا باعث ہو اس کا زور توڑ دیا جائے، اس کی پوری بیخ کنی کی جائے اور ہر با اخلاق و فرض شناس شہری کا فرض ہو کہ اس کی ناپاک ہستی سے جماعت کو پاک کر کے اجتماعی مفاد کی حفاظت کرے۔

یہی عادلانہ نظام وسعت اختیار کر کے بین الاقوامی عدل قائم کرتا ہے جس طرح اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک فرد یا افراد کسی فرد یا جماعت پر مستولی نہ ہونے پائے، اسی طرح اس کا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ ایک جماعت دوسری جماعت پر قابض ہو کر اس کی اخلاقی ترقی کو نہ روک دے۔ بلکہ علم الاخلاق اول الذکر کے مقابلہ میں موخر الذکر کو زیادہ اہمیت دیتا ہے

کیونکہ بین الافرادی فساد کے مقابلہ میں بین الاقوامی فساد زیادہ مہلک، خطرناک اور ہمہ گیر ہوتا ہے پس اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک قوم یا جماعت کی حکومت کسی دوسری قوم یا جماعت پر خواہ کیسی ہی منصفانہ اور مشفقانہ ہو۔ مگر وہ ایک بدترین اخلاقی مصیبت ہے جس کو دفع کرنا تمام اخلاقی فرائض سے زیادہ اہم و اقدام ہے۔ عادلانہ نظام کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قوم کے حسب دل خواہ ہو اور ہر قوم اپنے مفاد کو ترقی دینے اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے پورے ذرائع کو استعمال کرنے میں آزاد ہو اور ظاہر ہے کہ جب ایک دوسری قوم اس پر حاکم ہوگی تو خواہ وہ کتنی ہی نرمی و شفقت سے اس پر حکومت کرے، مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مفاد کے مقابلہ میں اس کے مفاد کو ترجیح دے۔ اور اس کے ذرائع کو اپنے نصب العین کے حصول پر صرف کرنے کے بجائے خود اس کے نصب العین کے حصول پر صرف کرے۔ اسی طرح یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ایک قوم یا جماعت جب ایک عرصہ تک کسی قوم یا جماعت کی حکومت میں رہتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کی اخلاقی ترقی رک کر وہ انحطاط کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ غلامی جو ایک بدترین اخلاقی بیماری ہے اس کے رگ و پے میں اثر کر جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر سے اعتماد علی النفس خودداری، بلند حوصلگی جیسی اخلاقی فضیلتیں نکل کر احتیاج غیر، دنائت، تسفل، اور ایسی ہی دوسری برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بجائے خود ایک قوم کے لئے شدید اخلاقی مصیبت ہے ظاہر ہے کہ علم الاخلاق انسانوں کی ایک پوری آبادی کو اس طرح درجۂ عزت سے گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ وہ برداشت کر سکتا ہے کہ ایک قوم کی قوم اخلاقی ترقی سے محروم ہو جائے اسی لئے وہ ایک جماعت پر دوسری جماعت کی حکومت کو دنیا میں سب سے بڑا گناہ قرار دیتا ہے ایسا گناہ کہ تمام اور ذمائم اخلاق کو اس سے کچھ نسبت نہیں بلکہ درحقیقت اس کے نزدیک یہ تمام اخلاقی گناہ ہونے کی جڑ ہے۔

پس جو جماعتیں اپنی کثرت کی وجہ سے چھوٹی جماعتوں کو، یا چھوٹی جماعتیں اپنی قوت کی وجہ سے بڑی جماعتوں کو غلام بنا کر ان کی ترقی و تکمیل کی قابلیتیں سلب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اس قابل نہیں کہ دنیا میں ان کو زندہ رہنے کا حق دیا

جائے۔ وہ دنیا میں برائی کو پھیلاتی ہے۔ اپنے اغراض و فوائد کے لئے اپنی ہی طرح کے دوسرے انسانوں کو بیجا طریقہ پر اپنا دست نگر بناتی ہیں، اپنے فوائد پر دوسروں کے فوائد کو قربان کرتی ہیں، دوسروں کی قوتوں اور قابلیتوں کو اپنی اغراض کا غلام بنا کر انہیں خود انہی کی محنت و مشقت کے فوائد سے محروم کرتی ہیں اور انسانیت کے ایک حصہ کو اپنے مقاصد کے لئے ذلت و خواری میں جبراً رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی قومیں تکمیل انسانیت کی راہ میں ایک روک ہیں اور بنی نوع انسانی کے حق میں شیطان سے زیادہ خطرناک، دنیا کے اخلاقی جسم میں ان کی حیثیت پھوڑے اور ناسور کی سی ہے اور ان کے وجود سے دنیا کو پاک کر دینا ایک بہترین اخلاقی خدمت ہے۔ ہر زمانہ کے مقدس اور پاک انسانوں کی بڑی کوشش یہ رہی ہے کہ اس قسم کے ظالمانہ نظاموں سے انسانی زندگی کو آزاد کر دیں۔ اور ہمیشہ وہ لوگ جو عملی اخلاق کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں، ان کا سب سے پہلا فرض یہ رہا ہے کہ اپنی پوری توجہ دنیا سے ظالمانہ نظاموں کے مٹانے پر صرف کریں۔ اخلاقِ عملی کی تکمیل، یا دوسرے الفاظ میں خود انسانیت کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ دنیا سے تمام ظالمانہ نظام اٹھ جائیں اور ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت کا طریقہ بالکل مٹا دیا جائے کیونکہ یہ بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے اور جب تک سرچشمہ بند نہیں ہوتا اس وقت تک بداخلاقی کے سیلاب کو کون روک سکتا ہے ؟

جماعت کی عادلانہ تنظیم

اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ آتا ہے کہ وہ کونسی عادلانہ تنظیم ہے جو جماعت میں نظام عدل کو قائم رکھ سکتی ہے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ بحث ہے اور ہم اس جگہ اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ تفصیلات اور فروعی بحثوں سے قطع نظر کر کے صرف اصول پر قناعت کریں ان مباحث پر جتنی صاف اور واضح بحث ارسطو و فلاطون نے کی ہے کسی اور نے نہیں کی۔ یہ دونوں جمہوریت اور اخلاق میں جو کچھ لکھ چکے ہیں وہ اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور زمانہ حال کے مصنفین مل، سج وک، اسٹیفن وغیرہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب اسی

کی تجدید، تفصیل اور تفریع ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ احوالِ حیات میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے۔ جو قانون ایک حالت میں مفید ہوتے ہیں اور دوسری حالت میں مضر ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے علمائے اخلاقیات کی رائے ہے کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سخت و قطعی قوانین کے بجائے علم و عمل سے فضائل حسنہ کو ترقی دینی چاہیئے۔ ڈاکٹر اسپنسر نے اپنی مشہور کتاب The Man verses State میں اس پر خوب بحث کی ہے۔ مگر ڈاکٹر بکنت کی تصریحات و توضیحات سب سے زیادہ قابل قدر ہیں جو اس نے Aspects of the Social Problem میں کی ہیں۔ اس کا قطعی فیصلہ ہے کہ قوانین حکومت مطلق العنان اور خود سر قوموں کی طرح امن پسند اور عاقل قوموں کے لئے بھی بیکار ہیں۔ اس لئے "قانونی جبر و اکراہ سے زیادہ موثر چیز سوشل قوانین و رسوم ہیں۔ جو ہر لحظہ سوسائٹی کے ہر فرد کو متاثر کرتے ہیں "تاہم قانون کے لئے ایک وسیع دائرہ باقی ہے۔ کیونکہ جماعتوں کی ترقی اور رائے عامہ کی تقلیت ہمیشہ بطی السیر ہوتی ہے اور ہر زمانہ میں ایسے لوگوں کی ایک کافی تعداد موجود رہتی ہے جن پر بغیر سزا اور قانونی دباؤ کے اثر نہیں ہوتا، اس کے علاوہ تعزیری قوانین کی ضرورت اکثر جاہل اور وحشی قوموں کے لئے ہوتی ہے۔ یا ان جماعتوں کے لئے جن پر دوسری جماعت کی حکومت ہو۔ پس اصول کہتا ہے کہ ایسی جماعتوں کے لئے جن کی اپنی حکومت ہو اور جن کا نظام اخلاق وحشت ـــ کے درجہ سے نکل گیا ہو تعزیری قوانین کی ضرورت نہیں۔ ان میں صرف ایسے قوانین ہونے چاہئیں جو محبت و الفت اور اخوت و برادری کے رشتوں کو زیادہ مضبوط کرنے والے ہوں۔ اور اگر کچھ تعزیری قوانین کسی ضرورت سے نافذ بھی کئے جائیں تو اس شرط کے ساتھ کہ ان کا مقصد پورا ہوتے ہی انہیں منسوخ کر دیا جائے۔

مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا جاتا، دنیا جس قدر آگے بڑھتی جاتی ہے اسی قدر ہر ملک میں قوانین کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ سینٹ پال نے یہودیوں کے مذہبی قانون کی نسبت کیسی پیاری بات کہی ہے کہ "وہ صحیح تک پہنچانے کے لئے صرف ایک راہنما تھا۔ یعنی جب جماعت نے اخلاقی نصب العین کے معنوں کو سمجھ لیا، تو پھر قانونی دباؤ کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ ان کا بدل دینا ضروری ہو گیا۔ قریب قریب یہی حال اور سب قانونوں کا ہے کہ جب جماعت حقیقی

آزادی کو پالیتی ہے تو یہ بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ صرف ابتداءً ناروا آزادی کی روک تھام کے لئے ان کا وجود ضروری ہوا کرتا ہے۔

یہ ایک عام بات ہے کہ لوگ اول اول جو باتیں خوف سے کرتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ عادت بن جاتی ہے اور پھر وہ اضطراراً کرنے لگتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ "پہلے قانون وجود میں آتا ہے پھر عادت بن جاتا ہے، پھر نیکی۔

۳ - اخلاقی قوانین اور اُن کی ماہیت

"قانون اور قواعد معاشری کا اصل کام افراد کے حقوق و فرائض کی تنظیم و ترتیب ہے یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں اور تمام تر اضافی ہیں۔ ہر حق اپنے ساتھ ایک فرض لاتا ہے۔ اور ہر فرض ایک حق کے لئے داعی ہوتا ہے اس کے صرف یہ سلبی معنی نہیں کہ ایک شخص جب کوئی حق رکھتا ہے تو دوسروں پر اس کی حرمت فرض ہو جاتی ہے بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو جب کوئی حق ملتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس حق کو جماعت کے فائدہ کے لئے استعمال کرے۔ قانون اور اخلاقی فرض کے درمیان تشابہ یا توارد واقع ہو جانے کی وجہ سے علی العموم لوگوں کا ذہن ان دقیق معنوں کی طرف رجوع نہیں ہوتا حقوق کے قیام میں عام طور پر قانون سے جو مدد لی جاتی ہے اس کے سلسلہ میں جن فرائض کی تعیین ہو جاتی ہے۔ لوگ انہی کو اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور ان فرائض سے بے خبر رہتے ہیں جنہیں قانون کے زور سے نہیں منوایا جاتا۔ حالانکہ دراصل اخلاقی فرض وہی ہیں اور قانون جن فرائض کی تعیین کرتا وہ صرف حدود اختیاری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص قانون کے ذریعہ کسی جائداد پر اپنا حق محفوظ کراتا ہے۔ اب قانون اس حق کے ساتھ اس پر صرف یہ فرض عائد کر سکتا ہے کہ وہ اپنے اس حق کے استعمال میں دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے اور اس بات کی تعریض اس کے دائرہ سے خارج ہوتی ہے کہ وہ اس جائداد کے فوائد کو حسب ضرورت اپنی ذات پر استعمال کرنے کے بعد زائد از ضرورت حصہ کو جماعت کے مفاد پر صرف کرے۔ کیونکہ قانون کا منشا صرف حقوق

اجتماعی کا تحفظ ہے۔ افراد کے فرائض کی تعیین نہیں، اور نہ یہ اخلاقی فرائض علم الاخلاق کے قانون میں اجباری ہیں پس لوگ اس غلط فہمی کی وجہ سے اخلاقی فرائض کو نہیں سمجھتے۔ اور اسی لئے دنیا میں یہ بات چل نکلی ہے کہ "آدمی کو اپنی چیز کا اختیار ہے جس طرح چاہے صرف کرے، کوئی شک نہیں کہ ہر شخص اپنی چیز کو خود اپنے اختیار سے صرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مگر اخلاق جو ہر جگہ اجتماعی فائدہ پیش نظر رکھتا ہے اس پہ یہ فرض عائد کرتا ہے کہ اپنی چیز کو حتی الامکان جماعت کے فائدہ پر صرف کرے۔

اب ذیل میں ہم بعض اہم حقوق اور فرائض پر کچھ لکھیں گے۔

زندہ رہنے کا حق

حقوق انسانی کی فہرست میں سب سے پہلا حق زندہ رہنے کا ہے، جو بنی نوع انسان کے ہر فرد کو بلا امتیاز حاصل ہے اگر حق زندگی کو تمام حقوق سے زیادہ اہم نہ قرار دیا جاتا یا اس کے احترام میں اتنی سختی نہ برتی جاتی تو شخصی زندگی ہر وقت معرض خطر میں رہتی اور رات دن اس کی قربانیوں کے واقعات پیش آتے رہتے اگرچہ جماعت کی تکمیل کے لئے بعض اوقات افراد کی قربانی بر حق بجانب ہوتی ہے کیونکہ جس نفس کی تکمیل مقصود ہے وہ اجتماعی ہے اور اگر کسی صورت میں اس کی تکمیل انفرادی قربانی پر منحصر ہو جائے تو وہ کی جا سکتی ہے مگر یہ ایک استثنائی صورت ہے اور انسانی جان کی حرمت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عمومی حیثیت سے شخصی زندگی کی بقا و تحفظ انسانیت کے لوازم میں سے ہے اور تمام انسانی حقوق کی فہرست میں اس کا سب سے زیادہ بلند اور اہم درجہ تسلیم کرنا انسانیت کا پہلا فرض ہے مگر باوجودیکہ قانون اخلاق اور اس حق کے احترام میں انتہائی سختی برتتا ہے، عام طور پر انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں کی جاتی۔ ایک شخص اپنی خواہش کے حصول میں اگر کسی کو سد راہ پاتا ہے تو اسے بے دریغ قتل کر دیتا ہے۔ ایک جماعت اگر اپنی بزرگی کو تسلیم کرانے یا اپنے فوائد کو قدرتی حدود سے آگے بڑھانے کے لئے ضروری سمجھتی ہے تو ہزاروں لاکھوں انسانی جانوں کا خون کر دیتی ہے، ایک قوم دوسری قوم کو اپنے منافع کی خاطر قہر کی نظروں سے دیکھتی

اور اس کا خون پینے کے لئے تیار رہتی ہے اور آج کل کی نام نہاد متمدن اقوام میں بھی یہ درندگی موجود ہے لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ایسی حالت خواہ متمدن قوموں میں ہو یا وحشی اقوام میں۔ اسے محض وحشت کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ایسی قوموں کے اخلاقی قوا پوری طرح نشو ونما پائے ہوئے نہیں ہوتے اور وہ تمدن کے نام سے نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہی ہوتی ہیں۔ بد قسمتی سے موجودہ زمانہ میں ایسی ہی جماعتوں کی کثرت اور بوجہ کثرت حکومت و فرمانروائی کی باگیں بھی انہی ہاتھوں میں ہیں اور ہر طرف سے آوازیں آرہی ہیں۔ کہ "صلح چاہتے ہو تو جنگ کرو" "امن چاہتے ہو تو تلوار اٹھاؤ" اور زندگی چاہتے ہو تو لڑنے مرنے کے لئے ہر وقت تیار رہو۔

اس حق کے ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ہر قوم کے شہریوں کا حقِ حیات اس وقت تک پوری طرح محفوظ و مامون نہیں ہو سکتا جب تک اس کے حصولِ معاش کے ذرائع بھی محفوظ و مامون نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر حقِ زندگی کے لئے استقلال محنت مستلزم ہے اس مسئلہ پر لوئی بلینک وغیرہ اشتراکی علماء نے بہت زور دیا ہے لیکن اس کا فیصلہ کہ اس قسم کے حقوق کو کس حد تک اور کن وسائل سے محفوظ کیا جا سکتا ہے، ان کے یا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس کا جواب سیاسیات و اقتصادیات کے علماء بھی نہیں دے سکتے درحقیقت اسکا انحصار نوع انسانی کے عملی فہم و احساس پر ہے۔

تمام اور حقوق کی طرح حقِ زندگی بھی اپنے ساتھ ایک فرض رکھتا ہے۔ اور یہ اپنی اور غیروں کی زندگی کا احترام ہے۔ جو شخص اپنی زندگی کا احترام نہیں کرتا اور خودکشی کرتا ہے وہ اخلاقاً سخت گنہگار ہے۔ اور جو شخص دوسرے کے حقِ زندگی میں دست اندازی کرتا ہے وہ اپنے حقِ حیات کو زائل کرتا ہے۔ وہ اس کا مستحق ہے کہ اسے بھی اسی طرح زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جائے احترام نفس قائم کرنے کیلئے یہ بات ضروری ہے اس میں رحم و درگزر کو دخل دینا عین بے رحمی ہے

حقِ آزادی

حقِ زندگی کے بعد دوسرا درجہ حقِ آزادی کا ہے چونکہ ہر شخص کو جماعتی زندگی میں اپنا

نصب العین تلاش کرنے اور اس کے حصول کی سعی کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی استعداد کے مطابق تکمیل نفس کی امکانی سعی نہیں کرسکتا۔ اس لئے آزادی یا حریت فکر و عمل ہر شخص کا حق ہے۔ حق زندگی کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس کے بغیر حق زندگی ایک قالب بے روح کی حیثیت رکھتا ہے اور اخلاق اس کو لوازم حیات انسانی میں سب سے اہم درجہ دیتا ہے۔ کوئی شخص نہ کسی شرط پر اس حق کو بیچنے کا مجاز ہے اور نہ کسی کو اس کے خریدنے کا حق۔[1]

یہی حق اجتماعی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ جس طرح ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ نظام جماعت کے اندر اپنے نصب العین کو تلاش کرنے کے لئے جو راہ چاہے آزادی کے ساتھ اختیار کرے اسی طرح ہر جماعت کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنے ارتقائے ذہنی و عملی کی تکمیل اور اپنے نصب العین کے حصول کے لئے تمام ممکن ذرائع کو استعمال کرنے میں آزاد ہو۔ اور کوئی قوت اس کو روکنے والی نہ ہو۔ علم الاخلاق انفرادی آزادی سے زیادہ اجتماعی آزادی کا احترام کرتا ہے۔ کیونکہ اجتماعی آزادی خود انفرادی آزادی کی اصل ہے۔ اور اگر وہ مفقود ہو تو افراد کی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے۔

مگر آزادی کبھی بے تعلقی اور عدم ارتباط کے معنی میں نہیں بولی جاتی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ

---

[1] ہیگل نے فلسفہ تاریخ کے مقدمہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں حق آزادی کے احترام کا اس وقت جو کچھ بھی احساس ہے اور خصوصاً عہد اصلاح کے بعد سے اس بارہ میں جس بلند آہنگی سے کام لیا جا رہا ہے۔ وہ سب عیسائی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر اصولی تعلیم سے قطع نظر کر کے صرف عملی نتائج کو دیکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت اپنی دو ہزار برس کی زندگی میں ایک دن بھی اس حق کو محفوظ کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی اور اس کا دامن شخصی آزادی کے خون سے اب تک تر ہے۔ برخلاف اس کے اسلام نے دنیا میں اس حق کے احترام کو قائم کیا اور اس نے انسانی امتیازات کو مٹا دیا۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کی حکومت کے طریقہ کی اصولاً و عملاً انتہائی مخالفت کی، اور آج دنیائے مغرب میں غلامی کے خلاف جو کچھ بھی چیخ پکار ہے۔ وہ اسی آواز کی صدائے بازگشت ہے جو عرب کے ریگستان سے اٹھی تھی، اس کا اعتراف چاہے یورپ کرے مگر حقائق کی دنیا میں یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ صرف اتنے ہی اشارے پر قناعت کی جاتی ہے۔

کہ ہر فرد جماعت کے نظام سے اور ہر جماعت بین الاقوامی نظام سے اپنے آپ کو قطعاً آزاد سمجھے اور دنیا کے تمدن نظام کو جو علائق و روابط پر مبنی ہے منتشر کرنے کی کوشش کرے۔ اگر آزادی کے یہی معنی ہوں تو سارا نظام عالم درہم و برہم ہو جائے۔ اسی لئے علمائے اخلاق ہر آزادی خواہ کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ خالص مطلق العنانی کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ وہ اپنے اصلی حق کو بھی کھو دے گا وہ حق آزادی کے معنی یہ قرار دیتا ہے کہ ہر شخص نظام جماعت کو قائم رکھتے ہوئے بغیر دوسروں کی آزادی میں خلل ڈالے ہوئے جہاں تک ممکن ہو اپنے شخصی اعمال اور اپنی زندگی کے اختیاری معاملات میں آزاد رہے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ اسی طرح اجتماعی آزادی کو بھی وہ دوسری جماعتوں کی آزادی اور بین الجماعتی تعلقات کی حرمت سے مشروط قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انفرادی آزادی کے لئے جماعتی نظام کی پابندی شرط ہے۔ اور اجتماعی آزادی کے لئے بین الاقوامی حقوق کی حرمت لازم۔ یہ وہ فرض ہے جو حق آزادی کے ساتھ ہر فرد اور ہر جماعت پر عائد ہوتا ہے۔

حقِ ملکیت

ان حقوق کے بعد حق ملکیت کا درجہ ہے اس کو آزادی کا قریب ایک جز سمجھنا چاہیئے۔ ہر مقصد کے لئے اسباب و وسائل ہوتے ہیں۔ جن کے بغیر اس کا حصول ناممکن ہوتا ہے اگر کسی شخص کو ان وسائل کا حق استعمال حاصل نہ ہو تو طلب مقصد کے لئے اس کی آزادی بےمعنی ہے۔ وسائل کی مقدار غیر محدود ہے اس لئے اس سوال کا حل کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے استعمال کو جماعت پر کیونکر تقسیم کیا جائے؟ اگر یہ وسائل صرف چند افراد کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں تو باقی افراد کا حق مارا جاتا ہے اور اگر سب پر مساوی تقسیم کئے جائیں تو علاوہ ناممکن ہونے کے یہ قانون فطرت کے خلاف ہے اور مساوات کسی حال میں قائم نہیں رہ سکتی مگر ہم اس عجیب اور مشکل مسئلہ پر ان صفحات میں کوئی بحث نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کا تعلق سیاسیات اقتصادیہ سے ہے یہاں صرف حق ملکیت کی اہمیت ہی پر زور دیا جا سکتا ہے اس حیثیت سے کہ وہ ارتقا حیات میں معین ہے۔

اس حق کے ساتھ جو فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ طور پر فلاح جماعت کے لئے استعمال کیا جائے۔ ہر چیز جماعت کی ملک ہے اور اس کو جماعت ہی کے فوائد کے لئے ہونا چاہیئے۔ انسان تعلیم و تمدن میں جتنی ترقی کرتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے اندر اس حق کو استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے فرض کو محسوس کرنے میں ایک بڑی حد تک کوتاہی کر رہا ہے خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص سوائے ان چیزوں کے جو اس کے وجود کے لئے لازمی ہیں اور کسی چیز کا حق نہیں رکھتا جیسا کہ ایک جرمن عالم اخلاقیات کہتا ہے۔ "کہ میں اس کے سوا اور کسی چیز کا مالک نہیں ہوں جو میں ہوں" قریب قریب یہی خیال افلاطون نے بھی ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ایک اعلےٰ نظام اجتماعی میں ہر چیز مشترک ہونی چاہیئے شخصی ملکیت کوئی شے نہیں ہے" مگر عملی سیاست میں اس اصول کا نبھنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے ہمیں اس دائرہ کو محدود کرنا پڑے گا اور صفائی کے ساتھ یہ حد بندی کرنی پڑے گی کہ ہر شخص اپنی ملکیت میں تصرف کا مختار ہے مگر اس کا فرض ہے کہ اپنی جائز و مناسب ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے بعد اس کے بقیہ فوائد کو جماعت پر خرچ کرے۔ ارسطو نے اس بارہ میں یہی مذہب اختیار کیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ :۔

"اعلیٰ نظام حکومت میں ہر شخص کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن اس حق کے ساتھ جماعت کی طرف سے اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے اور اس پر وہ اخلاقاً مجبور بھی ہے کہ اس میں سے صرف بقدر ضرورت خرچ کرے اور جو کچھ باقی رہے اسے جماعت کی صلاح و فلاح کے کاموں میں لگائے۔"

اگرچہ ایسی ملکیتوں میں جیسے زراعت ہے، یہ اصول بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے مگر ایک بڑی حد تک قابل عمل ہے۔

حقِ معاہدہ

اسی سلسلہ میں ایک اور حق ، حقِ معاہدہ ہے۔ تم کو یہ حاصل ہے کہ کسی شخص سے چند

شرطوں پر اسکی خدمت کرنے کا معاہدہ کرلو اور اسی طرح اس کو یہ حق حاصل ہے کہ تم سے اس معاہدہ کو پورا کرنے کا مطالبہ کرے۔ عہد وحشت میں جبکہ معاہدہ کا کچھ زیادہ دستور نہ تھا۔ یہ حق کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ مگر یوں جوں انسان تمدن کی طرف بڑھتا جاتا ہے اس میں معاہد کی عادت بڑھتی جاتی ہے اور معاملات کا سارا انحصار معاہدہ پر ہوگیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "جماعتیں طبعی حالت سے معاہدہ کی طرف جارہی ہیں"۔ یہ خیال اب اس قدر عام ہوگیا ہے کہ ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ "تمام انسانی تعلقات معاہدہ پر قائم ہیں اور حکومت کی بنیاد دراصل ایک اجتماعی معاہدہ ہے"۔ روسیو اور ہابس نے اس عقیدہ کی پُرزور حمایت کی ہے۔

مگر حقِ معاہدہ کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ ہمیشہ معاہدات ایسے ہوں جو جائز طور پر پورے کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص ایسا معاہدہ نہیں کرسکتا جس کی رو سے وہ اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دیتا ہو، اور نہ وہ ایسے معاہدہ کے ایفا پر مجبور ہے۔ کیونکہ غلامی جو بنائے معاہدہ ہے اخلاقاً ناجائز ہے۔

حقِ تعلیم

حقوق کی فہرست میں آخری مگر اہم درجہ تعلیم کا ہے۔ اس میں حقوق اور فرائض دونوں اس طرح جمع ہوگئے ہیں کہ تفریق مشکل ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق اپنے تئیں تعلیم دینے کا حق بھی رکھتا ہے اور یہ اس کا فرض بھی ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے جس کو ادا کرنا ہر شخص کا انسانی فرض ہے لیکن افسوس ہے کہ دنیا نے اس حق کو حاصل کرنے کی اب تک وہ کوشش نہیں کی جو کرنی چاہیئے۔ اور متمدن سے متمدن ملکوں میں بھی عامۃ الناس اعلےٰ تعلیم تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ ایک بہترین نظامِ حکومت کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس کے ماتحت ہر شخص اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ترقی دینے کے بہترین وسائل پر قادر ہو اور ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہے جو اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو۔ کیونکہ تکمیلِ نفس کے لئے یہ سب سے زیادہ لازمی چیز ہے۔

اب ہم اخلاقی فرائض سے بحث کریں گے۔

اخلاقی فرائض

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے مذہبی لٹریچر میں اخلاقی فرائض کے متعلق اوامر و نواہی نہ ملتے ہوں لیکن اخلاقیات میں فرق یہ ہے کہ وہ احکام قطعیہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ صرف لفظ "چاہیئے" یا "نہ چاہیئے" پر قناعت کرتا ہے وجہ ظاہر ہے کہ مذہب ایک تحکمی شان رکھتا ہے اور اخلاق محض تعلیمی "چاہیئے" کا لفظ اس تعلیمی شان کے لئے بہت موزونیت رکھتا ہے۔

شاید اوپر ہم کہیں بتا چکے ہیں کہ بعض ایسے متعین حقوق موجود ہیں جو اگرچہ ترمیم پذیر ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ تقرر پذیر ہوتے جاتے ہیں۔ یہ متعین حقوق اپنے ساتھ متعین فرائض بھی لاتے ہیں۔ جن کی صورت بالکل احکام کی سی ہوتی ہے۔ یہ فرائض صرف معروف و مسلم حقوق ہی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کے تمام شعائر اور اجتماعی تعلقات کی ہر صورت سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر فرض کے ساتھ ایک حق ہوتا ہے اور عموماً فرائض کی اصلیت حق ہی ہے مگر انسان فطرتاً ہر اس چیز کو اہمیت دینے کا عادی ہے جو فرض کے نام سے پکاری جائے۔ کیونکہ فرض میں حکمیت ہوتی ہے۔ اس لئے اخلاقی قوانین سے مراد اخلاقی فرائض و احکام ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ حقوق ایک لازمی شے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض احکام پیش کئے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان احکام کی حیثیت بھی بیان کی جاتی ہے۔

احترام حیات

اس سلسلہ میں پہلا فرض احترام حیات ہے جو بالکل حق حیات کے برابر ہے۔ اس کا منشا صرف یہی نہیں کہ دوسروں کی جان کا احترام کیا جائے بلکہ خود اپنی حیات کا احترام بھی واجب ہے۔ اور ایسے تمام افعال سے بچنا ضروری ہے جو اپنی یا دوسروں کی زندگی کو نقصان

پہنچانے والے ہوں۔

احترامِ آزادی

دوسرا فرض احترامِ آزادی کا ہے۔ جسے حقِ آزادی کے مقابل سمجھنا چاہیئے۔ یہ فرض ہم کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے اور ان کی آزادانہ ترقی میں دخل دینے سے روکتا ہے البتہ ایسے حالات میں وہ افراد کی حریتِ عمل سے تعرض کرنے کی اجازت دیتا ہے جبکہ وہ حریت خود انہی کی بقا کے لیے مضر ہو۔ یا دوسرے ابنائے جماعت کے حقوق میں صریح مداخلت کرتی ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص خودکشی کرتا ہو تو تم اسے جبراً روک سکتے ہو۔ کیونکہ اگرچہ وہ اپنے فعل کا مختار ہے مگر وہ اپنے اس اختیار کو ایک اہم اخلاقی فرض کی خلاف ورزی میں استعمال کر رہا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کے ہاں چوری کر رہا ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ اسے اس حرکت سے روکو کیونکہ وہ اپنے حدود سے تجاوز کر کے دوسروں کے حق میں صریح مداخلت کر رہا ہے۔ مگر ان استثنائی صورتوں سے اصل فرض پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

احترامِ سیرت

تیسرا فرض احترامِ سیرت کا ہے۔ اس میں اور مندرجہ بالا دونوں احکام میں یہ فرق ہے کہ یہ ایجابی حکم ہے اور وہ سلبی حکم تھے۔ یہ حکم ہم کو صرف ان چیزوں سے باز رہنے ہی کی ہدایت نہیں کرتا جو ہمارے ہمسایہ کے لیے باعثِ تکلیف ہیں۔ بلکہ وہ اس امر کی بھی ہدایت کرتا ہے کہ تابمقدور ہم ہر شخص کی اعانت کریں اور اسے جو مدد بھی پہنچا سکتے ہیں اس میں دریغ نہ کریں کسی نے خوب کہا ہے کہ ”اخلاقی فرائض اجباری نہیں بلکہ احساسی ہوتے ہیں“۔ ان چند لفظوں میں اس نے سارا فلسفۂ اخلاق بھر دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ انسان کے ایسے فرائض جن پر وہ مجبور کیا جا سکتا ہے بہت ہی کم ہیں لیکن ایسے فرائض جو احساس پر مبنی ہیں۔ ان کی تعداد ان گنت ہے۔ مثال کے طور پر دیکھو کہ اگر تم لوگوں

کے ساتھ معاملات درست رکھو کسی کے حقوق میں دست اندازی نہ کرو۔ اور جو حقوق و مطالبات تم پر قانوناً عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرتے رہو تو تم ایک بیباق زندگی بسر کروگے اور تمہارے اوپر کوئی قرض عائد نہ ہوگا۔ جسے ادا کرنے پر تم مجبور کئے جاسکو لیکن اگر تم محسوس کرو تو تمہارے ذمہ پھر بھی ایسے فرائض ہیں جنہیں ادا کئے بغیر تم انسانیت کی عام سطح سے بلند نہیں ہو سکتے۔ ہر معذور شخص جس پر تمہاری نظر پڑتی ہے اپنی معذوریت میں تمہیں یہ فرض یاد دلاتا ہے کہ اس کی اعانت تمہیں کرنی چاہیئے ہر ضرورت مند جب اپنی ضرورت تمہارے پاس لاتا ہے تو دراصل وہ تمہیں جتاتا ہے کہ اس کی مدد کرنا تم پر فرض ہے اور بنی نوع انسان کا ہر وہ فرد جو کسی مصیبت میں مبتلا ہے اپنی فلک زدگی کے ذریعہ تمہیں ایک اہم اخلاقی فرض کو ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ رہی ہو تو کوئی قانون تمہیں مجبور نہیں کرسکتا کہ اسے بجھانے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر تم میں تھوڑی سی بھی اخلاقی روح موجود ہو تو تم محسوس کروگے کہ اس شعلہ ساماں گھر کے مکینوں کی مدد کو پہنچنا تمہارا فرض ہے۔ احترام سیرت کے ایجابی پہلو سے بھی یہی مراد ہے تمہارا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے ہمسایہ شہریوں کو نہ ستاؤ، بلکہ تمہارا فرض یہ بھی ہے کہ جب وہ ستائے جائیں تو ان کی مدد کرو اور حتی الامکان ایسے امور میں حصہ لو جو تمہارے شہری بھائیوں کی فلاح بہبود کے لئے ضروری ہوں ہیگل نے کیسی اچھی بات کہی ہے کہ تم خود انسان بنو اور دوسروں کا بحیثیت انسان احترام کرو۔

احترامِ ملکیت:

یہ فرض احترام سیرت کا ایک جز اور اس کی ایک تفصیلی صورت ہے۔ لیکن اس کو خاص طور پر علیحدہ بیان کرنے سے مقصد بہ تاکید و صراحت اس امر کی ممانعت کرتا ہے کہ دوسروں کی فلاح و بہبود اور ترقی و آسایش کے اسباب و وسائل سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو خواہ وہ وسائل مادی ہوں یا غیر مادی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنی شخصیت کی بقا اور اس کی ترقی کے لئے اسباب کا محتاج ہے اور وہ اسباب جو وہ خود اپنی کوشش

سے پیدا کرتا ہے، یا اس کو وراثتاً حاصل ہوتے ہیں، اس کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس کی ذاتی ملکیت میں دخل دینا ایک ناجائز حرکت ہے، جس سے اجتناب ہر شخص کا فرض ہے۔ تھوڑی وسعت نظر سے کام لو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس فرض کے مختلف پہلو ہیں جو بادی النظر میں معلوم نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خود اپنی ذاتی ملکیت کا بھی احترام کرنا چاہیئے کیونکہ اس کا ناجائز استعمال حق ملکیت کو زائل کرتا ہے اسی طرح ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی فرد کاہلی و بیکاری کی زندگی بسر نہ کرے۔ کیونکہ جو لوگ بیکار زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کی کمائی پر اپنا پیٹ پالتے ہیں وہ درحقیقت دوسروں کے نتائج محنت سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ملکیت غیر میں کسی نہ کسی صورت سے تصرف کے اخلاقی مجرم ہیں۔

احترام آئین

یہ فرض ایک وسیع دائرہ رکھتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی کے مقررہ آئین و قوانین کا احترام کیا جائے خاندانی رسم و رواج اگر درجۂ اخلاق سے گرے ہوئے نہ ہوں، اور کسی حیثیت سے مفاد اجتماعی و انفرادی کے لئے مضر نہ ہوں۔ ان کی پابندی کی جائے، قومی شعائر و رسوم کی خلاف ورزی سے پرہیز اور ان کی بجاآوری کی کوشش کی جائے، جائز طریقہ سے جو حکومت ملک میں قائم ہو اس کے قوانین کی اطاعت کی جائے۔ جس جماعت سے کاروباری تعلق ہو اس کے مقررہ طریقوں اور قاعدوں کا احترام کیا جائے۔ غرض یہ کہ یہ فرض انسان کو ایک آئین پسند اور باقاعدہ شہری بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو لوگ اجتماعی آئین کی پابندی نہیں کرتے وہ اس فرض کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اس طرح ایک اخلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی کے کامیاب رکن بننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ہر شخص جماعت کا ممبر ہونے کی حیثیت سے مجبور ہے کہ اپنی جماعت کے آئین و قوانین کی پابندی کرے۔ کیونکہ اگر وہ اس کی پابندی نہ کرے گا تو جماعت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور فساد و خودسری کے جراثیم تشتت و تفرق

کا عالم پیدا کر دیں گے جو ہر جماعت کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالی دماغ افراد اکثر اپنی جماعت کی فضول اور غلط رسموں کی بھی پابندی کرتے ہیں اور ان کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ایک دم ان کی خلاف ورزی نہیں کرتے[1]

مگر اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ یہ حکم حق انقلاب یا حق اصلاح یا حریت فکر و رائے کے حق کو سلب کرتا ہے نہیں اس حکم کے باوجود ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ جب جماعت کو کسی غلط نظام پر چلتے ہوئے دیکھے یا اسے اندیشہ ہو کہ جماعت کسی تباہ کن راستہ پر جا رہی ہے تو وہ

---

[1] اخلاقی رسوم و آداب دراصل اجتماعی زندگی کا ایک اہم جزو ہیں ہر جماعت میں اخلاقی فرائض کے ساتھ ایسے قواعد مقرر پائے جاتے ہیں جو اگرچہ رتبہ میں کم ہوتے ہیں لیکن عام اجتماعی زندگی میں ان کو بہت اہمیت اور اعتبار حاصل ہوتا ہے مثلاً آداب نشست و برخاست، تہذیب اکل و شرب وغیرہ۔ اسی طرح خاص خاص پیشوں کے خاص خاص آداب ہوتے ہیں جیسے دوکاندار کا خریداروں سے، وکیل کا موکلوں سے، ڈاکٹروں کا مریضوں سے اور کارخانہ دار کا صناعوں سے۔ اسکے علاوہ ہر ملک میں شادی بیاہ، مرنے جینے وغیرہ معاشرتی امور کیلئے بھی جدا جدا رسمیں ہوتی ہیں۔ عام انقلاب پسند طبیعتیں ان رسوم و قواعد کو اکثر بری نظر سے دیکھتی ہیں، اور بعض واقعی مضحکہ انگیز ہوتی ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان رسموں کو بالکل بیکار اور لغو سمجھنا بھی غلطی ہے۔ ہر رسم اپنی اصلیت میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مقصد رکھتی ہے اور اگر اسکی پابندی میں کوئی ایسی انتہائی سختی نہ برتی جائے جو بیجا تکلیف کا باعث ہو تو ہمارے خیال میں ان پر عمل کرنا مستحسن ہے۔ شلر نے اپنے مشہور ڈرامے Walenstion میں خوب کہا ہے کہ۔

رسمی قوانین کا ہم کو مذاق نہیں اڑانا چاہیئے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو جماعت کو کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچانے کے لئے جاری کی گئی ہیں اور مختلف حیثیات سے جماعت کے لئے مفید ہوتی ہیں بعض رسمیں ایسی بھی ہیں جن کی پابندی سے انفرادی ہیجانات دب جاتے ہیں۔

مگر ان کو ایک اعتدالی حالت پر لانا ضروری ہے رسوم کی شدت کے ساتھ پابندی کرنا اور ان سے قطعی بے پروائی برتنا دونوں اپنی اپنی جگہ غلط ہیں جو رسمیں ارتقائے جماعت یا قوم کی اخلاقی حالت کے لئے مضر ہیں انہیں قطعاً توڑ دینا چاہیئے۔ جن رسموں کا سیرت و کردار پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں پڑتا ان (بقیہ

پوری بلند آہنگی کے ساتھ اسے متنبہ کرے، نظام جماعت کی اصلاح کے لئے اپنی ساری قوتیں صرف کر دے اور اس حالت کو بدلنے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس حق انقلاب واصلاح کو استعمال کرنے میں قدرت کے صحیح تدریجی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے یعنی نظام جماعت میں کسی فوری تغیر کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ رفتہ رفتہ جماعت کو اصلاح کی طرف مائل کرنا چاہیئے۔

احترامِ صداقت

عام طور پر اس سے دو معنی مراد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قول اور نیت ایک ہو، دوسرے یہ کہ قول اور فعل ایک ہو۔ ان دونوں میں ایک نازک مگر بین فرق ہے اول الذکر کا منشا یہ ہے کہ ہمیں وہی بات کرنی چاہیئے جو ہمارے دل میں ہو یعنے بادل نخواستہ کوئی بات نہ کہیں، اور آخر الذکر کا مقصد یہ ہے کہ ہم زبان سے جو کچھ کہیں اس پر عمل بھی کریں۔ لیکن درحقیقت اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں متحد ہوں۔ ہماری زبان سے کوئی بات ایسی نہ نکلے جو ہمارے دل میں نہ ہو۔ اور جس پر ہم عمل کے لئے طیار نہ ہوں۔ صحیح معنوں میں صداقت کا احترام یہی ہے کسی مجبوری سے کوئی بات زبان سے نہ نکالنا اور اس پر عمل نہ کرنا یا عمل بھی مجبوری سے کرنا اس حال میں کہ نیت اس سے متفق نہیں احترام صداقت سے خارج ہے اسی طرح یہ بات کہ زبان سے جو کچھ نکل گیا یا مصلحۃً نکالا گیا اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے احترام صداقت کے درجہ سے گری ہوئی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی نیت کا اتحاد نہیں ہے۔

احترامِ ترقی:۔ اس حکم کا منشا یہ ہے کہ جماعت کا ہر فرد تا بمقدور اجتماعی ترقی اور بنی نوع

بقیہ حاشیہ صـــ کی حتی الامکان پابندی کرنی چاہیئے مگر اس طرح کہ کوئی ان کو فریضہ مذہبی سمجھ کر بیجا تکلف نہ کرے اور جو رسمیں جماعت کے لئے مفید ہیں ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں وہ معیار جس پر اجتماعی رسوم کو جانچنا چاہیئے ارتقائے جماعت ہے جس رسم کو اس سے جیسا تعلق ہو ویسے ہی برتاؤ کی مستحق ہے

انسان کی فلاح میں سعی کرے اور جو خدمت وہ کر سکتا ہو اس میں دریغ نہ کرے دراصل یہ حکم سچی خدا پرستی پر مبنی ہے اور اس لئے بہت قابل تعظیم ہے خدا کی محبت جس انسان کے دل میں صحیح طور پر جاگزیں ہو اس کے لئے عملی عبادت یہ ہے کہ وہ خلق اللہ کی بھلائی اور بہتری میں اپنی ساری امکانی قوتیں صرف کردے کیونکہ خلق اللہ کی خدمت دراصل عین اللہ کی خدمت ہے اس اعتبار سے احترام ترقی کا درجہ کسی طرح زاہدان شب زندہ دار کی عبادت و ریاضت سے کم نہیں [illegible] اخلاقیات کے مجموعہ فرائض میں یہ سب سے آخری اور سب سے بڑا ایجابی حکم ہے۔ اور اس کی رو سے انسان انتہائی اخلاقی مدارج تک صرف اسی طرح پہنچ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کلیتہً جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردے۔

مباحث گذشتہ پر ایک نظر

مندرجہ بالا احکام و فرائض کو ہم نے ترتیب و تنظیم کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ ان میں باہم کیا تعلق ہے، یہ کچھ ہماری کوتاہی نہیں۔ بلکہ درحقیقت ان کا کوئی کامل نظام ہی نہیں بن سکتا اور نہ یہ تعین ہو سکتی ہے کہ تعلق کے لحاظ سے کون مقدم ہے اور کون موخر۔ اجتماعی زندگی اور اس کے ارتقا کے لئے یہ سب لوازم ہیں۔ کوئی فرض ایسا نہیں جو ضروری نہ ہو یا جس کی اہمیت کسی دوسرے فرض سے کم ہو۔ جو اہمیت احترام حریت کی ہے وہی اہمیت احترام ملکیت کی بھی ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے جس طرح حق حیات ضروری ہے اسی طرح حق حریت بھی ضروری ہے یہی حال ان کے باہمی تعلق کا ہے۔ ہر حق اور فرض دوسرے حق اور فرض سے اس طرح متعلق ہے جس طرح نظام شمسی کے سیارے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ فرائض و حقوق حیات اجتماعی کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں جس طرح تمام سیارے آفتاب کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

فرائض وحقوق کا تصادم

یہ فرائض وحقوق بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم بھی ہو جاتے ہیں ۔ اس تصادم کو یوں سمجھو کہ ایک شخص اپنے دشمن کو قتل کرنے کے لیئے تلوار خریدتا ہے اور اُسے اس کی تلاش میں لیئے پھرتا ہے تمہیں اس کی خبر لگتی ہے کہ اس کا ارادہ قتل کا ہے اور اس سے اُسے باز رکھنے کے لیئے تم اس کی تلوار چھین لیتے ہو۔ تمہاری یہ حرکت اگرچہ احترام ملکیت کے خلاف ہے کیونکہ تلوار اس کی ملک تھی اور اسے رکھنے کا اسے حق تھا۔ مگر احترام حیات کا عین منشا یہی ہے جو تم نے کیا۔ کیونکہ وہ شخص اپنے حدود سے تجاوز کر کے دوسرے کے حق میں دست اندازی کرنا چاہتا تھا۔ اور اس سے روکنا تمہارا اخلاقی فرض تھا۔ اس تصادم کے لیئے کوئی تفصیلی قانون نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ ان کو کسی ایک دائرہ میں لا کر حد بندی کرنا مشکل ہے البتہ اس کو صحیح طریقوں پر لانے کا ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ افراد میں اتنی قوت فیصلہ پیدا کی جائے کہ وہ خود اس کے حدود متعین کر سکیں کہ کس جگہ ان کا اخلاقی فرض انہیں کسی کے حق میں دخل دینے کی اجازت دیتا ہے اور کس جگہ نہیں ۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ بعض علمائے اخلاقیات نے اس کی حد بندی کرنے کا قصد بھی کیا ہے اور کچھ حدود قائم کیئے ہیں۔ مگر وہ اس میں سخت غلطیاں کر گئے ہیں۔ ان کے قائم کردہ حدود پر اگر عمل کیا جائے تو بعض اوقات ایک آدمی ناجائز سے ناجائز افعال کو بھی جائز سمجھ کر کر سکتا ہے اور کبھی وہ اپنے آپ کو ایسے قواعد سے جکڑا ہوا پاتا ہے کہ کوئی کام بغیر قانون کی رہنمائی کے نہیں کر سکتا۔ ایسی افراط وتفریط اخلاقیات میں کسی طرح جگہ نہیں پا سکتی

افراط وتفریط سے بچنے کا صحیح طریقہ

اس افراط وتفریط سے بچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جماعت اس بنیادی قانون کی طرف رجوع کرے ۔ جو جزئی احکام کی نسبت ایک قاعدہ کلیہ بتا دیتا ہے اور جس کی رو سے اجمالاً تصادم کی حد بندی ہو جاتی ہے یہ بنیادی قانون نفس عاقلہ کا تحقق ہے۔ جس کے ذریعے افراد جماعت

فرائض و حقوق کے تصادم سے بچ سکتے ہیں اور یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم کو کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اسی غرض سے ہم نے بار بار جماعت کے نفس عاقلہ کی تکمیل پر زور دیا ہے اور ان تمام باتوں کو جو افراد کے لیے صحیح اخلاقی ضابطہ بندی سے تعلق رکھتی ہیں نفس عاقلہ اجتماعی کی تکمیل پر منحصر قرار دیا ہے۔ جن قوموں کا اجتماعی نفس عاقلہ ترقی پا جاتا ہے وہ اخلاقی لغزشوں اور گمراہی کے اندیشوں سے بچ جاتی ہیں۔

اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ تکمیل نفس اجتماعی کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب صرف ایک لفظ سے دیا جا سکتا ہے یعنی "تعلیم" جماعت کا ایک فرد بھی ایسا باقی نہ رہے جو صحیح تربیتی اصولوں پر تعلیم سے بے بہرہ ہو۔ اس کے بغیر جماعت کا نفس عاقلہ کسی طرح بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور جب وہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ تو افراط تفریط سے بچنا بھی محال ہے۔

بس افراط و تفریط سے بچنا اور افراد کے لیے ان کے حدود عمل کا متعین ہو جانا نفس عاقلہ کی تکمیل پر منحصر ہے اور نفس عاقلہ کی تکمیل کے لیے صحیح تعلیم و تربیت لازم۔

فرائض کی تقسیم:

چند کلمات تقسیم فرائض کے متعلق بھی عرض کرنے ضروری ہیں علمائے اخلاقیات نے فرائض و واجبات کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے ایک قسم محدود و متعین فرائض کی ہے اور دوسری قسم غیر محدود اور غیر متعین فرائض کی۔ وہ امور جن کی تحدید نہیں ہو سکتی نیکی یا فضائل کہلاتے ہیں اسکی تشریح یہ کہ جو شخص اجباری فرائض کو ادا کرتا ہے وہ محض ادائے فرض کرتا ہے اور جو اس سے آگے بڑھ کر کوئی احساسی فرض ادا کرتا ہے وہ نیکی اور فضیلت کا کام کرتا ہے الگزنڈر نے Moral Order and Progress میں نیکی کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "ہر وہ کام جو فرض سے زیادہ ہے نیکی ہے۔

مل اس دوسری قسم کے فرائض کو فرائض کہنے کے بجائے "اخلاقی فضائل" سے تعبیر کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور فرائض کو عدالت کے ماتحت قرار دیتا ہے چنانچہ اپنی مشہور کتاب Utilitarianism میں فرائض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

"فرائض کے علاوہ چند اور اخلاقی فضائل بھی ہیں جو اگرچہ اخلاقاً فرض نہیں کیے گئے مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے خوگر ہوں۔ اور جب وہ اس کے خوگر ہوتے ہیں۔ تو ہم ان کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسے فضائل پر ہم کسی کو مجبور بھی نہیں کر سکتے۔

ایک دوسری تقسیم

مشہور فلسفی کینٹ نے اس کے علاوہ ایک اور تقسیم بھی کی ہے وہ فرائض کو دو قسموں پر منقسم کرتا ہے، ایک فرائض تامہ اور دوسرے فرائض ناقصہ۔ فرائض تامہ سے اس کی مراد وہ فرائض ہیں جن کا ہم سے قطعیت کے ساتھ مطالبہ کیا جا سکے۔ جیسے احترام ملکیت، احترام حیات اور احترام حریت وغیرہ۔ اور فرائض ناقصہ وہ ایسے فرائض کو کہتا ہے جو قطعیت کے ساتھ طلب نہ کیے جا سکیں۔ مثلاً قومی خدمت، اول الذکر عموماً سلبی ہوتے ہیں اور آخر الذکر کلیتہً ایجابی۔ مگر اس نظریہ کے مطابق فرائض کو دو قسموں کے بجائے تین قسموں پر تقسیم کرنا چاہیئے فرائض قطعیہ، فرائض اجتماعیہ اور فرائض انفرادیہ۔ آدم سمتھ نے اپنی کتاب Theory of Moral Sentiments میں اس پر خوب بحث کی ہے۔ اس کے نزدیک فرائضِ قطعیہ وہ ہیں جو وایسی حکومت کی صورت میں نافذ کیے جا سکتے ہیں، فرائض اجتماعی وہ جن کی ہر متمدن جماعت سے توقع کی جاتی ہے اور فرائض انفرادیہ وہ جو ہر اچھے شہری سے اخلاقاً طلب کیے جا سکتے ہیں۔

فرائضِ قطعیہ کا قانون

لیکن اس تقسیم کے مطابق جزئیات کی تفصیل و تعین کے ساتھ کوئی دوامی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ فرائض میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور جو فرائض محدود قانون میں آ سکتے ہیں وہ وقتاً فوقتاً رعایا کے مدارج تمدنی اور حکومت کے نظام کے ساتھ گھٹتے بڑھتے اور بدلتے رہتے ہیں ایک وقت میں ایک مقام کے خاص حالات کے مطابق کوئی قانون بنایا جا سکتا

ہے، مگر وہ قانون تغیر حالات کا ہمیشہ تابع رہے گا۔ میگی اپنی کتاب فلسفۂ صواب میں کہتا ہے کہ:-

”کوئی ضابطۂ اخلاق مکمل نہیں ہو سکتا“ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر ضابطۂ اخلاق اپنی مدت ختم کر کے بیکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نیا ضابطہ تیار ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر ضابطہ میں تغیر حالات کے لحاظ سے گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہود کے احکام عشرہ کوئی دائمی قانون نہیں ہیں۔ مگر اس سے ہمارا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ ”قتل نہ کرو“ کا حکم بھی عارضی ہے۔ ہر موٹی سے موٹی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ خزاں کے بعد جب درخت میں نئی ٹہنیاں نکلتی ہیں تو اصل درخت نہیں بدل جاتا۔ بلکہ پچھلی شاخوں اور پتوں کے بجائے دوسری شاخیں اور پتے آجاتے ہیں۔

پس یہ ایک فیصلہ شدہ امر ہے کہ ہر زمانہ اور حالت کے مطابق ”فرائض قطعیہ کا جامع اور فرائض اجتماعیہ کا مختصر قانون بنانا ایک عمدہ نظام حکومت کا سب سے اہم فرض ہے۔

فرائضِ اجتماعیہ وانفرادیہ

ہم نے کہا کہ فرائضِ اجتماعیہ کا قانون مختصر بنانا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی فرائض کو کسی حالت میں بھی ایک جامع قانون کے ماتحت نہیں لایا جا سکتا۔ کیونکہ یہ نہ صرف اصولاً ناممکن ہے بلکہ حکومت کے دائرہ سے بھی خارج ہے۔ اجتماعی زندگی کے بیسیوں معاملات ایسے ہیں جن میں اگر حکومت دخل دے تو نظام درہم برہم ہو جائے اور ایک سخت انتشار و ہیجان پیدا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ ہم نے فرائضِ انفرادیہ کو ”تدوینِ قانون کے دائرے سے الگ کر دیا ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا بھی کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ ان دونوں فرائض کے لئے جماعت اور افراد کو ان ہی کے عقل و فہم اور جذبات و احساسات پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اخلاقیات کا کام اس سے زیادہ نہیں کہ وہ انہیں اصول بتلا دے۔ فروع کو ڈھونڈنا خود انسان کا کام ہے کیونکہ فطرت نے اس کو قوت امتیاز و ادراک اسی لئے دی ہے کہ وہ اپنے لئے اچھی بری راہ خود ڈھونڈھ لے۔ علم کا کام اس میں محض ایک روشنی پیدا کرنا اور

اس کے قوائے عقلیہ میں ایک خاص صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اب یہ خود انسان کا فرض ہے کہ اس روشنی میں اپنے دائرہ عمل کی تحدید اپنے فرائض کی تعیین اور اپنے لئے راہِ عمل کی تجویز کرے۔

۴۔ محاسنِ اخلاق

پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اخلاقی فرائض سے متعلق تھا اور اس میں ہم نے اختصار کے ساتھ یہ بتلانے کی کوشش کی تھی کہ انسانی فرائض کیا کیا ہیں اور ان میں باہم کیا تعلق ہے؟ اب ہمیں واجبات کے دائرہ سے نکل کر عادات و خصائل کے دائرہ میں آنا چاہیئے اور تحقیق کرنا چاہیئے کہ اخلاق ہم میں کن خصلتوں کو دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے نزدیک ایک بہترین انسان کی صفات خلقیہ کیا ہونی چاہیئے۔ ایسی اعلیٰ صفات کو اخلاقیات کی اصطلاح میں محاسن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ محاسن دراصل فضائلِ اخلاق کا سرچشمہ ہیں، کیونکہ جب نفس ارادی اعمال کا محرک اصلی ہے تو ضرور ہے کہ اس کی اچھائی اور برائی پر اعمال کی اچھائی اور برائی موقوف ہو اگر نفس محاسن اخلاق سے متصف ہوگا تو اعمال بھی ضرور نیک ہوں گے اور اگر خود ہی رذائل سے آلودہ ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ عمل جو اس کے تابع ہے بہتر ہو پس ایک اخلاقی اسٹوڈنٹ کا یہ ایک دلچسپ کام ہے کہ وہ اس سرچشمہ کی تلاش کرے۔

حسنِ اخلاق کیا ہے؟

ارسطو نے کہا ہے کہ محاسن دانستہ اختیارِ افعال کے ملکہ نفسانی کی پیداوار ہیں یعنی صاحب اخلاق حسنہ وہ شخص ہے جس نے اپنی سیرت میں راہ صائب کے اختیار کا ملکہ پیدا کیا ہو۔ اور چونکہ راہ صائب افراط و تفریط کے وسط میں ہوتی ہے اس لئے وہ یہ نتیجہ مستنبط کرتا ہے کہ حسن خلق دراصل اختیار توسط کا نام ہے مگر صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ حسن خلق اختیار توسط کا نام ہے بلکہ اس پر یہ مزید قید لگانی چاہیئے کہ وہ وسط اوسط اعتباری ہے، ہر شخص کے ذاتی حالات اور اس کے اخلاقی ماحول کے اعتبار سے اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے، قطعیت کے ساتھ اس کی تحدید نہیں کی جا

سکتی۔ مثلاً سخاوت ایک حسن اخلاقی ہے جو اسراف و تبذیر اور بخل کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کو اتنا خرچ کرنا چاہیئے۔ اتنا اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ اتنا خرچ کرنے والا مسرف ہے اور اتنا نہ کرنے والا بخیل۔ کیونکہ ہر شخص کے حالات جدا ہیں اور بخل، اسراف کا حکم انہی حالات کے مطابق لگایا جا سکتا ہے۔ ایک شخص جس کی پونجی صرف پانچ روپے کی ہے اگر وہ اپنے ان روپوں کو جگا جگا کر خرچ کرتا ہے تو کوئی شخص اسے بخیل نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر ایک دوسرا شخص جو ہزار روپیہ کی استطاعت رکھتا ہے پانچ روپے والے آدمی کی طرح اس کی نظر پیسہ پیسہ پر رہتی ہے تو ہم اسے کنجوس اور بخیل کہتے ہیں پس معلوم ہوا کہ یہ اوسط حالات کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے نہ کہ قطعیت کے ساتھ۔

تغیرِ حالات کا اثر

اس کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو محاسن کی اصلیت میں اثر رکھتی ہے۔ افراد کے ذاتی حالات ایک بڑی حد تک قوم کے اجتماعی حالات سے علاقہ رکھتے ہیں اور اجتماعی رسوم عادات، شعائر اور تمدن و معاشرت کو ان کی تخلیق میں بڑا دخل ہے پس جس طرح ہر جماعت کے یہ اجتماعی حالات جدا ہوتے ہیں اور جس طرح ہر زمانہ میں وہ بدلتے رہتے ہیں اسی طرح افراد کے ذاتی حالات میں بھی بہت کچھ تغیر ہو جاتا ہے اور محاسنِ اخلاقی کے اطلاق پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک جنگی قوم کے ہاں شجاعت جن صورتوں میں ظہور کرتی ہے وہ ایک تجارتی قوم کی شجاعت سے مختلف ہوتی ہیں، اور آج سے چند صدی پہلے جن افعال کو ہمارے ہاں شجاعت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ وہ آج کے شجاعانہ افعال سے مختلف ہیں اس پر قومی رسوم و شعائر کے اثر کو بھی قیاس کر لو۔

اسی بنا پر ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ محاسن اپنی قوم رسوم و عادات کی عاقلانہ پابندی اور اپنی قومی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہیگل کہتا ہے کہ:۔

> قدیم زمانہ سے بڑے بڑے حکما کا یہ فیصلہ ہے کہ نیکی اور فضل نام ہے اپنی قومی روایات

کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔"

بریڈلے تو یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ جو شخص اپنے ماحول سے بلند تر اخلاق کی طرف جانا چاہتا ہے وہ بداخلاقی کی سرحد پر ہے۔ مگر یہ بہت مبالغہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتماعی حالات اور قومی روایات محاسن اخلاق کے اطلاق پر اثر رکھتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ محاسن اخلاق کا معیار ہی قومی روایات و رسوم ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو کوئی قوم اخلاقی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کے تمام افراد پر ایک اخلاقی جمود طاری ہو جائے گا اور وہ اپنے رسوم و شعائر کے اعتبار سے جس سطح پر ہو گی اسی پر قائم رہے گی۔ بریڈلے نے اگر اس حقیقت پر غور کیا ہوتا کہ دنیا کی اخلاقی ترقی ایسے ہی لوگوں کی رہین منت ہے جو اپنے گرد و پیش کی سطح سے بلند تر سطح پر جانے کی کوشش کرتے ہیں، تو شاید وہ اس کو بداخلاقی سے تعبیر نہ کرتا۔

غلط فہمی کی وجہ

درحقیقت یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ لوگوں نے محاسن اخلاق کے اطلاق پر تغیر حالات کے اثر کو اچھی طرح نہیں سمجھا اور وہ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ تغیر حالات کے ساتھ محاسن کی فطرت بھی بدل جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سخاوت جس حسن اخلاق کا نام ہے وہ جس صورت میں بھی ظاہر ہو اسے بہرحال سخاوت ہی کہیں گے ایک شخص اگر دس روپے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے کسی حاجت مند کی حاجت رفع کرتا ہے تو اس کی سخاوت اپنی اصلیت میں اس شخص کی سخاوت سے کچھ بھی مختلف نہیں جو اپنی حیثیت کے مطابق ۱۰ ہزار روپیہ کسی یتیم خانہ کو دیتا ہے اسی طرح جو شجاعت کسی جنگجو سے میدان جنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہی شجاعت ایک سائنٹیفک محقق سے میدان تحقیق میں مصائب کے مقابلے ظہور پذیر ہو سکتی ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک برقی قوت کہیں پنکھے چلاتی ہے کہیں روشنی کرتی ہے کہیں پریس مشین کو حرکت دیتی ہے اور کہیں آٹا پیستی ہے۔ کام مختلف ہیں مگر ہر شخص جانتا ہے کہ وہی ایک قوت ہے جو برقی لیمپ میں جا کر روشنی بن جاتی ہے پنکھے میں جا کر گھومنے لگتی ہے اور موٹر میں جا کر مشین چلانے لگتی ہے پس محاسن میں اطلاقی

حیثیت سے خواہ کتنا ہی اختلاف ہو مگر وہ ملکۂ نفسی جو حسن اخلاق کی اصل ہے اپنی فطرت میں ایک ہی ہوتا ہے۔

اب ہمیں اخلاقی مفہوموں سے ہٹ کر محض ملکات نفسیہ پر نظر رکھنی چاہیئے اور اسی اعتبار سے دیکھنا چاہیئے کہ محاسن اخلاقی کیا کیا ہیں۔

محاسن کے چار بنیادی رکن

جب سے اخلاقی تحقیقات شروع ہوئی ہے، حکمائے اخلاق محاسن کی مختلف صورتوں کا شمار کر رہے ہیں اور ان کی یہ کوشش ہے کہ محاسنِ اخلاقی کی ایک مکمل فہرست بنائیں۔ متعدد علماء نے ایسی فہرستیں بنائی ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ مشہور وہ فہرست ہے جو افلاطون کے نام سے مشہور ہے۔ وہ جزئیات کے احصار کو ناممکن اور بیکار سمجھ کر اصول کو لیتا ہے۔ اور تمام محاسن کو ۴ بنیادوں کو قائم کرتا ہے۔

حکمت، شجاعت، عفت اور عدالت ان چاروں الفاظ کے عام طور پر جو معنی لئے جاتے ہیں۔ ان کی رو سے ایک شخص کو حیرت ہو گی کہ انہیں امہات فضائل کیونکر قرار دیا گیا لیکن افلاطون نے جن وسیع معنوں میں انہیں لیا ہے۔ اس پر اگر غور کیا جائے تو تمام فضیلتیں اپنی اصلیت میں انہی چاروں کے ماتحت آ جاتی ہیں اور یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ جس شخص کی سیرت ان چاروں بنیادوں پر قائم ہو وہ ایک مکمل انسان ہے۔ ذیل میں ہم ایک ایک کی کچھ تشریح کریں گے۔

عدالت

ابنائے جنس کے ساتھ معاملات و تعلقات کو درست کرنے کے لئے جتنے محاسن و فضائل کی ضرورت ہے ان سب پر یہ لفظ حاوی ہے، عام بول چال اور قانونی اصطلاح نے اس کے وسیع مفہوم کو بہت تنگ کر دیا ہے جس کی وجہ سے عدالت کے معنی صرف قانونی احکام کی فیصلہ گاہ اور دادرسی تک محدود رہ گئے ہیں بلکہ حکمی حیثیت سے وہ نہ صرف جماعت

بلکہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ دیانت و راستبازی کے ساتھ معاملت کرنے کے معنی رکھتا ہے۔ دیانت، راستبازی، انصاف، خوش معاملگی وغیرہ مختلف الفاظ بولنے کے بجائے اس ایک لفظ کو بول دینا ان تمام محاسن اخلاق کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ جو معاملات کی درستی اور تعلقات کی شگفتگی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ایک کامل عدالت شعار آدمی وہ ہے جو ہر شخص سے یکساں تعلق رکھے۔ کسی کی بیجا رعایت و جانبداری نہ کرے، نہ کسی کے ساتھ بے جا زیادتی کرے جو شخص اس کی جتنی رعایت و مہربانی کا مستحق ہو اس پر اتنی عنایت صرف کرے۔ معاملات میں کھرتل اور ملنے میں شرافت کیش رہے۔ کسی کے حق میں دست اندازی نہ کرے ادائے حقوق میں تغافل شعاری سے کام نہ لے، اپنے فرائض کو ادا کرنے کے لئے ہر وقت مستعد رہے سختی کی جگہ نرمی اور نرمی کی جگہ سختی نہ برتے۔ مروت کا غلط استعمال نہ کرے، ملنے میں خندہ پیشانی، خوش مزاج، متواضع اور حلیم ہو اور معاملات میں کھرا اور صاف ہو۔ غرض یہ کہ ایسی تمام صفات عدالت سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ صرف افراد بلکہ جماعت میں بھی ایک ایسا نظام قائم کرنا جس کے ماتحت ہر چیز ہر شخص کے لئے ہو۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، رعایت اور سختی استحقاق پر مبنی ہو۔ اور ہر فرد کے مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ یہ سب عدالت کا تقاضہ ہے۔

شجاعت

شجاعت کو لوگ عام طور پر میدان والی بہادری کے معنی میں لیتے ہیں اور اگر کوئی زیادہ وسعت اختیار کرتا ہے تو مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو بہادری کہہ دیتا ہے لیکن درحقیقت شجاعت اپنے اصلی معنوں میں خوف الم کی مدافعت کا نام ہے اور وہ بہت سے مستقل محاسن اخلاق پر حاوی ہے۔ مثلاً نصب العین کی راہ میں جو خطرات ہوں ان کے باوجود ارادہ پر قائم رہنا عزیمت ہے۔ اشکلات کا مقابلہ کرکے راہ عمل پر سرگرم رہنا بہادری ہے۔ مصائب سے ہمت کو پست نہ ہونے دینا صبر ہے اور کسی بلند مقصد کے لئے ادنیٰ لذتوں کو قربان کر دینا فدویت ہے بعض لوگ شجاعت کی ان سب قسموں کو وہ بڑی تقسیموں پر منقسم

کرتے ہیں۔ ایک فعلی شجاعت یعنی خطرات کے مقابلہ میں پسند کردہ راہ پر چلنا اور اسے وہ بہادری سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسرے انفعالی شجاعت یعنی مصیبتوں کا فراخ حوصلگی سے مقابلہ کرنا اور اسے وہ صبر کہتے ہیں۔ مسٹر برانٹ نے اپنی کتاب Objects of Education میں ان دونوں کا موازنہ کیا ہے اور آخر الذکر کو اول الذکر پر ترجیح دی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ صبر بہادری سے بہتر ہے۔ کیونکہ بہادری صرف خوف و الم سے آنکھیں بند کر لینے کو کہتے ہیں اور صبر عملاً تکلیفوں کی برداشت اور استقلال کے ساتھ مقصد پر قائم رہنے کا نام ہے۔

بعض اور لوگ بھی صبر کو بہادری پر ترجیح دیتے ہیں لیکن دراصل صبر بہادری کی تکمیل کے لئے ایک مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کر کے حصول مقصد کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے تو وہ کامیاب انسان نہیں ہو سکتا پس بہادر آدمی صابر بھی ہوگا اور محض صابر بہادر نہیں ہوگا۔

عفت

عفت لغت عام میں پاکبازی کو کہتے ہیں۔ اور اخلاق کی اصطلاح میں بھی وہ اس اعتدالی حالت کا نام ہے جو شہوت و خمود کے درمیان ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس لفظ کو وسیع معنوں میں لیا جائے تو یہ ان تمام وساوس شیطانی کے مقابلہ پر حاوی ہے، جو انسان کو اس کی تکمیل مقصد سے روکتی اور اس کو بلند اخلاقی سیرت تک پہنچنے سے باز رکھتی ہیں۔ شہوت پرستی و ہوس ناکی سے بچنا، بے غیرتی و بے حیائی سے احتراز کرنا، ذلیل کاموں سے پرہیز کرنا اور حرص و آز کی بندگی میں نہ پڑ جانا اور ایسے ہی تمام محاسن اخلاقی عفت کے تابع ہیں۔

حکمت

ان سب امہات فضائل سے زیادہ اہم ایک اور فضیلت ہے جو تمام محاسن کی روح ہے۔ اگر اس کی شرکت کسی کام میں نہ ہو تو خواہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کتنا ہی افضل و احسن ہو۔ مگر معیار اخلاق پر پورا نہیں اتر سکتا۔ یہ فضیلت حکمت ہے۔ اس سے مراد وہ قوت

امتیاز ہے جس کے ذریعہ انسان کھوٹے کھرے اور صحیح و غلط میں فرق کرتا ہے اور ہر کام میں راہ صائب اختیار کرتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص میں شجاعت کا مادہ ہے۔ مگر حکمت نہیں تو وہ کبھی اعتدال کی حالت پر قائم نہیں رہ سکتا، ہر ہر قدم پر افراط و تفریط سے اس کا کام خراب ہوگا اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص عفت شعار ہے مگر اس میں اتنی عقل نہیں کہ اپنے اس مادہ عفت کے صحیح مصرف کو معلوم کر سکے تو وہ ضرور صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا پس حکمت امہات فضائل میں بھی اصل بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔

ان چاروں محاسن کی تھوڑی تشریح سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ یہ تمام انسانی فضائل پر محیط ہیں اگر یہ کسی انسان میں جمع ہوں تو وہ اپنی سیرت و کردار دونوں کے اعتبار سے ایک مکمل اور کامیاب انسان ہوگا اور سوسائٹی کا بہترین فرد تسلیم کیا جائے گا لیکن فطرت بہت کم انسانوں پر اتنی فیاضی صرف فرماتی ہے، عام طور پر غیر معمولی انسانوں کا بھی یہ حال ہے کہ امہات محاسن میں سے ایک دو سے زیادہ انہیں عطا نہیں ہوتا۔ عدالت ہوتی ہے تو عفت و شجاعت نہیں ہوتی شجاعت ہوتی ہے تو عفت و عدالت نہیں ہوتی، اگر یہ سب ہوتی ہیں تو حکمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ تاہم وہ لوگ انسانی سوسائٹی میں عام سطح سے بلند ہوتے ہیں جن میں کوئی ایک فضیلت حکمت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

جزئیات و فروع

اوپر کی بحث سے تمہیں معلوم ہو چکا کہ چار بنیادی محاسن ہیں جو تمام محاسن اخلاق کی اصل ہیں۔ مگر بعض علما نے جزئی محاسن کا احصا کرنے کی بھی کوشش کی ہے چنانچہ ارسطو جزئی محاسن کی فہرست مرتب کرتا ہے اور اپنے استاد سے اس خیال میں اختلاف کرتا ہے کہ صرف امہات کا بیان کر دینا کافی ہے۔ مگر یہ تفصیلی فہرست اول تو نامکمل ہے، دوسرے اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ عام انسانی فضائل کے بجائے ایتھنز کے شہریوں کے فضائل کو پیش نظر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت بہت کم ہو گئی ہے۔ یہ فہرست آج نہ صرف ہمارے لئے بلکہ خود یونانیوں کے لئے بھی بیکار ہے۔ عہد حاضر کے علما نے بھی تفصیلی فہرست بنانے کی کوشش

کی ہے۔ چنانچہ پروفیسر میور ہیڈ نے اپنی کتاب "Elements of Ethics"[لہ] میں ایک ایسی ہی فہرست نقشہ کی صورت میں درج کی ہے۔ پروفیسر ایڈلر نے بچوں کی اخلاقی تعلیم کے عنوان سے ایک لیکچر میں ان محاسن کو جمع کیا ہے۔ جو زیادہ تر بچوں میں پرورش کئے جانے چاہئیں۔ ایک اور فہرست Moral Education League نے مدارس کے طلبا کی اخلاقی تربیت کے لئے مرتب کی ہے۔ مگر ہمارے خیال میں تمدن جدید کی وسعت کو دیکھتے ہوئے تمام محاسن اخلاق کو جمع کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ بے معنی بھی ہے۔ اس بارہ میں افلاطون کی رائے بہت صائب ہے اور اسی کا اصول قابل تقلید ہے۔

اب اس تحقیق کے بعد کہ وہ محاسن سیرت کیا ہیں جنہیں ہم کو اپنے اندر پرورش کرنا چاہیئے۔ ہم اجمال کے ساتھ ان وسائل سے بحث کریں گے جو ان کی ترقی کے لئے ممد ہوتے ہیں اس کے لئے ہمیں نفسیات کے دائرہ میں قدم رکھنا پڑے گا اور نفسیات کے متعلق یہ سب کو معلوم ہے کہ وہ اس حیثیت سے ابھی ناقص ہے۔

تربیتِ محاسن کے وسائل

سیرت کی ترقی پر نمونہ یا مثال کا جو اثر پڑتا ہے اس کے ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں، اس طرف ہر عالم اخلاقیات نے توجہ صرف کی ہے اور اس اثر کے مظاہر پر ایک وافر لٹریچر پیدا ہو گیا ہے۔ اجتماعی تعلقات میں ایک کا دوسرے سے اثر پذیر ہونا ایک ایسی عام بات ہے۔ جسے فلسفیانہ حیثیت سے پیچیدہ بحثوں میں پیش کرنا غیر ضروری ہے، ہر شخص اس کو جانتا اور رات دن اس کے نتائج محسوس کرتا ہے۔ مگر افراد کے افراد پر اثرات اتنے زیادہ اہم نہیں ہوتے جس قدر جماعتوں کے اخلاقی اثرات افراد کے اخلاقی اثرات جماعت پر ہوتے ہیں۔ ایک شخص جس کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے یا بالکل اس کے رنگ میں رنگ جاتا

[لہ] ہربرٹ کی علم التعلیم، گیو کی تعلیم و تربیت، ابرانٹ کی مقاصد تعلیم، روزانکز کی فلسفہ تعلیم، اور ایڈلر کا لکچر بچوں کی اخلاقی تعلیم پر ان چند کتابوں میں سے ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

ہے یا اگر ایک مضبوط شخصیت اور سیرت کا مالک ہوتا ہے۔ تو اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ پس اخلاقی تکمیل کے لئے افراد کا باہم رابطہ اور اس رابطہ کا صحیح اصولوں پر قائم ہونا ضروری ہے۔ شلر نے خوب کہا ہے کہ "یا تو آدمی کُل ہو جائے یا اپنے تئیں کسی کُل سے وابستہ کر دے"۔

بریڈلے نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "تم اس وقت تک کُل نہیں ہو سکتے جب تک خود کسی کُل سے وابستہ نہ ہو جاؤ"۔ ان دونوں مقولوں کو اگر ایک کر دو تو تم ضرور اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ انسان کسی جماعت کی اخلاقی رہبری کے قابل ہونے کے لئے بھی اس کا محتاج ہے کہ کسی سوسائٹی کے نظامِ اخلاق میں تربیت پائے۔ سیرت کی مکمل ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنے تئیں کسی بڑی غایت کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اس کل میں مختلف آدمیوں کی مختلف حیثیت ہوتی ہیں کسی کو عملی کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے کوئی طلبِ علم سے رغبت رکھتا ہے۔ بعض کو تصنیف و تالیف محبوب ہوتی ہے بعض سیاسیات سے شغف رکھتے ہیں، کوئی شاعری یا مذہب کا شیدا ہوتا ہے۔ غرض ہر شخص ہیئت اجتماعی کا کسی نہ کسی پہلو سے ایک رکن ہوتا ہے اور اپنی ذات کے محدود عالم سے وسیع تر عالم میں جانے کے لئے اسے اس علاقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان ایسا نہ کرے تو وہ اپنی ساری ذہنی قابلیتوں کو ناکارہ کر دیگا۔ اور اس کی زندگی ایک ایسے قطعہ زمین کی سی ہو گی جو ایک عرصہ تک انسانی آبادی سے دور رہنے کی وجہ سے اپنی روئیدگی کی قوتیں کھو چکا ہو۔

پس تکمیلِ سیرت اور تربیتِ محاسن کے لئے جو چیز لازمی ہے وہ مدنیت اور اجتماعی روابط ہیں۔ ہمیں ایک بلند مقصد کے لئے اپنے آپ کو دوسروں کے ساتھ متحد کر دینا ضروری ہے۔ جب تک یہ نہ ہو گا۔ ہم کوئی فضیلت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ ایک انسان میں ملکۂ عفت کیا پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کے لئے وساوس اور جذبات شیطانی نہ ہوں اور وہ ان کا مقابلہ کر کے اس ملکہ کو پرورش نہ کرے! کوئی شخص شجاعت کی قوت اپنے اندر کیونکر پیدا کر سکتا ہے، جبکہ وہ تنازع للبقا کی جنگ میں حصہ نہ لے؟ کسی کو حکمت کی

صفت سے کیونکر متصف کیا جا سکتا ہے، جبکہ وہ غریب معاملت سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھتا ہو؟ اور اسی طرح عدالت کا مفہوم ہی کب متعین ہو سکتا ہے۔ جبکہ حسن معاملت سرے سے مفقود ہے؟ یہ سب حیات اجتماعی کے لوازم ہیں اور جب تک ہم اپنی زندگی کو ان لوازم سے خوب وابستہ نہ کریں گے اس وقت تک نہ تو ہماری زندگی اپنی ذات کے محدود دائرہ سے باہر نکلے گی۔ اور نہ ہماری ذہنی قوتیں ترقی کر سکیں گی۔ جن کو ہر ساعت اور ہر لمحہ ایک محرک کی ضرورت ہے جو شخص ان لوازم سے جس قدر زیادہ وابستہ ہے اس کے لئے اپنی ذہنی و عملی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا اتنا ہی زیادہ موقع ہے، اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی قوت اور قابلیت دنیا میں ایسی نہیں ہے جو بغیر استعمال کے ترقی کر سکے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "ہر ایسی مزاحمت اور روک کا خیر مقدم کرو جو تمہارے راستہ میں حائل ہو اور ہر ایسی نیش زنی کا استحال کرو جو تمہیں بیدار اور بیدار تر ہونے پر مجبور کر دے" ظالم نے ان چند لفظوں میں سعی و جہد کا سارا فلسفہ بھر دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنے اوپر دانستہ مصائب کو دعوت دو۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ تمہیں اپنے راستہ میں جو چیز بھی حائل ملے اس سے ہراساں نہ ہو۔ بلکہ اپنے لئے بہتر سمجھو۔ کیونکہ جب تک تمہیں حالات سے واسطہ نہ پڑے گا۔ ان کو عبور کرنے اور غالب آنے کی قوت پیدا نہ کر سکو گے اور اسی طرح جب تک تمہیں اچھی طرح تازیانے نہ لگیں گے۔ تمہارا دماغ مصائب کو سمجھنے اور راہ چلنے کے طریقے معلوم کرنے کے قابل نہ ہوگا۔

ازالۂ معائب کا طریقہ

تربیت محاسن کے لئے ازالۂ معائب کی کوشش مستلزم ہے اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے معائب کو سمجھ لے اور ان کے جواب پر محاسن پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ ڈاکٹر شالمر کہتا ہے کہ "ہر نیا جذبہ قوت دافعہ کا کام دیتا ہے" ہمفرے کی رائے ہے، کہ "کسی خیال کو بدلنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ذہن کی ایک تصویر دوسری تصویر سے بدل دی جائے" اسی طرح دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "کسی خیال کو بالکل فنا نہیں کیا جا سکتا

بلکہ دوسرے خیال سے بدلا جا سکتا ہے جو اتنی ہی اہمیت اور قوت رکھتا ہو ۔ مقصد یہ ہے کہ اخلاقی عیوب کو صرف محسوس کر لینا ہی کافی نہیں اور نہ ان کے محض ازالہ کی کوشش کی جا سکتی ہے بلکہ ان کو محاسن سے بدلنے کی ان تھک کوشش کرنی چاہیئے اور جب کوئی برا خیال یا برا ارادہ پیدا ہو۔ فوراً اس کو اچھے خیال اور اچھے ارادہ سے بدل دینا چاہیئے اس کے لئے ترقی باطن بھی ایک حد تک ضروری ہے ۔ اور اس میں انسان مذہب سے مدد لے کر اپنی توجہ کی انگلیوں سے کردار کی نبض دیکھتا ہے ۔ مگر اس میں استغراق انسان کو رہبانیت کی طرف لے جاتا ہے اسلئے اعتدال ضروری ہے ۔

حکمت عملی

اور کسی جگہ ہم اخلاقی ماحول کے اثرات کی ان مختلف صورتوں پر کچھ بیان کر آئے ہیں جو انفرادی شعور پہ وارد ہوتی ہیں۔ جماعتوں کی اخلاقی زندگی کے بالعموم تین سطح نظر ہوتے ہیں قیام شعائر، ادائے فرائض اور تکمیل نفس ، اجتماعی ترقی کے مختلف مدارج میں انہی تین صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک نمایاں ہو کر ظہور کرتی ہے اور جس قوم کا میلان ان میں سے جس کی طرف ہوتا ہے وہ اسی میں ترقی کرتی ہے ۔ اچھا شہری اپنی رہنمائی کے لئے حیات اخلاقی کی ان ہی عام صورتوں سے اصول مستنبط کرتا ہے اور اپنی عقل و دانائی کی مدد سے ان کو اپنی عملی زندگی میں استعمال کرتا ہے ۔ اس کو ارسطو نے قیاس اخلاقی سے تعبیر کیا ہے ۔ جس کا کبریٰ یہ ہے کہ فلاں فلاں شعائر قائم کرنا اور فلاں فلاں احکام کو پورا کرنا ، اور صغریٰ یہ کہ فلاں قسم کے فعل سے یہ باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

اس طرح عام اصول کو سمجھ کر خاص خاص افعال کو ان کے ماتحت رکھنے کی قوت کا نام ارسطو کی اصطلاح میں حکمت عملی ہے اور اس صاحب قوت کا نام حکیم۔ یہی قوت ایک اچھے شہری کا وصف امتیازی ہے ◆

۵ - معائب اخلاق

پچھلی بحث میں جو کچھ مذکور ہوا ان اخلاقی خصائل اور فضائل سے متعلق تھا جنہیں اخلاق انسانوں میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی تمنا ہے کہ وہ ہر بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں موجود ہوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ انسانی زندگی نیکی و پارسائی کا مجموعہ نہیں بلکہ فطرتاً ان جذبات و امیال سے مملو ہے جو اسے معصیت و بدکاری کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لئے اب ذرا ان باتوں سے ہٹ کر جن کی اخلاق تمنا کرتا ہے ایسی باتوں کی طرف آؤ جن سے اخلاق کو عملاً واسطہ پڑتا ہے۔

برائی کی طرف فطری میلان

یہ بات تم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ قدرت نے جس طرح انسان کو ایک دوسرے کا محتاج بنایا ہے، اسی طرح ایک کے فوائد دوسرے سے متعلق کئے ہیں، اور انسان کی فطرت میں یہ مادہ رکھا ہے کہ وہ اپنے لئے تمام فوائد و منافع کو مخصوص کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام منفعتیں اس کے لئے مخصوص ہو جائیں اور وہی مادی قسمتوں کی حکمرانی کرے اور چونکہ ایسی حرص کم و بیش سوسائٹی کے ہر فرد میں موجود ہوتی ہے اور اس کی پیاس بجھانے کے لئے اپنی بساط کے مطابق ہر شخص کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ان میں باہم تصادم ہوتا ہے، ایک کی اغراض دوسرے کی اغراض سے ٹکرا جاتی ہیں، ایک کے حقوق میں دوسرا دخل دیتا ہے۔ ایک کی بھلائی دوسرے کی برائی ہو جاتی ہے لوگ اپنی غیر معمولی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ناجائز ذرائع کا استعمال کرتے ہیں اور منفعت بخش سودے کے لئے مضرت بخش ذرائع کا استعمال عام ہو جاتا ہے جو بُرے اعمال پر ملامت کرنے والا ایک حاسۂ اخلاقی ہے، شروع شروع میں انہیں روکتا ہے مگر مادی منافع کے مقابلہ میں انسان کی حریص فطرت اس کی کم سنتی ہے۔ آخر

کچھ عرصہ کے بعد وہ مردہ ہو جاتا ہے اور انسان ملٹن کے شیطان کی طرح کہنے لگتا ہے کہ "اے برائی تو میرے لئے بھلائی ہو جا" یعنی اس شرارت آمیز طرز پر زندگی بسر کرتے کرتے اس کا یہ اصول ہو جاتا ہے کہ حصولِ مقصد کا ذریعہ صرف برائی ہے یا وہ برائی جو حصولِ مقصد میں کام آتی ہو عین بھلائی ہے ۔

پھر چونکہ سوسائٹی کی متحدہ اغراض بالکل متضاد واقع ہوتی ہیں ۔ اور ان کی کوششیں اجتماعی مقاصد کے بالکل خلاف ہوتی ہیں ۔ اس لئے جماعت کے فوائد قدم قدم پر ان کا راستہ روکتے ہیں اور ان میں باہم ایک کشمکش جاری ہو جاتی ہے ۔ اگرچہ یہ لڑائی ملٹن کے شیطان کی طرح انتہائی حدود تک نہیں پہنچتی مگر جیسا کہ شیکسپیئر نے کنگ رچرڈ کی زبان سے کہلوایا ہے کہ "میں عاشق ثابت نہیں ہو سکا اس لئے اب میں نے بدمعاش ہونے کا تہیہ کر لیا ہے ۔ سوسائٹی کے دنی الطبع افراد جب سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتا نہیں دیکھتے تو بدمعاشی پر اتر آتے ہیں اور سوسائٹی کے نقصان میں اپنے فائدہ کو تلاش کرتے ہیں ۔

یہ نہ سمجھو کہ ایسی حرکتیں صرف ذلیل عوام ہی کرتے ہیں ۔ اونچے طبقہ کے انسانوں کا دامن اس سے پاک ہے ۔ نہیں ۔ خواص کے مفہوم سے اگر پیغمبر، ولی، اور ایسے لوگوں کو جن کا ذریعہ شہرت و عظمت علم و عمل ہے، نکال دو تو تمہیں یہ ماننا پڑے گا کہ خواص بالعموم وہی لوگ ہیں جو اسی طرح اپنی جماعت اور اپنے ہی نوع سے لڑتے ہیں اور اپنی قابلیتوں سے سوسائٹی کی متحدہ اغراض کو شکست دے کر آگے بڑھ گئے ہیں ۔ ان میں اور عوام میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری زبان میں عوام وہ ہیں جو اس جنگ میں کامیاب نہیں ہوتے ۔ اور خواص وہ جو جماعت کے مقابلہ میں فتح پا لیتے ہیں ۔

معلوم ہوا کہ سوسائٹی میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جو اپنے ذاتی فوائد اور مقاصد پر جماعت کے فوائد و مقاصد کو قربان کر دینا اور جماعت کے خلاف جنگ کر کے اپنے اغراض کو حاصل کرنا اپنا مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں ۔ ایسی اکثریت کی موجودگی میں اخلاق کی تمام تر توجہ رذائل و معائب کی طرف منعطف ...... ہو جاتی ہے اور محاسن پیدا کرنے کے لئے ایسے معائب کا مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے پس اب تحقیق کرنا چاہیئے

کہ رذائل اخلاق کیا ہیں اور ان کے مقابلہ کی کیا صورت ہے۔

اخلاقی عیوب کے چار بنیادی رُکن

جس طرح محاسن کا استقصا کرنے کے بعد ان کی اصل چار بنیادی محاسن ٹھیرتے ہیں، اسی طرح اگر تمام معائب کو تلاش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ فضائل کے عین مقابلہ میں چار بنیادیں ان کی بھی ہیں۔ شجاعت کے مقابلہ میں جبن یا الم کا عدم تحمل، عفت کے مقابلہ میں حرص یا لذت کی غلامی، عدالت کے مقابلہ میں ظلم یا اجتماعی روابط کی بے عدلی، اور حکمت کے مقابلہ میں جہل یا قوت امتیاز کی کمی۔ انسان جب کبھی مصائب کے مقابلہ میں کمزوری بتتے اور راستہ کی مشکلات کو دیکھ کر اپنے اخلاقی نصب العین کی طرف بڑھنے سے ہچکچاتے تو اس کی ایسی تمام کمزوریاں جبن کے ماتحت آجاتی ہیں لذات وشہوات کی غلامی میں جو کچھ بھی حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں اور وساوس شیطانی کے ماتحت جو کچھ بھی وہ کرتا ہے۔ سب حرص کی ذیل میں ہے۔ اجتماعی زندگی میں غیر عادلانہ طریقوں سے جتنے اخلاقی معائب کا ارتکاب اس سے ہوتا ہے ان سب پر ظلم حاوی ہے اور راہ معائب اختیار کرنے میں جتنی غلطیاں اس سے سرزد ہوتی ہیں سب جہل کا نتیجہ ہیں۔

تشریح کی یہاں ضرورت نہیں۔ کیونکہ پچھلی بحث میں محاسن پر جو گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ اسے الٹ کر پڑھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ محاسن کے مقابلہ میں مذکورہ بالا معائب کا کیا مفہوم ہے۔ البتہ ایک بات یہاں صاف کر دینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ بعض بہترین فضائل جب جماعت کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں تو وہ بدترین رذائل سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً شجاعت اگر جماعت کے خلاف استعمال کی جائے تو جبن سے بدتر ہے اور حکمت اگر جماعت کو ذاتی اغراض کا غلام بنانے کے لیے کام میں لائی جائے تو جہل ونادانی کی بدترین صورت ہے۔ یہ مذکورہ بالا چار رذائل پر مستزاد ہے۔

معائب کی دو قسمیں :- ان تمام معائب کو جو اوپر مذکور ہوئے ان کی نوعیت

کے اعتبار سے دو قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو سیرت اور خصائل سے متعلق ہیں۔ انہیں رذائل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ باطنی عیوب ہیں۔ دوسرے وہ جو چال چلن اور افعال سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں جرائم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ ظاہری عیوب ہیں۔ رذائل کے لئے جرائم کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ مگر جرائم کے ساتھ رذالت کا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جرائم رذالت ہی کی ترقی یافتہ صورت ہیں۔ اخلاق کی نظر میں رذائل جرائم کی اصل ہیں۔ کیونکہ جرم اس وقت تک سرزد نہیں ہو سکتا جب تک برا ارادہ موجود نہ ہو اور برا ارادہ نتیجہ ہے برے خیالات اور بری سیرت کا۔ اسی لئے علم الاخلاق میں جرائم کے انسداد سے زیادہ ضروری چیز رذائل کی اصلاح ہے۔ مگر چونکہ رذائل پوشیدہ رہتے ہیں اور قانون حکمت صرف ظاہری اعمال تک محدود ہے اس لئے حکومتیں رذائل کی اصلاح سے عاجز ہیں۔ البتہ یہ مذہب کا کام ہے کہ وہ اعمال سے زیادہ تزکیۂ نفس کی جانب توجہ کرتا ہے اور برائی کی جڑ کھوکھلی کرتا ہے وہ ایک ایسی تقدیر کا خوف دلاتا ہے جو اعمال کی بجائے نیتوں پر کی جائے گی۔ اور انسان کے نفس پر یہ ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ کہ ایک بالاتر قوت اس کے دلوں کا حال جانتی ہے اور اسے تمام انسانی ارادوں اور نیتوں کا علم ہو جاتا ہے، اور پھر اس قوت کے ساتھ وہ اسے یہ تعلیم ہے کہ "اگر تو نے کسی گناہ کا ارادہ کیا تو اپنے خیال میں گنہگار ہو چکا۔

علمائے اخلاق خیال کو عمل پر ترجیح دیتے ہیں اور اس میں بعض کا اتنا پختہ عقیدہ ہے کہ "جو بات بظاہر اچھی ہے، اگر وہ کسی اچھے محرک پر مبنی نہیں ہے تو درحقیقت بری ہے۔" اسی طرح یہ اصول کہ جس عمل خیر کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے وہ شر ہے۔" ایک زریں اصول ہے مگر افسوس ہے کہ لوگ لفظ ایمان کو اس کے اصلی معنوں میں لینے کے بجائے اپنے مزعومہ معنوں میں لیتے ہیں اور انہی کو اس اصول کی بنیاد قرار دیتے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ بات عیسائی مصنفوں کے ہاں کثرت سے پائی جاتی ہے جو غیر عیسائی شخص کے فضائل کو شاندار رذائل سے تعبیر کرتے ہیں۔

خیال اور عمل کا فرق:- اگرچہ مذہبی نقطۂ نظر سے بری سیرت ویسی ہی قابل ملامت

ہے جیسے بُرے افعال۔ لیکن درحقیقت خیال کی برائی اور عمل کی برائی میں ایک بڑا فرق ہے یہ سچ ہے کہ آگے چل کر بری سیرت ہی سے برے افعال پیدا ہوتے ہیں، مگر ان دونوں کو ان کی ابتدائی یا آخری صورت میں بھی ایک نہیں کہہ سکتے جس طرح محض خوش نیتی خوش فعلی کے برابر قابل تحسین نہیں ہے اسی طرح اگر ہم کسی شخص کے برے ارادہ سے واقف ہو جائیں تو اس کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا چاہیئے جو برے فعل پر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا کرتا۔ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے دشمن کو قتل کرنے کا ارادہ کرے، برسوں اسے اپنے دل میں پکائے اس کے لئے ضروری سامان بھی بہم پہنچالے مگر جب قتل کرنے لگے تو اسے رحم آجائے یا خود اپنے انجام سے ڈر کر باز آجائے۔ میور ہیڈ نے خوب کہا ہے کہ "جو شخص صرف ارادہ جرم کی حالت میں پکڑا جائے۔ اس سے نیکی کا برتاؤ نہ کرنا فطرت انسانی کی کوئی خوبی نہیں"۔ اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ایسے شخص کی آفرین وتحسین سے ہمت افزائی کی جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے سزا دینے کی بجائے موقع دیا جائے کہ وہ اپنے ارادہ کی برائی کو سمجھ کر اچھائی سے بدلنے کی کوشش۔ اس سلسلہ میں اس عورت کا قصہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو ہنڈنگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ عورت اپنے ہمسایہ کے گھر میں آگ لگانے کا تہیہ کرتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ اس نے عدالت میں اقرار کیا کہ میرا ارادہ آتش زنی کا تھا۔ اور گرفتاری کے وقت تک میں اپنے اس ارادہ سے باز نہیں آئی تھی۔ مگر اس نے قسم کھا کر کہا کہ آخر وقت تک میں یہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ ایسا ہی واقعہ میریم ایک عورت کا ہے جس نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ آرتھر لورڈ لکھتا ہے کہ "بعد میں مہینوں وہ صرف اس تصور سے دہل جاتی تھی کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا اس کو خبر نہ تھی کہ سنگین جرائم کے ارادہ اور ارتکاب میں کیا فرق ہے"۔ کارلائل اپنی French Revolution میں اس فرق کو ایک مثال سے ظاہر کرتا ہے۔

"فرض کرو ایک شخص اپنے دشمن کو ہلاک کرنا چاہتا ہے پستول اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور انگلی لبلبی پر ہے" تاہم اس کا ارادہ اس کے عمل پر غالب نہیں ہے۔ اور اس کا دل

ہچکچا رہا ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ پکڑ لیا جائے تو اسے ارتکاب جرم سے متہم نہیں کیا جا سکتا۔" ممکن ہے کہ عین اس تزلزل کی حالت میں اس نے اپنے ضمیر کی خاموش تنبیہ کو سن لیا ہو اور قتل کا ارادہ چھوڑ چکا ہو۔ انتظاماً اسے سزا دینا ازبس ضروری ہے، مگر اخلاقاً وہ مستوجب سزا نہیں ہے۔

اس مسئلہ پر آدم اسمتھ نے نظریہ احساسات اخلاقی میں خوب بحث کی ہے۔

نیت اور عمل

مگر یہ معاملہ ایک اور حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ایک شخص اگر برا ارادہ کرتا ہے اور اُس کے بعد اسے عمل میں نہیں لاتا تو خواہ وہ ہمارے عفو و درگزر کا کتنا ہی مستحق کیوں نہ ہو۔ مگر وہ ایک کمزور انسان ہے جس میں قوت ارادی یا روح عمل موجود نہیں ہے۔ اس کی بری نیت جس طرح بے عمل رہی۔ اسی طرح اچھی نیت بھی بے عمل رہ سکتی ہے اور وہ جس طرح برا نہیں بن سکتا۔ اس حیثیت سے بری نیت اگر صرف نیت رہے۔ تو برے عمل سے بدتر ہے۔ مثلاً وہی شخص جس کی انگلی ریوالور کی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ شوٹ کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ اگر وہ بیدھڑک شوٹ کر دیتا تو اگرچہ وہ اخلاقاً ایک سخت جرم کا مرتکب ہونے کی وجہ سے قصاص کا مستوجب قرار دیا جاتا، مگر ایک خاص حیثیت سے ہم اس کی وقعت کرتے۔ اب کہ وہ اپنے تذبذب کے باعث ارتکاب جرم نہ کر سکا۔ خواہ وہ قصاص سے بچ گیا ہو لیکن اس نے ہمارے دل پر اپنی بزدلی ارادہ کی کمزوری۔ اور کسی اہم کام کو کرنے کے لئے اپنی نااہلی کا نقش ہمارے دل پر چھوڑا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجام بینی غلطی ہے اور ہمارے نزدیک بری نیتوں کو برے عمل کی صورت میں لانا ایک اچھا کام ہے۔ نہیں ہم ایک بیباک بدعمل کی بدعملی کو اتنا ہی قابل مذمت سمجھتے ہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ مگر اس کی قوت عمل کو ایک بدنیت کی ارادی کمزوری سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جس شخص میں ارادہ کو عمل کا جامہ پہنانے کی قوت ہے وہ ایک کامیاب انسان ہو سکتا ہے۔

ایک عاقبت اندیش ہر کام پر غور کرتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو سوچتا ہے اور ایک عرصہ تک کرنے یا نہ کرنے کے خیال میں مذبذب رہتا ہے، دوسرا شخص اسے فوراً کر گذرتا ہے اور کچھ پرواہ نہیں کرتا کہ انجام کیا ہوگا۔ اب خواہ اول الذکر کو ہم محتاط اور دور اندیش اور آخر الذکر کو غیر محتاط اور ناعاقبت اندیش ہی کیوں نہ کہیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اول الذکر اپنا وقت سوچنے میں صرف کرتا ہے اور آخر الذکر کرنے میں اس کی نیت نیت ہی رہتی ہے اور اس کا ارادہ عمل کا جامہ پہن لیتا ہے۔ وہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا اور یہ سب کچھ کر سکتا ہے، سوسائٹی کو ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔

"تاہم قوت عمل کے ساتھ ایک خاص حد تک دور اندیشی و عاقبت بینی بھی ضروری ہے۔

ایک اور نظریہ

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ برے خیالات اگر بری نیت تک منتج نہ ہوں تو اخلاقاً قابل الزام نہیں۔ ملٹن اپنی مشہور کتاب Paradise Lost میں لکھتا ہے کہ خدا یا انسان دونوں کے دل میں برائی گذر سکتی ہے، لیکن وہ اس کو پسند نہ کرے تو اس کے قوائے ذہنی و عملی پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ مگر یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اول تو خدا سے برے خیال کو نسبت دینا ایک لغویت ہے، دوسرے۔ انسان کے دل میں برے خیال کا موجود ہونا اس کے اندر ایک دنائت کا پتہ دیتا ہے اور وہ اس لئے ضروری قابل ملامت ہے کہ دل میں چھپا ہوا برا خیال، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کے مانند ہے جو صرصر بدخیالی سے ہوا پاکر خرمن سوز ہو سکتی ہے۔

اصلاحی نقطہ نظر

ایک دوسری حیثیت سے اگر اس معاملہ پر غور کرو تو پھر اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ برا عمل برے خیال سے بہتر ہے۔ برے کام فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں اور ان کی اخلاقی یا قانونی سزا

وقت کے وقت انسان کو مل جاتی ہے۔ مگر برا خیال دل میں چھپا رہتا ہے۔ اور سوسائٹی کو عرصہ تک اس اخفا سے دھوکہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اول الذکر کے اثر سے سوسائٹی اچھی طرح بچاؤ کر سکتی ہے اور خود اس کی بھی اصلاح ممکن ہے مگر آخر الذکر سے نہ سوسائٹی حفاظت کا سامان کر سکتی ہے اور نہ اس کی اصلاح ہو سکتی ہے طامس کل نے خوب کہا ہے کہ " ادھورے ظالم بادشاہ سے پورا ظالم بادشاہ بہتر ہے " بدکار اپنی بدی کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کا تدارک اور اس کی اصلاح دونوں ممکن ہیں۔ مگر مگر بدنیت اپنی بدی کو چھپاتا ہے۔ اس لئے نہ اس کا تدارک ہو سکتا ہے اور نہ اصلاح۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ صرف جرائم ہی قابل اصلاح ہیں۔ رذائل کی عملی اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ ان کے ترک کا مشورہ دیا جائے پس اب ہمیں صرف جرائم اور ان کی اصلاح سے بحث کرنی چاہیئے۔

معصیت اور جرم

اوپر ہم نے جرائم کا لفظ جس معنی میں استعمال کیا ہے وہ وسعت کے لحاظ سے تمام گناہوں پر حاوی ہے۔ مگر اصطلاح میں جرم سے مراد وہ اعمال ہوتے ہیں جو ملکی قانون کے خلاف ہوں اور ایسے اعمال جو صرف اخلاقاً گناہ ہوں معصیت کہلاتے ہیں۔ اس کا فرق یوں سمجھو کہ چوری ایک جرم ہے۔ کیونکہ چور دوسرے کے حق ملکیت میں دخل دیتا ہے۔ اور ملکی قانون کو اسے سزا دینے کا حق ہے۔ مگر احسان فراموشی جرم نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کا اپنا فعل ہے۔ قانون کو اس کی روک تھام کا اختیار نہیں ہے۔ جرائم کی تحدید و تشخیص ممکن ہے۔ مگر معاصی کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ ان کی حد بندی کی جا سکتی ہے کیونکہ ان کا انحصار سوسائٹی کے اجتماعی حاسۂ اخلاقی پر منحصر ہے جس سوسائٹی کے حیات اخلاق جتنے نازک ہونگے۔ اس میں معاصی اور اخلاقی کمزوریوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہوگی اور جو حسات اخلاقی کے اعتبار سے ذکی الحس نہ ہوگی اس کا حال اس سے برعکس ہوگا۔

جرائم کی سزا حکومت دیتی ہے اور معاصی کی سزا جماعت ۔

معصیت کے نتائج

معصیت کے برے نتیجے اس کے ارتکاب سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے ، بلکہ کسی نہ کسی طرح مرتکب پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں ۔ سقراط کا مشہور قول ہے کہ "ظلم کرنا ظلم سہنے سے زیادہ خطرناک ہے یعنی ظلم سہنے سے نتائج بالکل خارجی ہوتے ہیں ۔ روح کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔ مگر ظلم کرنے سے ظالم اپنے آپ کو میزان ہستی میں کم وزن کر دیتا ہے اور اس طرح خود اپنی ذات پر اس سے زیادہ ظلم کرتا ہے ۔ جتنا دوسرے پر کیا تھا ۔ گو اس کے نتائج اسے علانیہ نظر نہ آئیں اور وہ اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھے ۔ لیکن حقیقت کی نگاہ میں وہ مظلوم سے زیادہ ٹوٹے میں ہے ۔

ہر شخص فطرتاً یہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ ملنا چاہیئے اور ایسا سمجھنا عقلاً درست ہے ۔ ایک نیک شخص جب دنیا کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیئے اور ایک قومی دردمند اپنی قوم کو ذلت و پستی سے ابھارنے کے لئے سعی کرتا ہے تو ہم قدرتی طور پر یہ توقع کرتے ہیں کہ خدا اس کا ساتھ دے گا اور اسے ضرور کامیابی ہوگی ۔ مگر جب کوئی بدکار آدمی مخلوق خدا پر ظلم کرتا ہے ۔ یا دنیا میں برائی کو پھیلاتا ہے تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اس پر خدا کا قہر نازل ہوگا ۔ اور وہ ضرور ناکام ہوگا ۔ ہمارا یہ عقیدہ اتنا پختہ ہوتا ہے ۔ کہ اگر اول الذکر کو ناکامی و مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ تو ہم اسے کامیابی سے قریب تر سمجھتے ہیں اور آخر الذکر کامیاب نظر آتا ہے ، تو ہمارے نزدیک اس کی کامیابی محض ایک بھلاوا اور فرصت ہوتی ہے ۔ جو اللہ اسے پوری سزا دینے یا راہ راست پر آجانے کے لئے دیتا ہے ۔ اگر دنیا انصاف پر مبنی ہے تو نیکی کا فلاح یاب ہونا ضروری ہے اور ہر نیک آدمی یقیناً فلاح یاب ہوگا ۔ خواہ دنیا اس کے ساتھ کیسی ہی دشمنی کرے اور اسی طرح بدی کو کبھی فلاح نہیں ہو سکتی ۔ بدکار کی کامیابی عارضی ہوتی ہے ۔ وہ چند روز سے زیادہ گل چھرے نہیں اڑا سکتا ، اور بالآخر وہ اپنے کھودے ہوئے گڑھوں میں

خودگر جاتا ہے۔ انتقام وامتنان کے فطری احساسات کی عقلی بنیاد یہی ہے۔ یہ احساسات اگر فطری نہ ہوتے یا حق بجانب نہ ہوتے تو شعور انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کا بدلنا اور اس عقیدہ کا متزلزل ہوجانا ضروری تھا۔ مگر برخلاف اس کے وہ ترقی کر رہا ہے اور پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے جو اس کے حق بجانب ہونے کی صریح دلیل ہے۔

مل نے "افادیت" میں اور آدم اسمتھ نے اس مسئلہ کے نفسیاتی پہلو پر خوب بحث کی ہے خصوصاً آدم اسمتھ نے تو وضاحت کا حق ادا کر دیا ہے۔

جزا وسزا

جزا وسزا کی ابتدا بھی فطری احساسات ہی سے ہوتی ہے اور اس کے دائرہ کی وسعت وتنگی کا انحصار انسانی شعور کی ترقی پر ہے۔ جس کا شعور ابتدائی حالت میں ہوگا اس کے انتقامی والتنانی احساسات روابط کے تنگ دائرہ میں محدود ہوں گے اور جس کا شعور ترقی یافتہ ہوگا۔ اس کے احساسات میں اس مقدار سے اجتماعیت اور آفاقیت ہوگی۔ ایک ادنیٰ عقل کا آدمی اپنی ذات اور اپنے قریبی اعزا پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا اور فوراً انتقام پر آمادہ ہوجاتا، مگر ایک ترقی یافتہ شعور کے آدمی کو اپنے کنبہ رشتہ کی اتنی پروا نہیں ہوتی، جتنی اپنی جماعت اور قوم کی ہوتی ہے۔ وہ بعض حالات میں اپنے عزیز پر ظلم ہونا گوارا کر لیتا ہے مگر اس کی قوم پر جب کوئی حملہ کیا جاتا ہے تو وہ بیتاب ہوجاتا ہے اس سے آگے بڑھ کر جب آدمی شعور کے اعلیٰ مدارج کو پہنچتا ہے، تو قومیت سے انسانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نوع انسان کے کسی فرد کو وہ مظلوم نہیں دیکھ سکتا پس سزا کی خواہش فطری احساس پر مبنی ہوتی ہے اور برائی کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اسے فطرت انسانی نے اختیار کیا ہے۔ اس کی نوعیت خواہ کچھ ہو مگر اصل سزا کا حق بجانب ہونا مسلم ہے۔

سزا کا مقصد

مقصد سزا سے متعلق اصولی نظریئے تین ہیں۔ نظریہ امتناع، نظریہ اصلاح، اور نظریہ مکافات۔ نظریہ امتناع کے مطابق سزا کا مقصد صرف یہ ہے کہ ارتکاب جرائم کی روک تھام کی جائے۔ اور فقط ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ جن سے لوگ جرائم پیشہ نہ ہو سکیں۔ نظریۂ اصلاح یہ چاہتا ہے کہ اخلاقی تعلیم و تربیت کے ذریعہ مجرموں کو اصلاحی سزا دی جائے یعنی تعزیر کے بجائے ان کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ جرم کو خود برا سمجھ کر چھوڑ دے اور نظریہ مکافات کا مدعا یہ ہے کہ آدمی اپنے کئے کی سزا خود بھگتے۔ یعنی اسے معلوم ہو جائے کہ جو جرم وہ کرتا ہے اسے سوسائٹی کس نظر سے دیکھتی ہے۔ اور وہ خود اس کی ذات کے لئے کس حد تک نقصان دہ ہے۔ اول الذکر محض تہدید و تخویف تک بس کرنا چاہتا ہے۔ ثانی الذکر اس سے آگے بڑھ کر قید و بند کی "تو" تائید کرتا ہے۔ مگر صرف اس لئے کہ مجرموں میں اخلاقی روح پیدا ہو جائے اور وہ خود محسوس کرنے لگیں کہ جرم ایک انسان کے لئے اپنے اندر کیسی ذلت رکھتا ہے اور آخر الذکر کہتا ہے۔ کہ مجرم کا اپنے کئے کی سزا بھگتنا ایک فطری امر ہے۔ اگر سوسائٹی کسی مجرم کو سزا نہ دے، اور ثبوت جرم کے بعد بھی اس کے ساتھ رعایت برتے تو وہ جرم کی پرورش کرے گی، اور فساد کو اس کی اشاعت میں خود مدد دے گی۔ اگر چور کو چوری کی سزا نہ دی جائے اور اسے محض نصیحت و تعلیم کرکے چھوڑ دیا جائے تو وہ صحیح معنوں میں نہ نصیحت لے گا، نہ تعلیم، بلکہ اس کی ہمت اور بڑھ جائے گی اور اس کی جراتیں دو چند ہو جائیں گی قانون کوئی نصیحت و مشورہ کی کتاب نہیں ہے۔ کہ لوگوں کو محض وعظ و تلقین سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے بلکہ وہ ایسے احکام قطعیہ کا مجموعہ ہے جن کی خلاف ورزی اپنے ساتھ ایسے مقررہ نتائج رکھتی ہو کہ ہر شخص کو ارتکاب جرم کرتے وقت انہیں بھگتنے کا یقین ہو اور وہ انہیں ضرور بھگتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو نہ قانون کا اقتدار قائم رہ سکتا ہے اور نہ جرائم کی بندش ہو سکتی ہے۔

سزا کا صحیح اصول

مگر ہمارے خیال میں سزا کا مقصد ان تینوں پر حاوی ہے۔ اخلاقی سزا کا تقاضا صرف اس لئے کرتا ہے کہ جرم نہ ہو۔ اس کے لیے جس طرح تہدید و تخویف ضروری ہے اسی طرح تعزیر بھی ضروری ہے۔ اور اصلاح بھی۔ ان تینوں کو ملائے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ محض تہدید سے کام لیں تو یقین رکھیے کہ جو فطرت ایک دفعہ لذت جرم سے آشنا ہو چکی ہے وہ محض تہدید سے کبھی باز نہیں آئے گی۔ بلکہ آپ کے قانون کی پکڑ اتنی خفیف دیکھ کر اور جری ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر محض تعلیم و اصلاح سے کام لیجئے گا تو ممکن ہے بعض طبیعتیں اس سے باز آ جائیں۔ مگر مجرموں کی اکثریت آپ کے بندیخانہ کو محض ایک مدرسہ سمجھے گی جس میں جرم کرنے کے بعد انہیں کچھ مدت لکچر سننے کے لئے گذارنی پڑے۔ اور اگر صرف تعزیر ہی کو آلۂ کار بنائیے گا تو بعض ایسی طبیعتیں جو اصلاحی تعلیم و تربیت سے راہ پر آ سکتی ہیں ضرورت سے زیادہ سزا بھگت کر سزا کی عادی ہو جائیں گی۔ اور سزا کا رعب ان پر سے اٹھ جائے گا پس سزا ان تینوں پر مشتمل ہونی چاہئے۔ اور نفسیات کی مدد سے اس کے خاص خاص قوانین بنانے چاہئیں۔ مثلاً سنگین اخلاقی جرائم کی سزا اتنی سخت دینی چاہیئے۔ کہ نہ صرف مجرم ہمیشہ کے لیے اس سے ہمیشہ کے لئے اس سے توبہ کر لے۔ بلکہ اس سزا کے تصور سے دوسرے مجرم کانپ اٹھیں اور ارتکاب جرم کی جرأت نہ کر سکیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹ دیجئے زانی کو ۸۰ کوڑے لگائیے اور قاتل سے قصاص لیجئے۔ یہ ان جرائم کی انتہائی سزائیں ہیں جو نہ صرف مجرم کو ہمیشہ کے لئے جرم سے منع کر دیتی ہے۔ بلکہ تمام ایسی طبیعتوں کے لئے جو جرم کی طرف مائل ہوں ایک دائمی عبرت کا کام دیتی ہے۔ اس میں بظاہر ایک قسم کی وحشت معلوم ہوتی ہے مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہاتھ کی قربانی سے آپ ہزاروں انسانی طبیعتوں کی اصلاح کر دیتے ہیں۔ اور سینکڑوں مجرموں کے لئے منع و عبرت کا سامان کر دیتے ہیں۔ رہے خفیف جرائم تو ان کے لئے ارتکاب کے پہلے موقع پر صرف تہدید و

نصیحت کافی ہے لیکن اگر دوبارہ ارتکاب کیا جائے تو ایسی عبرت ناک سزا دینی چاہیئے کہ پھر مجرم ایسی جرأت نہ کرے۔ اس بارہ میں نفسیات کا اصول یہ ہے کہ جب اول اول آدمی جرم کرنا سیکھتا ہے تو اس کی طبیعت میں جرائم پیشگی پوری طرح راسخ نہیں ہوتی۔ اور محض اصلاحی تعلیم اور تھوڑی تہدید و تعزیر سے اس کا راہ راست پر آجانا ممکن ہے لیکن جب وہ اس اصلاحی عمل کے بعد دوبارہ ارتکاب کرے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لذت جرم سے اس حد تک آشنا ہو چکا ہے کہ نرمی کے برتاؤ اور نصیحت سے نہیں مان سکتا۔ ایسی حالت میں اسے وہ سخت سزا دینی چاہیئے جو اسے اس کے عمل کی انتہائی پاداش میں دی جا سکتی ہو۔ یہ اصول بالکل غلط ہے کہ مجرموں کو ان کے جرم کے مطابق سزا دی جائے۔ کیونکہ اس طرح تو وہ رفتہ رفتہ سزا بھگتنے کے عادی ہو جائیں گے۔ اور پھر سزا کا خوف ہی دل سے نکل جائیگا۔ سزا یا تو دی ہی نہ جائے اور مجرم کو راہ راست پر آجانے کے لئے موقع دیا جائے لیکن جب اس کی ضرورت ثابت ہو تو پھر ایسی دی جائے کہ مجرم اس کی بالکل توقع نہ کرتا ہو۔ ایک دفعہ مہینہ بھر، دوسری دفعہ ۶ مہینہ، پھر سال بھر، اس کے بعد دو سال، اس طرح تدریجاً بڑھنے سے مجرم قید کو کھیل سمجھنے لگتا ہے۔ اسے قید بھگتنے کی عادت ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ جیل کو گھر بنا لیتا ہے۔ نفسیات کے صحیح اصول پر اگر عمل کیا جائے۔ تو یہ سب سزا ایک ہی وقت میں اسے دے دینی چاہیئے تاکہ وہ پہلی ہی دفعہ ایسا سبق لے کہ پھر نہ بھولے۔

یہ بحث فلسفہ قانون سے متعلق ہے اور یہاں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ یہ بات صاف کر دینی چاہیئے کہ اگرچہ انسداد جرائم کے لئے علم الاخلاق سزا کی ضرورت تسلیم کرتا ہے اور جماعت کو فسادی مادوں سے پاک کرنے کے لیے اس نے تعذیر کی اجازت دی ہے مگر اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ سزا، تکلیف اور انسانی تعذیب کو پسند کرتا ہے نہیں اس کے نزدیک سزا کا وجود بہرحال جماعت کے لئے اخلاقی پستی کی علامت ہے اور ایک ایسی ناپسندیدہ شے ہے کہ اس کا وجود کسی

طرح نہ رہنا چاہیئے۔ وہ صرف ایسی مجبوریوں کی حالت میں اس کی اجازت دیتا ہے۔ جب تعلیم و اصلاح سے کام نہ چلے اور سوسائٹی کو فساد سے نجات دلانے کے لیئے اس کا استعمال ناگزیر ہو جائے۔

جرم کی ذمہ داری

اس بحث میں یہ جان لینا بھی ضروری ہے۔ کہ انسان اپنے افعال کا کس حد تک ذمہ دار ہے۔ بعض علمائے اخلاقیات جرم کو دیوانگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور مجرم کو سزا دینے کے بجائے قابل علاج بتلاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں گویا ان کے نزدیک کوئی مجرم اپنے فعل کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وارفتگی میں ارتکاب جرم کرتا ہے اور اس کے لیئے وہ یہ منطقی دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ عقل کبھی جرم کا مشورہ نہیں دے سکتی۔ پس اگر کوئی شخص جرم کرتا ہے۔ تو حالت معقولیت میں نہیں کرتا، اور جب حالت معقولیت میں نہیں کرتا تو دیوانہ ہے اپنے فعل کا ذمہ دار نہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ اس کے افعال اس کے ارادہ کے ماتحت نہیں۔ بلکہ حالات کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اور جب حالات اسے جرم پر مجبور کریں تو وہ کیوں اس کا ذمہ دار ٹھیرایا جائے۔ مگر یہ سب کچھ غلط ہے۔ انسان کو نہ حالات مجبور کرتے ہیں اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ جرم کرنے والا حالت معقولیت میں نہیں ہوتا۔ جرم کی اصلیت انسان کی وہ حرص ہے جو اسے لذت کا غلام بناتی ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اسے ناجائز ذرائع کی طرف مائل کرتی ہے یہ نفسیاتی مادہ اول اول اس کی سیرت پر اثر ڈالتا ہے اور رفتہ رفتہ اس پر قابض ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نفس عاقلہ سے اس کی جنگ ہوتی ہے۔ مگر جب اس کی قوت اختیاری اس مادہ کی اعانت کرتی ہے تو عقل مغلوب ہو کر خود حرص کے لئے آلہ کار بن جاتی ہے۔ پھر جب اس بد خیالی کو وہ عمل کی صورت میں لانے کا اقدام کرتا ہے، تو ضمیر جو سوسائٹی کے اخلاقی قوانین کا پروردہ ہوتا ہے اسے روکتا ہے۔ مگر وہ اس کی بھی نہیں سنتا، اور جرم کر بیٹھتا ہے۔ پس یہ خود انسان کا قصور ہے کہ وہ اس حرص کی بندگی اختیار

کرتا ہے، عقل کو اس کا غلام بناتا ہے اور ضمیر کی آواز سے کان بند کر لیتا ہے اس کی ذمہ داری سے اگر اس کو بری کیا جائے، تو یہ اس کی ہمت افزائی ہے، اور اس کے جرم پیشہ نفس کی پرورش۔ وہ اگر مجنون بھی ہے تو ایسا مجنون جسے پاگل خانہ کے بجائے بندی خانہ بھیجنا چاہیئے ۔ اس کا مرض اگر علاج بھی چاہتا ہے تو دواؤں کا نہیں بلکہ سزاؤں کا۔ اسے مجبور سمجھنا ایک غلطی ہے۔

یہ سچ ہے کہ بعض حالات میں ذی ہوش انسان اپنے عمل کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مثلاً اضطراری طور پر نا واقفیت میں اس سے کوئی فعل سرزد ہو جائے، یا محض بیخبری کے عالم میں اس کی حرکت کسی ایسے فعل کی محرک ہو جائے جس کا سامان خود اس نے نہیں کیا ہے۔ مگر یہ صورتیں شاذ ہیں اور ان میں بھی بعض ایسی صورتیں ہیں جن کی ذمہ داری اس پر عائد ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص عمداً شراب پی کر بیخبری کے اسباب مہیا کرے اور پھر اس سے اس حالت میں کوئی فعل سرزد ہو جائے تو اگرچہ وہ براہ راست اس فعل کا ذمہ دار نہیں ہے مگر اس پر ایسی حالت پیدا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ارتکاب جرم کا سبب بنی ہے۔

ندامت یا اذیت ضمیری

جب آدمی سے کوئی برا فعل سرزد ہو جاتا ہے، اور اس کی برائی اسے معلوم ہو جاتی ہے تو وہ ایک خاص تکلیف محسوس کرتا ہے جس کو اذیت ضمیری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اذیت کی وجہ ہمارے فعل اور نصب العین کے درمیان اختلاف یا تفاوت کا احساس ہوتا ہے اور اسی لئے یہ اذیت ہمارے گناہوں کے برابر نہیں بلکہ اس اختلاف کے برابر ہوتی ہے جو ہمیں اپنے گناہوں اور اپنے اخلاقی نصب العین کے درمیان نظر نظر آتا ہے ایک سنگدل گناہ گار اس اذیت کو بمشکل محسوس کرتا ہے کیونکہ اس نے اپنی سیرت کو ایسے خیالات اور عقائد میں پرورش کیا ہے کہ اس کے کام اس کے نصب العین سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ذہنی ماحول سے وسیع تر کسی

ایسے ماحول کا بہت کم خیال کرتا ہے جس کا اخلاقی درجہ اس سے بلند ہو اور جب کبھی اسے کوئی ایسا خیال آجاتا ہے تو وہ ایک خفیف سی اذیت محسوس کرتا ہے جو صرف ہو کر رہ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے ایک ذکی الحس آدمی جو بلند اخلاقی ماحول میں رہتا ہے۔ اس سے جب کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو نہ صرف اس کا ضمیر سخت اذیت محسوس کرتا ہے۔ بلکہ اسے عرصہ تک یہ خیال ستاتا رہتا ہے کہ وہ اپنی سطح سے گر گیا ہے۔ اخلاقیات میں ندامت اسی استمراری احساس کا نام ہے جو انسان کو اس کے برے عمل یا اعمال پر اپنی سیرت کے بگڑ جانے کے متعلق پیدا ہو جائے اور اسے یہ فکر پیدا ہو کہ اس کی سیرت محتاجِ اصلاح ہے۔

بعض علماء نے ندامت کا لفظ صرف انہی گناہوں تک محدود سمجھا ہے جن کے لئے توبہ مستلزم نہیں ہے لیکن اس کو خلشِ ضمیری کی تمام صورتوں تک وسیع سمجھنا چاہیئے۔

ندامت کا قدرتی نتیجہ

جذبۂ ندامت کا قدرتی نتیجہ اصلاح ہے۔ اگر انسان احساسِ ندامت کے بعد اصلاح کا عادی ہو جائے تو یہ احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کی سلیم فطرت اسے ہر کمزوری پر ملامت کرتے کرتے اس میں اپنی سیرت کو پاکیزہ تر کرتے جانے کی عادت پیدا کر دیتی ہے لیکن اگر کوئی انسان ندامت کے قدرتی منشا کی خلاف ورزی کرے اور صرف اسے محسوس ہی کر کے رہ جائے تو یہ احساس روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے اس کی پاکیزہ حسیات ضعیف ہوتی جاتی ہیں، اور آخر وہ اخلاق کے عالمِ اعلیٰ سے گر کر پست اور پست تر عالم میں جانے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ زندگی کے لئے کسی اعلیٰ نصب العین کی تخصیص نہیں ہے۔ انسان ادنےٰ عالم میں بھی رہ کر ادنےٰ نصب العین کو بھی پیش نظر رکھ کر جی سکتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ عالمِ اعلیٰ کے رہنے والوں سے زیادہ کامیاب دنیاوی زندگی

بسر کر لیتا ہے۔ مگر انسانیت کی تکمیل، نفسِ عاقلہ کی تہذیب، سوسائٹی کی ترقی اور اخلاق کے انتہائی درجات تک پہنچنے کے لئے بلند نصب العین اونچی نظر اور بہترین اخلاقی ماحول ناگزیر ہے۔ ہر ندامت اور ضمیر کی ہر کوشش ہمیں بلند اور بلند سے بلند تر درجات تک پہنچنے کی دعوت دیتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ ہم عالم سفلی کا رہنا چھوڑ دیں۔ اگر اس کی تنبیہوں سے ہم ہر بار اپنی روحِ عمل کو تیز اور تیز سے تیز تر کرتے رہیں تو رفتہ رفتہ ہماری ماہیت بدل جائے گی۔ ہم سے بڑے اعمال کا صدور بند ہو جائے گا۔ اور پھر آگے بڑھ کر برا خیال بھی ہمارے قلب میں جگہ نہ پا سکے گا۔ بعض پرجوش مذہبی علماء کا خیال ہے کہ ایسے تزکیہ کے بعد گناہ کا ارتکاب قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور اسی عقیدہ نے یوحنا سے یہ الفاظ لکھوائے ہیں کہ :

" جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے۔ گناہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس کا تخم اسی میں رہتا ہے اور وہ گناہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔"

اگرچہ اس حد تک بڑھنا مبالغہ ہے۔ کیونکہ نہ انسان خدا سے پیدا ہوا ہے، نہ ہو سکتا ہے، اور نہ اس کا مبرا عن الخطا ہونا ممکن ہے۔ وہ احتساب اعمال اور تزکیہ نفس سے اگر کچھ کر سکتا ہے تو صرف اتنا کہ اپنے ارادوں کو برائی سے پاک کر لے۔ اپنے اعمال و افعال کو اس کے تابع کر دے، اور بہ حیثیت مجموعی اپنی سیرت کو پاکیزہ بنائے۔

یہ جو کچھ لکھا گیا شخصی زندگی کے اخلاقی معائب سے متعلق تھا۔ اب ایک نظر اجتماعی عیوب پر بھی ڈالنی چاہیئے۔

اجتماعی عیوب

جس طرح افراد میں اخلاقی عیوب و محاسن ہوتے ہیں، اسی طرح جماعت میں بھی اخلاقی عیوب و محاسن پائے جاتے ہیں۔ یعنی یا تو اس کے شعائر افراد کو اعلیٰ سطح کی زندگی اختیار کرنے میں مدد دیتے ہیں، یا اس میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اور اسے بلندی پر جانے کے بجائے پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اچھا تمدن چاہتا ہے کہ اجتماعی

نظام کا دروبست ایسا ہو کہ نیکی اور خوش عملی امکانی حد تک آسان اور بدی و بدعملی انتہائی حدود تک دشوار ہو جائے۔ لیکن جو نظام تمدن آج ہم میں رائج ہے وہ زیادہ تر رذائل معائب سے مرکب ہے، اور اس کی تعمیر میں بدی کے استیصال کی مطلق کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس میں مدنیت کی غایت، شرافت و نیک نفسی کے لئے عرصہ تنگ اور بدی و بدعملی کے لئے میدان وسیع ہے۔ اچھے کاموں میں دشواریاں اور برے کاموں میں آسانیاں ہیں، انسان صحیح معنوں میں خوش خلق اور خوش معاملہ بن کر رہنا چاہے تو اس تمدن کی آب و ہوا اس کے لئے سمیت سے پر ہے۔ لیکن اگر ناجائز طریقوں سے عظمت حاصل کرنا چاہے تو اس کی آغوش تربیت اس کے لیے کھلی ہوئی ہے، دولت و قوت ایمانداری سے خار کھائے بیٹھی ہے اور بددیانتی سے اس نے رشتہ جوڑا ہے، شرافت و انسانیت کا کوئی مفہوم نہیں رہا۔ دولت مند عیش کے خوگر ہیں، حاکم جفا پیشہ ہیں۔ کمزور غلامی کرتے ہیں۔ اور قوت والے اپنے آپ کو آقائی کا مستحق جانتے ہیں۔ ترقی کے تمام ذرائع ان کے ہاتھ میں ہیں جو برائی کے علمبردار ہیں، اور بے مائگی ان کے حصہ میں آئی ہے جو جماعت کو اس کے اخلاقی نصب العین تک لے جانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ایسے نظام تمدن میں جماعت کوئی ترقی نہیں کر سکتی اور خواہ افراد اپنے اندر محاسن پیدا کرنے کی کتنی ہی کوشش کریں مگر ایسی اجتماعی آب و ہوا میں ان کا چمن کسی طرح سرسبز نہیں ہو سکتا۔

انقلاب

افراد کو حق ہے کہ اس نظام تمدن کے خلاف جنگ کریں۔ اگر وہ محض اصلاحی کوششوں اور تبلیغ و ہدایت سے درست ہو جائے تو بہتر، ورنہ ایسے تمام ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جن سے اس مہلک اخلاقی مرض کی دوا ہو سکے۔ جس طرح ایک بڑی بلا کو دور کرنے کے لئے ایک چھوٹی بلا کو اختیار کر لینا جائز ہے۔ ایک مہلک بیماری کو دور کرنے کے لئے جراحی عمل کرایا جا سکتا ہے اور ایک سنگین جرم کی روک تھام کے لئے سنگین تعزیر کا استعمال درست

سمجھا جاتا ہے، اسی طرح جماعت کو ایک ہلاکت خیز نظام تمدن سے نجات دلانے کے لئے وہ سب ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ جو خواہ اپنی ذات میں کتنی ہی اخلاقی برائی رکھتے ہوں مگر اپنے خاصہ میں ایک بڑی اخلاقی برائی کو دور کرنے کی قوت ان میں موجود ہو، زبان، قلم اور تلوار تینوں کی قوتیں اس کے خلاف صرف کر دینا جائز ہے، زبان سے اس کی مخالفت کرنا، قلم سے اس کے خلاف اشاعت کرنا اور تلوار سے اس کی جڑوں کو کاٹنا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاقی فساد کو دور کرنے کے لئے اخلاقی فساد کرنا ایک اخلاقی گناہ ہے مگر اس کے جواب میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ایک غلط نظام کی بیخ کنی کے لئے ضروری اور مناسب ذرائع کے استعمال کو اخلاقی گناہ سے تعبیر کرنا خود ایک گناہ ہے۔ آپ اگر غلط نظام تمدن کو اکھاڑنے کے لئے ان طریقوں کے استعمال کو گناہ کہہ کر روکتے ہیں جنہیں استعمال کئے بغیر اسے اکھاڑا نہیں جا سکتا۔ تو یقیناً آپ ایک طرح سے اس نظام کی اعانت کرتے ہیں اور اسے باقی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ مسلّم کہ جماعت کی صلاح و فلاح کے مقابلہ میں افراد کی صلاح و فلاح کوئی شئے نہیں اور اگر یہ صحیح کہ جب افراد کی بہتری جماعت کی بہتری کے منافی ہو تو اس بہتری کو قربان کر دینا چاہیئے تو پھر آپ کیوں جماعت پر ایسے افراد کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں جو جماعت کو اخلاقی پستی میں مبتلا رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ جب آپ یہ مانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے انسان کے حق زندگی میں دخل دے اور اسے قتل کرے تو اسے حق زندگی سے محروم کر دینا جائز ہے اور جب آپ نے انصاف کے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ جس شخص نے کسی کے حق ملکیت پر غاصبانہ حملہ کیا ہو اسے اس حرکت پر سزا دینی چاہیے تو ایسے لوگوں کو سزا دینے میں کیوں تامل ہے جو ایک نہ دو، پوری جماعت کے حق آزادی، حق، حق ملکیت، حق زندگی اور تمام حقوق میں دخل دیتے ہیں۔ اور اسے اپنی اغراض کا غلام بنا کر محض اپنی ذاتی ترقی کے لئے اس کے ذرائع کو ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ ایسے افراد کو جماعت کی پامالی کا مزید موقع دیا جائے اگرچہ وہ جائز اور پر امن ذرائع سے راہ راست پر نہ آئیں تو ان کے خلاف موثر اور مناسب ذرائع کا استعمال قطعاً جائز ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم خونریزی کی تلقین کرتے ہیں، ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ سوسائٹی کو ایک مہلک اور تباہ کن نظام سے نجات دلانے کے لئے جو ذرائع بھی ضروری ہوں۔ ان کا استعمال جائز ہے۔ لفظ ضروری صاف طور پر اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ کوئی اسٹیپ بلا ضرورت نہ چلا جائے۔ اگر صرف تعلیم و ہدایت سے کام نکل جائے تو تلخ زبانی فضول ہے، اگر صرف تلخ زبانی اور ملامت سے کام نکل سکے، تو آہنی جنگ بیکار ہے۔ اور اگر آہنی جنگ ہی کارآمد ہو تو خونریزی فضول۔ مگر یہ نہ ہو تو ہم اصلاح کی بیجا پابندی کر دیں۔ اور کسی ایسے ذریعے کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیں جس کی ایسی پاک اور شریف جنگ میں ضرورت واقع ہو جائے۔ اخلاق کو چھوئی موئی کا درخت نہ بنائیے کہ وہ صرف نرمی ہی نرمی سے کام لیتا ہے۔ اور سختی اس کی فطرت سے بعید ہے۔ وہ ہر حالت میں عدالت سے کام لیتا ہے۔ اس لئے آئین میں نرمی نرمی کی جگہ ہے اور سختی سختی کی جگہ وہ معاصی کو بخش دینے میں جتنا نرم ہے، جرائم کے انسداد میں اتنا ہی سخت ہے اسے محاسن سے جتنی محبت ہے۔ معائب سے اتنی ہی نفرت ہے۔ وہ نہ محض نرم ہے اور نہ محض سخت۔ اس کی نرمی و سختی حالات پر منحصر ہے اور اس کے طرز عمل کا محور انسانی صلاح و فلاح ہے۔ انسان کی بہتری جب نرمی چاہتی ہے تو وہ نرمی کرتا ہے۔ اور جب سختی چاہتی ہے تو وہ سخت ہو جاتا ہے۔ تم کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اخلاق محض عفو اور مہربانی کے اجزا سے تعمیر ہوا ہے۔

اس حصہ مضمون تفصیل طلب مباحث کی تفصیل کے لئے ہمیں مرسیر کی Conduct & Its Disorders مارلن کی Crime and Its Causes ماڈسلے کی Body and Mind ہیگل کی Philosophy of Rights اسٹیفن کی Social Rights & Duties ٹیلر کی Problem of Conduct وغیرہ کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ مگر بعض مسائل میں جہاں ان علمائے اخلاقیات سے راقم نے اختلاف کیا ہے۔ وہ خود راقم کی ذاتی رائے سے تعلق رکھتے ہیں ۔

۶۔ شیرازہ اجتماعی کی اخلاقی ترکیب

اس بحث میں ہم چاہتے ہیں۔ کہ شیرازہ اجتماعی کے اجزا اور اس کی ترکیب پر ایک نظر ڈالیں اور اس سلسلہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اخلاقی روشنی میں دکھانے کی کوشش کریں۔

حیاتِ اجتماعی دراصل ایک شیرازہ ہے اور اس شیرازہ بندی سے جو علایق پیدا ہوتے ہیں وہ اجتماعی زندگی کے مختلف حصے ہیں جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان حصوں میں خصوصیت کے ساتھ جو قابل ذکر ہیں وہ خاندان، سوسائٹی، مذہب، حکومت، اور کاروبار ہیں۔ یہاں ایک ایک کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے۔

خاندان

اس شیرازہ بندی میں پہلی چیز خاندان ہے۔ اور اس کی بنیاد فطری الفت و محبت پر ہے اس زندگی پر ارسطو نے سیاسیات میں ڈیوای نے Studies of Family Life میں رکای نے Moral Philosophy اور ہیگل نے فلسفہ صواب میں خوب بحث کی ہے۔

خاندان کی ابتدا طفلی کی بے چارگی سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انسان جب آنکھ کھولتا ہے تو اسے اپنے ماں باپ کی صورت نظر آتی ہے۔ ان سے زیادہ اس کے ساتھ کوئی پیار محبت کرنے والا نہیں ہوتا اور وہی اس کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ خاندانی زندگی میں سب سے زیادہ اس کا تعلق انہی دونوں سے ہوتا ہے اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے ماں باپ سے ادب محبت اور اطاعت کے ساتھ پیش

آئے۔ ان کی عزت دنیا میں سب سے زیادہ کرے۔ ان کی خوشنودی کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھے ان کی خدمت اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے اور ان کی اطاعت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کرے۔ والدین کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اولاد کی خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ اپنی ذاتی محبت یا منفعت کی خاطر ان کی زندگی کو برباد نہ کریں۔ ان کے اندر فضائل حسنہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی صحت اور قوائے عقلی و فعلی کے نشوونما کا خیال رکھیں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوشش کریں اور اس تعلیم میں اپنی مرضی کو دخل دینے کے بجائے ان کی ذہنی قابلیت اور رجحان طبع کو مدنظر رکھیں۔ والدین کے بعد دوسرے خاندانی رشتہ دار بھائی، بہن، چچا، ماموں، اور نزدیک دور کے اعزا ہیں۔ انسان اگر ان کے ساتھ موانست والفت کے تعلقات رکھے تو ان میں اپنے بہترین دوست پائے گا اور اس کی خاندانی زندگی بلکہ بیرونی زندگی بھی ایک حد تک خوشگوار گزرے گی اور اگر ان تعلقات کو کشیدہ رکھے تو اپنے بدترین دوست بھی اسے انہی میں ملیں گے اور اسے خاندانی مناقشات کی نہایت تلخ زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ پس ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے کہ اپنے خاندانی اعزا و اقربا سے خلوص محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آئے۔ تیسرا درجہ خاندانی زندگی کا عملی پہلو ہے، یہ دو آدمیوں کے عمر بھر کا ساتھ ہے۔ جس میں ایک دوسرے کے دکھ درد، بھلائی برائی اور مصیبت و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ اس کو ایسے اسلوب پر قائم ہونا چاہیئے کہ آپس میں محبت و موانست اور اعتماد ہو۔ اگر یہ تعلق باہمی محبت پر قائم نہ ہو تو دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور دنیا کا کوئی قانون اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی چیز جس کا ان تعلقات کو قائم کرتے وقت لحاظ رکھنا ضروری ہے، انتخاب، توافق مزاج، نکاح کے مقصد، اور حیات منزلی کی نزاکتوں کو سمجھ لینا ہے عام طور پر ان باتوں کا خیال نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے اکثر شادیاں ناکام اور حسرت انجام ہوتی ہیں سوشل ریفارم کا بہترین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے عوام کی اخلاقی تربیت کرے اور انہیں شادی کے صحیح اصولوں سے آگاہ کرے

دوستی

خاندانی زندگی کے بعد دوسرا درجہ دوستانہ زندگی کا ہے۔ انسان جب ذرا ہوش سنبھالتا ہے۔ اور اپنے گھر سے نکل کر باہر کی دنیا کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے میلان طبع یا اپنے اثرات ماحول کے مطابق ایک سوسائٹی ملتی ہے اور اس میں وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ تعلقات قائم کرتا ہے۔ یہ اس کی دوستانہ زندگی ہے جس کو حیات اخلاقی میں بڑا دخل ہے۔ صحبت جس قسم کی بھی ہو۔ اکثر انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے اور عام طور پر وہ نہ صرف عادات، خصائل اور خیالات میں اس سے اثر لیتا ہے بلکہ اپنی عملی زندگی میں کوئی ایک لائن اختیار کرتے وقت بھی اس کی صحبت اور سوسائٹی اسی کی رہنمائی کرتی ہے ——— کسی نے خوب کہا ہے کہ دوست کے اندر اپنی ہی ذات ایک دوسرے "قالب میں مل جاتی ہے۔ اور اس طرح اپنی شخصیت کا دائرہ بعنوان حسین نسبتاً وسیع ہو جاتا ہے" اس زندگی کے لئے کوئی قانون اور آئین نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ ہر دوستانہ صحبت نئے حالات اور نئے خیالات میں ایک جدا نہج و اسلوب پر واقع ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ایک اخلاقی اصول ہے کہ انسان اپنے لئے ایک اچھی صحبت کو تلاش کرے۔ دوستانہ تعلقات کو خلوص پر قائم کرے اور دوستوں کے ساتھ اس ڈھنگ سے علائق و روابط قائم کرے۔ کہ وہ اغراض پر تو مبنی نہ ہوں۔ مگر زندگی کے اعلےٰ نصب العین کو حاصل کرنے میں پوری پوری مدد دیں۔

مذہب

سب سے زیادہ زبردست چیز جو حیاتِ انسانی پر اثر ڈالتی ہے وہ مذہب ہے اس کی بنیاد روحانیت پر ہے اس لئے وہ تمام مادی اثرات پر تفوق رکھتا ہے۔ اور روحانیت بھی ایسی کہ اس کے عقائد اور اصول انسان کی ذہنی دنیا پر حاکم ہوتے ہیں۔

ماں باپ اور آل اولاد کی محبت، میاں بیوی کی الفت، دوستوں کی دوستی، حتی کہ خود اپنی جان کی فکر سب کچھ اس کے سامنے ہیچ ہے۔ اس کے ہاتھوں میں انسان کی باگیں ہیں وہ جدھر چاہے اس کو موڑ دے اور جس طرف چاہے اسے مائل کر دے جماعتوں کے ذہنی ارتقا اور ان کے اخلاقی نظام کی تخلیق کا دار و مدار بڑی حد تک اسی پر ہے۔ مثلاً جس قوم کا مذہب ترک دنیا اور رہبانیت کے اصول پر قائم ہوگا وہ تمدن و عمرانیت سے نا آشنا رہے گی۔ جس قوم کے مذہب میں احترام حیات اور اہنسا کے اصول غالب ہوں گے وہ فطرتاً فوجیت اور جنگی روح سے محروم ہوگی، جس قوم کا مذہب فضائل اخلاق اور فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم ہوگا۔ وہ لازماً بلند اخلاق اور عالی حوصلہ ہوگی۔ وقس علیٰ ہذا۔ پس یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو اپنے مطمح نظر کی تکمیل میں سب سے زیادہ جو چیز مدد دیتی ہے وہ اس کا مذہب ہے یہاں موقع نہیں کہ تفصیل کے ساتھ ایک سچے فطری مذہب کے اصولوں پر بحث کی جائے اور یہ بتلایا جائے کہ جماعت انسانی کے لئے کونسا مذہب ایسا ہے جس پر عمل کر کے وہ اپنے اخلاقی نصب العین کو حاصل کر سکتی ہے، کیونکہ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اخلاقی حیثیت سے صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ خواہ کوئی مذہب ہو، بہر حال لا مذہبیت سے بہتر ہے اور اگر اس کے بنیادی اصولوں پر غور کیا جائے تو ضرور وہ کسی نہ کسی بلند اخلاقی مقصد کو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ پس دنیا سے مذہبی تعصب اور عناد کو مٹانا ہر اس شخص کا فرض ہے۔ جو دنیا کو بلند اخلاق اور خوشحال دیکھنا چاہتا ہے، ہر شخص اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور اس کے ذریعے اپنے اخلاقی نصب العین کو تلاش کرنے میں پوری طرح آزاد ہو، دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہو، اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اور کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے صرف اس بنا پر عناد و مخالفت نہ رکھے کہ اس کا تعلق دوسرے مذہب سے ہے اس کے ساتھ ہی ہر شخص کو پورا حق حاصل ہو کہ اپنے نزدیک جس مذہب کو حق پر سمجھتا ہے۔ اس کی طرف بغیر کسی دوسرے مذہب پر حملہ کئے، اپنے ابنائے نوع کو دعوت دے۔ اور مقصد صرف یہ پیش نظر رکھے کہ اس کا فرض اپنے خیال کے مطابق

دوسروں کو راہ حق دکھانا ہے۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ چونکہ دنیا اختلافات مذہبی کے جھگڑے میں پڑی ہوئی ہے۔ خصوصاً ہمارا ملک اس بلائے عظیم کے باعث سخت اخلاقی انحطاط میں پڑا ہوا ہے اس لئے عام مذہبی آزادی و رواداری کی تحریک فلاح انسانی کے لئے بہت ضروری ہے۔

حکومت

اجتماعی تعلقات کی سب سے زیادہ بالادست قوت حکومت ہے۔ درحقیقت اس کا منشا یہ ہے کہ اجتماعی قویٰ کو مرکز پر قائم کرے۔ اجتماعی نظام کو عادلانہ تنظیم کے اصول پر آئین و قوانین کے ذریعہ منظم کرے۔ جماعت کو شر و فساد کے مادوں سے محفوظ رکھ کر امن و امان کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع دے۔ جماعت کے لئے وہ تمام ضروری سامان بہم پہنچائے جو اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں، اور دوسری قوموں کی دراز دستی سے جماعت کی پُرامن زندگی کو محفوظ کرنے کے لئے دفاع کا انتظام کرے۔ ان فرائض کو ادا کرنے کے لئے اس کا حق ہے کہ جماعت سے اپنے جائز احکام و قوانین کی اطاعت کا مطالبہ کرے۔ ان انتظامات کے لئے جتنا روپیہ ضروری ہے وہ تضریب محاصل کے ذریعے وصول کرے اور جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے جن قوانین کی ضرورت ہے۔ وہ وضع کرے۔ یہ حکومت کوئی خارج از جماعت شئے نہ ہونی چاہیئے اور نہ کسی خاص فرد یا چند افراد کی ذاتی ملک ہونی چاہیئے بلکہ وہ جماعت کے لئے اور جماعت ہی کی ہونی چاہیئے۔ جماعت ہی اپنی آزاد رائے عامہ سے، اس کے منتظمین کو مقرر کرے۔ جماعت ہی کی مرضی کے مطابق وہ حکومت کا انتظام کریں۔ اور جماعت ہی سے ان کو قوت حاصل ہو۔ اور جماعت ہی کی بہتری کے لئے وہ اس قوت کو صرف کریں۔ اور جماعت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ جب راعیین حکومت اس کی مرضی کے مطابق کام نہ کرسکیں یا اپنی ذاتی رائے کا جماعت کو غلام بنانے کی کوشش کریں تو وہ ان کو الگ کرکے دوسرے آدمیوں کو مقرر کرے۔

حکومت کا صحیح اخلاقی معیار دراصل یہی ہے۔ مگر چونکہ حکومت کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں اپنے جیسے انسانوں کی باگیں ایک شخص یا چند اشخاص کے ہاتھوں میں آتی ہیں۔ اور ایک انسان کے لئے اس میں بڑی لذت ہے کہ اسی جیسے ہزاروں انسان اس کے آگے جھکیں۔ اور اس کی غلامی کریں۔ اس لئے قوی الارادہ اور غیر معمولی قابلیتوں کے انسانوں نے حکومت کو اپنی ذاتی ملک بنا کر دنیا میں شخصی و استبدادی حکومتوں کی بنیاد ڈال دی ہے۔ جو درحقیقت ایک غیر طبعی اور غیر اعتدالی حالت ہے اس کے ماتحت جماعت کے قوائے ذہنی وعملی ترقی کرنے کے بجائے انحطاط کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ اپنے صحیح نصب العین کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسانی جماعتوں کو اس بلا سے نجات دلائے اور دنیا سے غاصبانہ نظام حکومت کو مٹا کر سچے اصولِ عدل پر حکومت کی بنیادوں کو قائم کرے چونکہ حکومت کے ہاتھوں میں جماعت کی تمام مادی قوتیں ہیں۔ جن کے صحیح یا غلط استعمال پر جماعت کے تمام مادی اخلاقی قویٰ کے ارتقاد انحطاط کا پورا پورا انحصار ہے۔ اس لئے ایک صحیح نظام حکومت کا قیام جماعت کے لئے ہر حیثیت سے نہایت ضروری ہے۔

کاروباری زندگی

کاروباری زندگی انسان کی خالص عملی زندگی ہے جس کی بنیاد صرف معاملات ومعاہدات پر ہے وہ انسان کے لئے میدان عمل ہے جس میں اگر وہ کامیاب اترے تو اس کی زندگی کامیاب، اور ناکام ہو تو اس کی زندگی ناکام ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ خالص مادی زندگی ہے۔ مگر اس کو اخلاقی زندگی میں بھی بڑا دخل ہے۔ کیونکہ انسان کی صحیح اخلاقی تکمیل اس کے معاملات ہی میں ہوتی ہے۔ اس کے اخلاق کو جماعت کے کاروباری نظام کی اصولی تنظیم میں ایک حد تک دخل ہونا چاہیئے۔ معاملات کا یہ پہلو کہ ان میں کن چیزوں کو بڑھانا اور کن چیزوں کو گھٹانا چاہیئے۔ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور یہ سوال کہ کن طریقوں

پر معاملات کامیاب ہو سکتے ہیں اور ان پر کس طرح عمل کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب سیاسیات اقتصادیہ کے ذمہ ہے۔

کاروباری زندگی میں مساویانہ تعلقات کم تر اور بالادستی و زیردستی کے تعلقات بیشتر ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے انسانی حقوق کا احترام واجب ہے۔ جو شخص کسی کے حقوق میں دست اندازی کرے۔ یا اس کو زیردست سمجھ کر ذلیل کرے یا اپنے جیسا انسان نہ سمجھے تو اس کی بالادستی کے زور کو توڑنا سوسائٹی کا فرض ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کاروباری تعلقات میں ماتحتی و زیردستی کی حد بندی کر دی جائے اور اس کو غلامی کے درجہ تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ اسی طرح چونکہ معاملات کی بنیاد معاہدات پر ہے۔ اس لئے معاہدات میں دیانت و صداقت کو ہر بات پر مقدم رکھا جائے اور سوسائٹی کی متحدہ قوت ہر کاروباری شخص کو راست بازانہ اصول پر کام کرنے کے لئے مجبور کرے۔

اکثر لوگ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ تمدن جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اتنا کاروباری زندگی میں رفق اور محبت کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے۔ پہلے ارباب معاملہ کے باہمی تعلقات رفیقانہ ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات ان میں خاندانی تعلقات کی جھلک پائی جاتی تھی، مگر اب بقول کارلائل سوائے "روپے کے تعلق" کے نہ مربیانہ شفقت ہے اور نہ وفاداری۔ لیکن یہ بات دراصل قابل افسوس نہیں ہے، رفیقانہ تعلق جب کسی فطری محبت پر مبنی نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ نہایت آسانی سے تلخ انجام صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ اس حالت کو ایک بہتر صورت پر لانے کے لئے صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ کہ ان تعلقات کو راستبازانہ معاہدات پر قائم کیا جائے اور جہاں تک معاملات کا تعلق ہے کسی قسم کے دوسرے تعلقات کو اس کے ساتھ آمیز نہ کیا جائے اس طرح صاحب معاملہ آدمیوں کے تعلقات کاروباری حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتے، نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیجا توقعات قائم کر سکتے ہیں۔ اور نہ ایسی توقعات کو صدمہ پہنچنے سے ان میں کشیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ معاملات کو صحیح اصولوں پر چلانیکے

لیے صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے بدنظمی، ناانصافی اور بدمعاملگی کا سدباب ہو سکتا ہے، رہا یہ معاملہ کہ خادم و مخدوم، آڑھتیہ اور ایجنٹ اور چھوٹے بڑے تاجروں کے ذاتی تعلقات کن بنیادوں پر ہونے چاہئیں تو اس کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ ان میں بھی رفق و محبت کو دخل نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ان کے معاملاتی تعلقات کو نقصان پہنچتا ہے۔ انہیں صرف ہم وطنی، ہم پیشگی اور عام انسانی ہمدردی پر قائم ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایک دوسرے کی معاونت، دستگیری اور ہمدردی کی طرف مائل رہے۔ مقصد دراصل یہ ہونا چاہیئے۔ کہ بالادستی و زیردستی کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کی جائے اور ان کو ایسے اصولوں پر قائم کیا جائے کہ نہ تو ان سے معاملات کو کوئی نقصان پہنچے اور نہ کاروباری آدمیوں کے باہمی تعلقات میں کوئی کشیدگی ہو۔

اخلاقی کاروبار کے اس حصہ سے کوئی بحث نہیں جو اشیائے تجارت کی مانگ اس کے تغیر و تبدل اور تجارتی معاملات کے اتار چڑھاؤ سے متعلق ہے۔ کیونکہ وہ موضوع اخلاق سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا البتہ اس حیثیت سے کہ مانگ کی کمی و بیشی جماعت کے مذاق و عادات کے تغیر و تبدل کا نتیجہ ہوتی ہے اخلاق یہ دیکھ سکتا ہے کہ جن چیزوں کی مانگ بازار میں بڑھ رہی ہے وہ جماعت کی اخلاقی حالت کے کس پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر بازار میں اسباب طباعت اور لکھنے پڑھنے کی چیزوں کا زیادہ زور ہے تو خیال کیا جاتا ہے۔ کہ جماعت کا میلان علم کی طرف زیادہ ہے، اور اگر اسباب زینت و آرائش کی بکری زیادہ ہے۔ تو فوراً ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے۔ کہ جماعت کا میلان عیش و عشرت کی جانب ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی دیکھ سکتا ہے۔ کہ جن پیشوں سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ حیات انسانی کے لئے مضر تو نہیں ہیں۔ پس اس نقطہ نظر سے تمام لوازم تمدن سے بحث کی جاتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جو چیزیں اخلاقی حیثیت سے جماعت کی زندگی پر کوئی برا اثر نہیں ڈالتیں۔ اور جن کے تیار کرنے والوں کو جسمانی حیثیت سے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا۔ ان کا کاروبار درست ہے اور جن کا حال اسکے برعکس ہے وہ ناجائز ہیں۔

اس مسئلہ پر علماے اخلاقیات میں بہت دلچسپ اور مفید بحثیں ہوئی ہیں۔ خصوصاً اسباب عیش و تنعم کے متعلق لسکنٹ کی مسیحی تمدن ، میکن کی Ethics of Citizenship اور اسٹیفن کی Rights Duties میں بہت کچھ لکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو میں اخلاق اس بات کا خیال رکھتا ہے۔ کہ اجتماعی فوائد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اور افراد کے تمام اعمال اجتماعی ترقی کے لیئے ہوں دوسرے الفاظ میں وہ آخری معیار جس پر علم الاخلاق تمام معاملات اور تمدنی کیفیات کو جانچتا ہے محض اجتماعی مفاد ہے۔ مگر ایک عرصہ سے انفرادی اغراض کے تغلب نے اس اجتماعی مفاد کو اپنا تابع بنا رکھا ہے اور جماعتوں کے مصالح کو قوی افراد اپنے ذاتی مصالح پر قربان کرتے رہے ہیں۔ جماعتیں اب اس انفرادی غلبہ سے بیزار ہو گئی ہیں۔ اور ان میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ دنیا سے انفرادیت کو مٹا کر اشتراکیت کا اصول رائج کریں ، جس کا منشا یہ ہے کہ ہر چیز جماعت کی ہو۔ افراد کی تمام کوششیں اور ساری قوتیں محض جماعت کی ترقی و فلاح کے لئے ہوں ، اور تمام افرادی مصالح اجتماعی مصالح میں جذب ہو جائیں۔ اس تحریک کی حمایت خصوصیت کے ساتھ وہ جماعتیں کر رہی ہیں۔ جو انفرادیت و استبدادیت سے بہت زیادہ دکھ پا چکی ہیں۔ اور خاص خاص افراد نے جن کے عادلانہ نظام کو بالکل درہم برہم کر کے تمام ذرائع ترقی پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ جماعت کے بقیہ افراد کے لئے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس تحریک میں غصہ اور جوش کے اجزا بھی کافی مقدار میں شامل ہیں۔ اس لئے وہ انتہائی اجتماعیت پر زور دینے میں عدل سے ہٹ گئے ہیں۔ مگر اخلاقی حیثیت سے ان کے یہ مقاصد بہت اچھے ہیں کہ ادنیٰ پیشوں کو معزز بنایا جائے۔ ہنرمندیاں قابل وقعت ہوں۔ اعلیٰ پیشوں پر سے پابندیاں ہٹا دی جائیں۔ جماعت کا ہر فرد اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور جماعت کے ہر فرد کو اپنی محنتوں کے پورے پورے ثمرات سے متمتع ہونے کا حق حاصل ہو۔ اگر یہ تحریک

اعتدالی صورت اختیار کرلے تو وہ بہت سے اخلاقی فوائد پیدا کرے گی۔

ان مباحث کی تفصیلات کے لیے پاحسن نظام اخلاقیات سجوک کی Principles of Political اور گرین کے سیاسی لکچر دیکھو۔

۷۔ عناصر ترقی

گذشتہ صفحات میں ہم نے جگہ جگہ اس امر کا ذکر کیا ہے کہ اخلاقی زندگی ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ بات زیادہ صاف اور واضح بحث کی محتاج ہے۔ اگرچہ ہمیں اس خیال میں کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ خواہ کتنا ہی شک کرنے کو جی چاہتا ہو۔ مگر اس کی صداقت کسی نہ کسی طرح عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے، دنیا کی ترقی کا خیال تمام تر دور حاضر کی پیداوار، اور عہد فطرت کے انسانی خیالات سے کسی قدر مختلف شئے ہے۔ اب یہ ایک مسلمہ عقیدہ ہو گیا ہے۔ کہ بنی نوع انسان کی عمر جتنی جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کے تجربات اور اس کی معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا نصب العین بلند تر اور اس کے ذرائع حصول وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم یہ دلفریب مایوسی اب تک ہم میں موجود ہے کہ موجودہ نسل اپنے اسلاف کی تنزل پذیر یادگار ہے۔ اور ہماری ماضی پرست فطرت کے لیے گذشتہ عہد زریں کا خیال جبکہ انسان موجودہ عیش پرستیوں اور حماقتوں سے پاک تھا، اپنے اندر قدرتی کشش رکھتا ہے اور اگر اس پرانے عقیدہ پر ہم غور کرتے ہیں تو ایک حد تک وہ درست بھی نکلتا ہے، کیونکہ جب نئے حالات اپنے ساتھ نئے فرائض لاتے ہیں تو ساتھ ہی شر کے نئے مواقع بھی پیدا کرتے ہیں۔ آجکل کے تاجرانہ اخلاق سے دور گذشتہ کے دوستانہ اخلاق کا موازنہ کرو تو تمہیں یہ فیصلہ کرنے میں سخت زحمت پیش آئے گی۔ کہ ہم درحقیقت تنزل کر رہے ہیں یا ترقی۔ اگر ایک طرف بعض حیثیات سے ہمارے افعال زیادہ منظم، معقول اور وسیع اصول پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف بعض حیثیات سے یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہم اگلے لوگوں سے

نسبتاً زیادہ خودغرض اور بددیانت ہو گئے ہیں لیکن اگر ہم کو اپنی ترقی کا کبھی یقین ہوتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ افراد کے افعال سے قطع نظر کر کے ہم اخلاق کے ان اعلیٰ اصولوں اور نصب العینوں پر نظر کریں جو ہمارے زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر افراد کے متعلق بھی جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یاد کرنا پڑتا ہے کہ انفرادی زندگی میں بھی بہرحال ترقی ہوئی ہے۔ کیونکہ جب اصولوں اور نصب العینوں میں ترقی ہوئی ہے۔ تو لازماً افراد کی اخلاقی حالت میں بھی ہونی چاہیئے جن کے بغیر ان اصولوں کا قیام مشکل ہے۔

ترقی کا ثبوت

موجودہ نظامِ زندگی میں ہم جس چیز کو تنزل کی علامت سمجھتے ہیں وہ دراصل ہماری ترقی کے یقین کو قوی کرنے والی شئے ہے۔ رسکن کہتا ہے کہ "گھانس ہر سال ہری ہو جاتی مگر آفت آتی ہے تو صرف گیہوں پر۔ اس لئے کہ اس کی فطرت اعلیٰ ہے۔ کارلائل نے اس سے زیادہ خوبصورت الفاظ میں اس مطلب کو ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "انسان کی اضافی شقاوت اس کی فطری سعادت و بزرگی کا نتیجہ ہے۔" امرسن کا بھی ایک مشہور مقولہ اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ "ہماری کمزوری و کوتاہی کا اثبات دراصل ہماری روح کی بزرگی کا ایک لطیف کنایہ ہے۔" ان سب کا مدعا یہ ہے کہ انسان کی فطرت کو جس زوال کے خطرہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اس کے علو فطرت کی بدولت ہے۔ حیوان کو یہ بات نصیب نہیں، انسان میں گناہ کرنے اور گناہ سوچنے کی جو قوت ہے اگرچہ اسے ذی الطبع بناتی اور اس کے درجۂ شرافت سے گرا دیتی ہے مگر اس کی یہ ذلت بھی حیوان کو میسر نہیں میں کسی کی عزت و شہرت، جاہ و منصب کی ترقی اور ہر دلعزیزی پر رشک کرتا ہوں تو یہ جذبات خواہ میری دنائت کا ثبوت ہوں؛ مگر میرے ذی شعور ہونے کی صریح علامت ہیں۔ گرین نے اس قسم کے اخلاقی گناہوں کا حوالہ دینے میں سخت غلطی کی ہے۔ انسان کی اصلی خصوصیت یہ نہیں ہے کہ وہ برائی کے نئے اصناف اپنے اندر رکھتا ہے۔ بلکہ دراصل اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعور رکھتا ہے اور اگر برائی میں مبتلا بھی ہوتا ہے

تو شعور کے ساتھ ۔

علم اپنے اندر برائی بھی رکھتا ہے اور بھلائی بھی ۔ اس کی فطرت نہیں بدلتی مگر تغیر عمل کے ساتھ اس کے اثرات بد بھی ہو سکتے ہیں اور نیک بھی ۔ ہماری دوزخ کی گہرائی ہماری جنت کی بلندی کا پتہ دیتی ہے ۔ اور اگر ہم معائب و رذائل میں بھی مبتلا ہو گئے ہیں تو بہر حال ہم میں شعور بڑھ گیا ہے ۔ جو برائی اور بھلائی دونوں کی اصل ہے اور اس کی موجودگی میں ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ اپنی تمدنی ترقی کے ساتھ ہم اخلاقی پستی کو بھی محسوس کرکے فضائل کی طرف بڑھنا شروع کر دیں ۔ پس اس خیال میں شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ حالات زندگی کی ترقی کے ساتھ اخلاقی زندگی میں بھی ترقی ہوتی ہے کارلائل جیسا شخص بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

ترقی انواع کے مسئلہ پر آج کل جس طرح بحث کی جاتی ہے اس کا میں قائل نہیں ہوں ۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل مسئلہ بڑی حد تک یقینی ہے ۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے خیالات اس کے آباؤ اجداد کے خیالات سے مشابہ ہوں ۔ اس کا نقطۂ نظر نئی معلومات سے یقیناً کچھ زیادہ وسیع ہوگا اور وہ اپنے اسلاف کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھا کر بہت کچھ نئی باتیں پیدا کرے گا ۔ جب یہ ہر شخص کی انفرادی ترقی ہے ۔ تو نوع انسان کی ترقی بھی اسی کے ساتھ لازم آجاتی ہے ۔

یہی ترقی ہے جو بڑے بڑے انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔

عالم اخلاقی کی تعمیر

ہم اوپر کسی جگہ کہہ آئے ہیں کہ انسان کی اخلاقی زندگی جس ماحول میں گذرتی ہے اس کو اخلاقی عالم Moral Universe سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اس عالم کی تعمیر تین عناصر سے ہوتی ہے ۔ ایک عنصر اجتماعی نصب العین ہے ۔ یہ جماعت کا متحدہ نصب العین ہوتا ہے اور تنوع کے ساتھ افراد کی تمام کوششیں اسی کے لئے ہوتی ہیں دوسرا عنصر اجتماعی شعائر ہیں ۔ جن کا اس سے پہلے ہم کہیں ذکر کر چکے ہیں تیسرا عنصر اعمال

عادیہ ہیں۔ جن کو ہم نیم شعوری طور پر نقلاً اختیار کرتے ہیں اور جو کسی واضح ہدایت یا کسی اسوۂ حسنہ کی دانستہ تقلید پر مبنی نہیں ہوتے۔ اجتماعی دنیا کے یہ تینوں عنصر ہر عہد اور ہر ملک میں کم یا زیادہ ترقی یافتہ صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں باہم اکثر کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی قوم کا نصب العین ہمیشہ اس کے شعائر و رسوم کے مماثل نہیں پایا جاتا۔ بلکہ بعض اوقات تو خود رسوم اور شعائر میں بھی پوری مطابقت نہیں ہوتی۔ مثلاً ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کا مذہب صلح و آشتی کے نصب العین پر مبنی ہے۔ وہ قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ اور جن کے قومی شعائر فضائل اخلاق پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی رسوم اخلاقی رذائل سے مرکب ہوتی ہیں۔

قوموں کی اخلاقی ترقی بڑی حد تک ان عناصر کی باہمی تطبیق کی کوششوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان کوششوں کی تدریجی کامیابی کے ساتھ نصب العین بلند اور شعائر و رسوم اصلاح پذیر ہوتے جاتے ہیں۔

تطبیق عناصر کا نتیجہ

ان عناصر میں تطبیق کی کوشش اکثر اوقات جدید نصب العین یا جدید شعائر پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً جو شعائر ایسے ہیں کہ انسانی عادات کو ان کے مطابق نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ناجائز اور غیر تسلی بخش سمجھ کر بدل دیئے جاتے ہیں اور لازماً ان کی جگہ دوسرے شعائر پیدا کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح قوم کے حالات جب ثابت کر دیتے ہیں کہ عملی حیثیت سے اس کا نصب العین قابل حصول نہیں ہے یا غلطی پر مبنی ہے تو وہ اس کی جگہ دوسرا متحدہ نصب العین پیدا کر لیتی ہے۔ ہمارے رسوم و عادات بھی اس سلسلہ میں بدلتے ہیں اور بتدریج شعائر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان سب میں جب تطابق ہو جاتا ہے تو ہم ترقی یافتہ کہلائے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی قوموں کی زندگی میں ایسے بحران کا وقت بھی آ جاتا ہے۔ جب رسوم و شعائر و نصب العین کے قطعاً بدل دینے کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس وقت یورپ

کا صنعتی و حرفتی نظام جس انقلاب سے دوچار ہے وہ اسی قسم کے بحران کا نتیجہ ہے مگر یہ غلط نظامِ تمدن سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج اس نظامِ تمدن کو بدلنے سے خود بخود ہو جاتا ہے۔

نقائص کا احساس

اخلاقی دنیا کے ان اختلافات سے قطع نظر کرکے، جو قدرتی طور پر ہم کو ترقی کے لئے مجبور کرتے ہیں، خود ہمارے رسوم و شعائر اور حصول و نصب العین کے ذرائع کا نقص اور بعض اوقات خود نصب العین کی غلطی جب ہم محسوس کر لیتے ہیں تو یہ احساس بھی ہماری ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اس نقص کا احساس عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی مصلح ہمیں اپنے نظام کی منطقی ناستواری کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک ہی کام کے لئے کبھی کوئی طریق اختیار کرتے ہیں اور کبھی کوئی، حالانکہ اس اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، اپنے معاملات میں ہم کبھی ایک لائن اختیار کرتے ہیں اور کبھی دوسری، حالانکہ یہ اختلاف ہمارے کاروبار میں تلون پیدا کرتا ہے، اسی طرح اپنی خانگی اور دوستانہ زندگی میں ہمارے تعلقات کبھی شگفتہ ہوتے ہیں اور کبھی کشیدہ، حالانکہ یہ خود ہماری اپنی ہی زندگی کے لطف کو غارت کرنے والا اختلاف ہے، ایک مصلح ان غلطیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈالتا ہے، اس کے نقائص کو ٹٹولتا ہے۔ اور ہمیں ان کے احساس پر مجبور کرتا ہے۔ وہ ہم سے پوچھ سکتا ہے کہ جو تکلیفیں تم انسان کو نہیں دیتے وہ حیوانوں کو کیوں دیتے ہو، حالانکہ احساس اذیت ان میں بھی موجود ہے؟ وہ ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ انسانیت کے جو حقوق تم نے مردوں کو دیئے ہیں عورتوں نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ انہیں نہیں دیتے؟ وہ ہم سے یہ بھی دریافت کر سکتا ہے۔ کہ اگر بنی نوع انسان کے تمام افراد انسانیت میں یکساں ہیں اور فطرت نے انسانی روح سب برابر تقسیم کی ہے تو یہ چھوٹے بڑے، ذلیل و عزیز اور قوی و ضعیف کی تفریق تم میں کیوں موجود ہے؟ اسے یہ بھی پوچھنے کا حق ہے، کہ حکومت اگر اس نظام کا نام ہے جو ایک

جماعت اپنے اندر نظم قائم کرنے اور متحدہ قوت سے اپنی ترقی و حفاظت کا سامان کرنے کے لیے اختیار کرتی ہے، تو ہمارے ہاں حاکم و محکوم کے بجائے خادم و مخدوم کی نسبت کیوں نہیں قائم ہوتی؟ اسے ہمارے اخلاقی اصولوں کے متعلق بھی محاسبہ کرنے کا حق ہے کہ اگر میدان جنگ میں بہادری اور کھانے پینے میں اعتدال و میانہ روی اچھی ہے تو قوت کے استعمال میں ضبط و تحمل اور عیش و عشرت میں پرہیزگاری کیوں اچھی نہیں؟ غرض یہ کہ وہ ہر وقت، ہر حال میں، اور ہر شعبہ زندگی میں ہم کو ایسے ہی نقائص کی طرف متوجہ کرتا ہے اور رفتہ رفتہ ہم میں خود اتنا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنے اعمال کی غلطیوں پر آپ ہی محاسبہ کرتے اور اپنے عیوب کو خود ہی سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ یہی چیز ہمیں ترقی کی طرف ابھارتی اور ہم میں ترغیب اصلح پیدا کرتی ہے۔ الکزنڈر کا نظریہ انتخاب اخلاقی بھی یہی ترغیب اصلح کا نظریہ ہے۔

اخلاقی ترقی کا ظہور

یہ اخلاقی ترقی زیادہ تر اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب لوگ فضائل و فرائض کے متعلق زیادہ گہرے خیالات اختیار کرتے ہیں اور یا تو پچھلے اصولوں کو بالکل بدل دیتے ہیں۔ یا ان میں تفریع و تفصیل کر کے انہیں وسیع کر دیتے ہیں۔ یا نئے اصولوں کا اضافہ کر کے نئے محاسن، نئے فضائل، نئے حقوق اور نئے فرائض پیدا کر لیتے ہیں۔ مسٹر گرین نے اپنے مقدمہ اخلاقیات میں ایک جگہ فضیلت کے متعلق یونانیوں کے خیالات سے آج کل کے خیالات کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس ترقی کا مطلب خوب واضح ہوتا ہے وہ یونانیوں کے انفرادی فضائل میں سے عفت اور شجاعت کو لے کر آج کل کی عفت اور شجاعت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اب ان کے معنی اور مصداق میں کتنی نمایاں وسعت ہو گئی ہے۔ عفت کی نسبت اس نے لکھا ہے کہ یہ فضیلت یونانیوں کے ہاں صرف کھانے پینے اور مباشرت کے معاملات تک محدود تھی۔ لیکن اب اس میں ضبط نفس کی تمام صورتیں شامل ہو گئیں ہیں۔ نفس کشی یونانیوں میں جن اصولوں پر مبنی تھی۔ آج وہ ہماری نفس کشی

سے وسیع مفہوم میں ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے شہوانی میلانات کو دبانے کے لیئے یونانیوں کی طرح صرف ایک اخلاقی روک ہی نہیں ہے بلکہ اجتماعی تعلقات کی بہت سی بندشیں اس کے لئے موجود ہیں۔ جس عیش پرستی میں آدمی کو پہلے کوئی مزاحمت نظر نہیں آتی تھی۔ اب بیوی بچوں کے حقوق اور ابنائے جماعت کے مفاد اس کے لئے مزاحم ہیں۔ رفاہ عام کے خیالات نے ذاتی لذت طلبی کے خلاف جن مطالبات کا احساس آج ہمارے ضمیر میں پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس زمانے کے مطالبات سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اخلاقی وفاداری کی جس قدر صورتیں اب پیدا ہو گئی ہیں وہ اپنے تنوع کے لحاظ سے یونانیوں کے ہاں کوئی وجود نہ رکھتی تھیں۔ میور ہیڈ نے بھی Elements of Ethics میں اسی قسم کا موازنہ کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

۔ یونانیوں نے فضیلت کا استنباط جن اصولوں سے کیا تھا وہ دو ہیں۔ ایک یہ کہ ہر وہ عیش پرستی جو انسان کو امن یا جنگ کی حالت میں اپنے فرائض ادا کرنے سے روکے اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اور دوسرے یہ کہ ذاتی خواہشات کے لئے ایسی حد بندی ہو کہ ایک دوسرے کے حقوق میں دست اندازی نہ کرے۔ یونانی حکما میں ایک خیال یہ تھا کہ وہ لذت جس کا تعلق شہوت سے ہے انسان کے شایاں نہیں۔ اس لئے کہ دوسرے حیوانات بھی اس کا احساس رکھتے ہیں۔ حالانکہ آج اس غیر فطری اصول کے بجائے عصمت کی بنیاد اس اہم، وسیع اور فطری اصول پر رکھی گئی ہے کہ ہر فرد بجائے خود مقصود ہے اس کے ساتھ آلات و وسائل کا سا سلوک نہ کرنا چاہیئے۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ موجودہ زمانے میں یورپ اس اصول کی پیروی سے بہت دور ہے لیکن نفس اصول کا جس حد تک احساس اب کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں وہ سرے سے مفقود ہی تھا۔ اب ہر شخص کو قانوناً جو حقوق حاصل ہیں۔ ان کی بنا پر ناممکن ہے کہ کوئی مرد کسی عورت کو زبردستی اپنی شہوت رانیوں کا ذریعہ بنا لے۔ اگرچہ اس قسم کی حرکت کا ارتکاب آج بھی اسی طرح رائج ہے جس طرح پہلے تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ اب اخلاقی ماحول نے اس قدر ذہنی ترقی کر لی ہے کہ ہر ایسی حرکت پر ضمیر ملامت کرتا ہے۔ مگر

پہلے اسے قابلِ فخر سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ ارسطو کے زمانہ کا ایک یونانی جس کے چاروں طرف سینکڑوں غلام ہوتے تھے۔ ایسا ضمیر ہی نہ رکھتا تھا کہ وہ اسے بندگیٔ شہوت پر ملامت کرے۔ اس زمانے کے حکما کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں اس قسم کی عادتیں مایۂ افتخار تھیں۔ اور لوگ انہیں تفاخراً بیان کیا کرتے تھے۔ یہ بات آج مفقود ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اب نہ صرف فضائل کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے بلکہ وہ اصول بھی جن فضائل و محاسن کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ بہت وسیع ہو گئے ہیں اور یہی اخلاقی ترقی کا ظہور ہے۔

فرائض کی توسیع

تمہیں معلوم ہو چکا کہ اصول فضائل کے عمق اور مفہوم فضائل کی وسعت کو اخلاقی ترقی سے کیا تعلق ہے اور فضیلت کی اس تعمیم سے تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ اس اخلاقی ترقی کے ساتھ ایک قسم کی آفاقیت بھی پیدا ہو گئی ہے یعنی قوم یا ملک کی تخصیص کے بجائے تمام عالم انسانیت میں اصول اشتراک پیدا ہو گیا ہے۔ جو اصول یونانیوں پر حاوی ہیں۔ وہی حبشیوں پر بھی ہیں جو گوروں پر اپنا دامن پھیلاتے ہیں۔ وہی کالوں پر بھی وسیع ہیں اور جو مردوں کے لئے ہیں وہی عورتوں کے لئے بھی ہیں۔ اب ترقی کے ایک دوسرے پہلو کو سامنے لاؤ تم دیکھو گے کہ فرائض میں روز بروز گوناگونی اور وسعت پیدا ہوتی ہے اور جس طرح انسان اپنے خیالات اور عقائد میں ترقی کرتا ہے۔ اسی طرح نئے نئے فرائض بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً جب انسان کی فطرت و غایت کا مسیحی تخیل وجود میں آیا تو اس کے ساتھ ایک نیا فرض مسیحی تعلیمات کی اشاعت کا پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا۔ اسی طرح جب عرب کے وحشیوں نے اسلام قبول کیا تو ان کے فرائض کی دنیا ہی بدل گئی، امر بالمعروف، تبلیغ دین، قیام امن وغیرہ نئے فرائض پیدا ہو گئے اور نوع انسان کی اخلاقی اصلاح کے ساتھ جو اہم اور غیر محدود نتائج وابستہ ہیں۔ ان کا احساس

پیدا ہوتے ہی اسلام کے پیروؤں کو اپنا یہ قطعی فرض نظر آنے لگا۔ کہ اسلام کا پیغام حق دنیا کے چپہ چپہ تک پہنچا دیں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے ان فرائض کا تخیل بھی عربوں میں نہ تھا۔ یہی حال عہد جدید کا ہے تمدن و تعلیم کی ترقی نے اخلاقی فرائض میں ایک زبردست اضافہ کیا ہے جس کا احصا بھی ذرا مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر اس تغیر کو پیش کیا جا سکتا ہے جو انسان اور حیوان کے جنسی تعلق اور احساسی اشتراک کا علم حاصل ہونے کے بعد جانوروں کے ساتھ ہمارے سلوک میں پیدا ہو گیا ہے[1]۔ صرف جانور ہی نہیں بلکہ بے جان چیزوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا احساس ہم میں پیدا ہو گیا ہے اور ہم ان کے اس حق کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ان کے ساتھ بیدردی برتنا اور بیفائدہ انہیں برباد اچھا نہیں ہے۔

توسیع فرائض کا نتیجہ

فرائض کی اس توسیع کے مقابلہ میں اس حقیقت کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے فرائض کا احساس فنا بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ پہلے زمانہ میں خادم و مخدوم کے باہمی فرائض و حقوق جس قدر وسیع تھے وہ آج مفقود ہیں اور دوستوں میں جو آپس کے فرائض تسلیم کیے جاتے تھے اب ان کا شائبہ بھی نہیں۔ یہ درست ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے۔ کہ اس شعور فرض کی فنا پذیری دراصل ایک حد تک ہمارے دائرہ فرائض کی وسعت کا نتیجہ ہے۔ خادم و مخدوم کے ذاتی تعلق کی قوت جس میں لوگ حد سے زیادہ مبالغہ کرتے

---

[1] اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقوق و فرائض کا جو اصول ہم انسان پر جاری کرتے ہیں وہی حیوانوں تک بھی وسیع کر دیا گیا ہے کیونکہ جانوروں پر انسانی حقوق کو نافذ کرنا ایک لغو بات ہے البتہ ہم جانوروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں تکلیف مالایطاق سے برباد نہ کریں بلکہ اعلیٰ درجہ کے حیوانات کے متعلق تو ہم اپنا یہ فرض محسوس کرنے لگے ہیں کہ انہیں جنسی ترقی میں مدد دینی چاہیے۔ کیونکہ وہ ایک قسم کا شعور رکھتے ہیں جو ترقی کے انسانی شعور کی جانب میلان رکھتا ہے۔

ہیں، پہلے زمانہ میں اس لئے اب سے زیادہ تھی کہ فرائض و حقوق کا تناسب درست نہ تھا۔ اس زمانہ میں خادم کے فرائض تو بے شمار تھے۔ مگر حقوق مبہم تھے۔ آقا اپنے فرض کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ مگر خادم سے اس کا یہ مطالبہ قوی تھا کہ وہ وفادار رہے اور یہ ہوتا بھی تھا کہ خادموں میں حق نمک کا احساس بہت زیادہ تھا۔ اخلاقی ترقی نے اس حالت کو بدل کر حقوق و فرائض کا توازن قائم کر دیا ہے۔ اب فرائض کے ساتھ حقوق کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے۔ اور کوئی شخص اپنے حق کا اس وقت تک مطالبہ نہیں کر سکتا جب تک اس کے برابر کا فرض ادا نہ کرے۔

پس اسے توسیع فرائض کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے کہ بڑے فرائض نے چھوٹے فرائض کو دبا دیا ہے اور صحیح فرائض نے غلط فرائض کی جگہ لے لی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

بعض علمائے اخلاقیات نے ایک یہ سوال بھی پیدا کیا ہے کہ اخلاقی فرض کے متعلق ہمارے خیال میں جو وسعت پیدا ہوئی۔ وہ دراصل شعور اخلاقی کی ترقی کا نتیجہ ہے یا صرف ہمارے ماحول کے بدل جانے کا؟ مثلاً ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ دور حاضر میں غلامی کو باطل کرنے کی وجہ صنعت و حرفت کی عام ترقی ہے[1]۔ مگر یہ محض غلط فہمی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غلامی کے باطل ہونے کا خیال اور پھر دستور غلامی کو مٹا دینے کی فرضیت کا احساس دراصل اقتصادی حالات کی ترقی ہی کا نتیجہ ہے" اور دوسرے مسائل میں بھی ہماری ترقی تغیر حالات ہی کی رہین منت ہے۔ مثلاً عورتوں کی آزادی کی تحریک جدید اقتصادی و معاشرتی حالات ہی نے پیدا کی ہے لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اخلاقی ترقی کی واقعیت میں شک کیا جائے ترقی خواہ حالات کا نتیجہ ہو خواہ احساس کا، خواہ کسی اور غیر معلوم سبب اس کا محرک ہو مگر بہر حال نفس ترقی میں شبہ نہیں کیا جا سکتا اور جب نفس ترقی مشتبہ نہیں

---

[1] میورہیڈ کی

تو ماننا پڑے گا کہ شعور اخلاقی کی ترقی اس کے ساتھ مستلزم ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات مسلّم ہے کہ اخلاقی زندگی کہیں دنیا سے باہر نہیں بلکہ خود اپنے ماحول میں اپنا عمل کرتی ہے، اور اس کا نشو و نما بہرحال ہماری قوت، ہمارے علم اور ہمارے شعور کے نشو و نما سے وابستہ ہے پس اگر ہماری اخلاقی حالت ترقی کرتی ہے تو ہمارے قوائے ذہنی و اخلاقی ہی کی مدد سے کرتی ہے خواہ ان قوائے کو حالات پرورش کرتے ہوں یا کوئی اور شئے۔

اخلاقی زندگی جدید حالات کے ساتھ ہمیشہ نئے برگ و بار پیدا کرتی ہے اور نئے مسائل اپنے حل کی نئی صورتیں پیش کرتے ہیں ہیگل نے اپنی کتاب

میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے کہ

"انسانی روح، اپنے زمانہ کی زندگی پر اپنا عمل کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اس زندگی میں تغیر پیدا کرنے کی ایک غیر محدود قوت ہے" دوسرے الفاظ میں نئے حالات جو نئی زندگی پیدا کرتے ہیں اس پر انسانی روح نقاشی کرتی ہے۔

بہترین بھلائی کی طلب

پس اب جب کہ اخلاق کا ترقی پذیر ہونا ظاہر ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت آپ کھل جاتی ہے کہ ایک ایسا آدمی جو مبداء فیاض کے ہاں سے کمال اخلاق کی غیر معمولی قوت لے کر آیا ہو، وہ محض اپنے ماحول کے شعائر و عقائد اور اپنے زمانہ کے مسلمہ نصب العینوں کے عالم میں زندگی بسر نہیں کر سکتا اور نہ معمولی اخلاقی سطح پر قناعت کر سکتا ہے، بلکہ وہ اس اونچائی پر جانا چاہتا ہے جو اخلاق کی انتہائی بلندی ہو۔ اس کو اپنے گرد و پیش کے ذرائع اور اپنے ہمعصروں کے نصب العین سے تشفی نہیں ہوتی، وہ زیادہ مکمل، زیادہ کامیاب اور زیادہ بلند نصب العین اور اس کے ذرائع حصول کو ڈھونڈھتا ہے۔ اس کی فطرت محض بھلائی نہیں بلکہ بہترین بھلائی کو طلب کرتی ہے اور وہ ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوتا۔ جو اسے صرف برا انسان بننے سے بچاتی ہیں۔ اس کو ایک ایسے عالم کی تلاش ہوتی ہے۔ جہاں انسان اپنے منتہائے مقصود کو پا سکے۔ اپنی اصلی شرافت کو

حیوانی ذمائموں سے پاک کر سکے۔ اور اس بلند ترین نصب العین کو حاصل کر سکے جو اشرف المخلوقات انسان کا سچا نصب العین ہو سکتا ہے۔ بعض ایسے اخلاقی علما جن کے پاس روحانیت کی کمی ہوتی ہے۔ اپنے محدود علم کی بنا پر ایسے عالم کی موجودگی کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اسے محض خیالی عالم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ صرف اونچائیوں کا خواب ہے بعض یہ نظریہ "قائم کر لیتے ہیں۔ کہ ایسے خواب دیکھنے والے ارتقائے حیات کے ایک ہی رخ کو دیکھتے ہیں اس لئے اگرچہ وہ اپنے زمانہ کے عاقل ترین افراد ہوتے ہیں مگر دنیا ان سے زیادہ عقلمند ہوتی ہے کسی نے اگر عنایت کی ہے تو اتنا کہہ دیا ہے کہ یہ انسان کی انتہائی بلندی کا خیال ہے۔ مگر صرف خیال ہی کی حد تک "قابل حصول ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ایسا عالم خود ہمارے اس عالم حقائق ہی میں موجود ہے۔ اور اس تلاش میں کامیابی کا حاصل کرنا مذہب کی رہنمائی پر موقوف ہے۔ سچے مذہب کی تلاش کرو۔ اور اس کی مدد سے انسانیت کے انتہائی مدارج تک پہنچنے کی سعی کرو"!

اسلام کا اصلی سرچشمۂ قوت

مقالہ "اسلام کی قوّت کا اصلی سرچشمہ" کے عنوان سے الجمیعت دہلی کے ۱۸ر، ۲۲ر، ۲۶ر جولائی اور ۱۰ر، ۱۴ر، ۱۸ر اگست ۱۹۲۵ء کے شماروں میں ایک اداریئے شکل میں مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔

حصہ دوم

اسلام پر کُفر کی یورش کے اسباب

بنگال کے مسیحی مبلغین نے اپنی ایک کانفرنس میں مسلمانانِ بنگال کو مسیحیت کی دعوت دینے کے متعلق جو تجویزیں منظور کی ہیں۔ وہ اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ قارئین کرام میں سے کتنے ان سطور کو پڑھ کر کچھ اچنبھے اور کچھ رنج کی سی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہوں گے اور کتنے ان سے سبق لے کر آمادۂ عمل ہوئے ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب ہماری شورپسندی ایک مرض کی صورت اختیار کر گئی ہے اب ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں۔ کہ جب کبھی مخالفین کے کسی بڑے حملے یا خاص منصوبے کی ہم تک اطلاع پہنچی ہے تو دفعتاً چونک پڑتے ہیں۔ اور ایک بدحواسی اور اضطراب کے عالم میں کچھ دفاع کی غیر مرتب سی تدبیریں اختیار کرنے لگتے ہیں۔ اور جب خطرہ ذرا کم ہو جاتا ہے۔ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ عیسائی مشنریوں اور آریہ[1] پرچارکوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اس طویل مدت میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے ہیں اور کوئی سال ایسا نہیں گزرا

---

[1] "آریہ پرچار" نہ صرف ۱۹۲۵ء میں برسرپیکار تھا بلکہ آج بھی بھارت میں مسلمانوں کو شُدھی کرنے کی تحریک اسی طرح جاری ہے۔ (ن)

جس میں انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا ہو۔ لیکن ہم نے ہمیشہ ان کی خاموشی کو اپنی طرح بے عملی کا ہم معنی سمجھا اور کبھی اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کی۔ ہماری مثال بالکل مارب[1] کے ان دیہاتیوں کی سی ہے جو اپنے آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے بند کو دیوتاؤں کا بنایا ہوا بند سمجھتے تھے۔ اور اس میں کسی کمزوری یا بوسیدگی کے قائل نہیں تھے۔ جب چوہوں نے اس میں آہستہ آہستہ سوراخ کرنا شروع کیا تو وہ سمجھے کہ یہ معجزے سے بنایا ہوا بند ان چوہوں کے بس کا نہیں ہے۔ مگر وہی چوہے برسوں کی لگاتار کوشش کے بعد اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ اس میں سے پانی رسنے لگا۔ آخر کچھ پانی کے زور نے اثر دکھایا۔ اور کچھ دیواروں کی بوسیدگی رنگ لائی۔ اور دفعتاً بند ٹوٹ کر ایسا سیلاب آیا کہ دور دور تک کی بستیاں تباہ ہو گئیں یہی حال ہمارا بھی ہے ہمیں اس بات پر تو اعتماد ہے اور ہونا چاہیئے کہ اسلام کا بند بہت مضبوط ہے جسے کوئی توڑ نہیں سکتا لیکن ہم نے خود اپنی غفلت سے اسے بوسیدہ کر لیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے حقیقت چوہے جن کے دانت فی الحقیقت چنے سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ اس میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں۔

دوسروں کی کامیابی ہماری نااہلی کا ثمر ہے۔

ہمیں سوچنا چاہیئے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر آریہ اور عیسائیوں کو ہمارے مقابلے میں آنے کی جرأت ہوتی ہے۔ ان کے مذہب کو دیکھئے تو وہ ایسے خرافات کا مجموعہ ہے کہ وہ اسے ہمارے سامنے پیش کرنا تو درکنار خود بھی جب کبھی سنجیدگی کے عالم

---

[1] مارب:۔ قدیم ملکِ سبا کا دار الحکومت جس کے قریب برساتی نالوں پر بند باندھ کر ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ اسی پر پورے ملک کی زراعت کا انحصار تھا۔ چوہوں کے سوراخ کر دینے کی وجہ سے اس تالاب کا عظیم الشان بند ٹوٹ گیا۔ اور سارے ملک کا نظام آبپاشی تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

میں غور کرتے ہوں گے۔ تو شرماتے ہوں گے۔ پھر آخر کوئی بات تو ہے۔ کہ وہ اس متاع بے حقیقت کو لے کر بازار میں آتے ہیں۔ اور کامیاب و بامراد جاتے ہیں۔ اس سوال کی حقیقت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی یہ کامیابی کچھ ان کی قابلیت سے نہیں۔ بلکہ ہماری ناقابلیت کی رہین منت ہے۔ ان کی دوکان کا فروغ کچھ اس لئے نہیں ہے کہ ان کی متاع اچھی ہے۔ اور بازار میں اس کی مانگ ہے۔ بلکہ وہ صرف اس لئے بک رہی ہے کہ ہم نے اپنی متاع کی قدر کھو دی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی شخص اگر ایک دفعہ نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو جائے تو دنیا کی کوئی قوت اسے دین حق سے پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب وہ نعمت پیش ہی نہ کی جائے جب عام مسلمانوں کا اسلام صرف روایتی اور موروثی اسلام رہ جائے جب انہیں جہالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور وہ اسلام کی خوبیوں سے واقف ہی نہ کئے جائیں تو اس کی مضبوطی اور استحکام پر اعتماد اور اس کے ناقابل تسخیر ہونے پر بھروسہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھروسہ اپنے آپ کو صحیح کیسے ثابت کر سکتا ہے۔

خطرے کے حقیقی اسباب اور ہمارے دینی مصائب کے مستقل سرچشمے

پس اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غیر مسلم مبلغین کو مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے اور انہیں مرتد بنانے کی جس بنا پر جرأت ہوتی ہے وہ خود ہماری اپنی کمزوریاں ہیں۔ جب تک ہم میں یہ کمزوریاں باقی رہیں گی یہ خطرہ بھی باقی رہے گا اور ہمارے بدقسمت کان ہمیشہ یہ سنتے رہیں گے کہ آج فلاں جگہ آریوں یا عیسائیوں کا حملہ ہوا اور آج فلاں جگہ مسلم قوم ارتداد کے خطرے میں مبتلا ہے۔ وقت کے وقت ان خطرات کے دفاع کی سطحی تدبیریں اختیار کر لینے اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے سے یہ مستقل روگ کبھی دور نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے تو یہ اندیشہ ہے کہ کچھ دن بعد ہم اپنے

خطروں کی آوازیں سننے کے عادی ہو جائیں گے اور اس طرف توجہ بھی کرنی چھوڑ دیں گے اس کا اگر کوئی علاج ہے تو صرف یہی کہ ہم اپنی اصل کمزوریوں کا علاج کریں اور ان کو دور کرنے کے لئے مستقل اور عملی تدبیریں اختیار کریں تاکہ ہم میں سے وہ چیز ہی دور ہو جائے جو دشمنوں کو اپنے اوپر حملہ آور ہونے کی دعوت دیتی ہے ہمارے خیال میں یہ کمزوریاں صرف تین ہیں۔ اور وہی تمام خرابیوں کی اصل ہیں۔

۱۔ جہالت :۔

ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جاہل ہے اور شریعت اسلام سے اس کی ناواقفیت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ وہ کلمہ گوئی کی حدود سے بھی خارج ہو گیا ہے۔ بلکہ عرفِ عام میں یوں کہنا چاہیئے کہ نام کا مسلمان بھی نہیں رہا اس لئے اسے ہر مذہب کے لوگ آسانی کے ساتھ اسلام سے پھیر سکتے ہیں۔

(۲) افلاس

دوسرے یہ کہ مسلمان حد سے زیادہ مفلس ہیں اور ان کا افلاس جہالت سے مل کر ان کے اندر سرمایہ دار مبلغین کے دام میں گرفتار ہونے کی استعداد پیدا کر دیتا ہے۔

(۳) مشنری مدارس

تیسرے یہ کہ مسلمانوں کے لڑکے اپنے قومی مدارس[1] نہ ہونے کے باعث مشنری

---

[1] ۱۹۳۵ء کے حالات کے مطابق "قومی مدارس" نہ ہونے والی بات صحیح اور مناسب تھی لیکن آج قومی مدارس کثیر تعداد میں موجود ہونے کے باوجود مسلمان لڑکے مشنری اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف قومی مدارس کی کمی ہی علت غائی نہیں ہے بلکہ اس مرض کی جڑ مغرب پرستی اور مذہبی تعلیم کی کمی ہے اسکول میں داخلے سے پہلے مکتب یا گھر پر قرآن کی ابتدائی تعلیم ضروری ہے

مدارس میں داخل کر دیئے جاتے ہیں اور وہاں ان کی لوح سیادہ پر بچپن ہی سے مسیحیت کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ جو آگے چل کر بعض اوقات خفیہ اور بعض اوقات علانیہ ارتداد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ہمارے دینی مصائب کے مستقل سرچشمے ہیں۔ ان کی پیدائش کے اسباب اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ نہ تو ان کا پوری طرح احصا کیا جا سکتا ہے اور نہ اس جگہ ان پر کوئی مفصل بحث کی جا سکتی ہے۔ تاہم اگر ان پر مجموعی حیثیت سے ایک نظر ڈالی جائے۔ تو بنائے استخراج ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں چند اسباب اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔

مثلاً مسلمانوں کی محکومی، علمأ کی غفلت مسلمانوں کی معاشرت میں غیر اسلامی طریقوں کا رواج، مسلمانوں کے قوائے ملی کا غیر معمولی انتشار اور مسلمانوں میں سرمایہ کی قوت کا عدم احساس، جو افلاس میں اضافے کا باعث ہوتا ہے

ہماری سادگی اور کوتاہ اندیشی اور مخالفین کی عیاری اور تدبر

ان کمزوریوں اور ان کے اسباب میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جسے ہم دوسروں کی طرف منسوب کر سکتے ہوں یا جس کا منبع ہمارے مخالفین کے اندر موجود ہو۔ پھر اگر ہم ان کے مقابلے پر پروپیگنڈہ کریں یا مجالس مذاکرہ منعقد کریں یا کبھی ارتداد زدہ علاقوں میں چکر لگانے کے لئے اپنے مبلغین بھیج دیا کریں جیسا کہ اب تک ہمارا طریقہ کار رہا ہے تو یقیناً یہ مرض کا اصل علاج نہیں ہو سکتا، اور نہ اس سے یہ آئے دن کے روگ کسی طرح دور ہو سکتے ہیں اگر ہمارے مخالفین کا طریقہ کار بھی یہی ہوتا تو شاید ان کے مقابلے میں ان طریقوں سے ہم کامیاب ہو سکتے۔ لیکن انہوں نے تو پروپیگنڈا اور وعظ و تلقین کو صرف ہمیں مشغول رکھنے کے لئے حیلہ

بنا رکھا ہے ورنہ دراصل اُن کے طریقِ کار بالکل ہی مختلف ہیں۔ وہ ہماری سیاسی و اقتصادی غلامی، ہمارے علماء کی غفلت، ہماری قوتوں کے انتشار، ہماری اپنے مذہب سے عام ناواقفیت اور ہماری تمام دوسری کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں شفاخانے قائم کر رکھے ہیں، جہاں خدمتِ بنی نوعِ انسان کے پردے میں وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ جاہل مریضوں کو اپنے مذہب کی تلقین کرتے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں یتیم خانے کھول رکھے ہیں جہاں بے شمار یتیم اور لاوارث بچوں کو مسیحیت کی گھٹی پلائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے انتظامات ایسے مکمل کر رکھے ہیں کہ جہاں کہیں قحط پڑتا ہے یا اور کوئی آسمانی بلا نازل ہوتی ہے۔ تو تمام بے خانماں لوگوں کو پناہ دیتے ہیں۔ اور روٹی کپڑے کے احسان کی صورت میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ہزارہا مدرسے اور کالج قائم کر رکھے ہیں جہاں نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ بچوں کو ارتداد کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے اندر اس قدر صبر و استقامت، اس قدر ایثار و خدمت اور اس قدر سچا مذہبی شغف پیدا کیا ہے، کہ وہ برسوں ایک ایک مقام پر ترک و تجرد کے عالم میں بسر کر دیتے ہیں۔ فقیروں اور یوگیوں کی سی زندگی اختیار کرتے ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ لوگوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان میں اس قدر عقل و تدبر موجود ہے کہ اگر خالصاً نہیں تو کم از کم تصنع کے ساتھ وہ لوگوں کے سامنے ایسی سادہ اور ایسی پرہیزگارانہ اور ایسی بہتر اخلاقی زندگی کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ ان کی زبان و قلم سے زیادہ خود ان کی زندگی ہی ایک مستقل ذریعۂ تبلیغ بن جاتی ہے اور پھر ان سب باتوں کے ساتھ ہمارے مخالفین کے ایک گروہ میں یہ عیاری بھی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ ہمارے موجودہ افلاس سے فائدہ اٹھا کر ہم پر اقتصادی دباؤ ڈالتے ہیں اور روپے کی

قوت سے اپنے مذہب کی اشاعت میں کامیابی حاصل کرتے ہیں ۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقے کس قدر عمیق اور کارگر ہیں ۔ ان کی مثال بالکل ایک سیلاب کی سی ہے جو ایک ہی وقت میں شور بھی مچاتا ہے عمارتوں کو تہ و بالا بھی کرتا ہے اور سیل بن کر بڑے بڑے ایوانوں کی بنیادیں بھی ڈھا دیتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں نہ معمولی تختہ بندی کام دے سکتی ہے اور نہ محض لیپا پوتی اس کے لئے تو ضرورت ہے ۔ کہ ہم بھی اتنے ہی عمیق اور کارگر ذرائع اختیار کریں جتنے ہمارے مخالفین نے اختیار کر رکھے ہیں ۔ ورنہ مدافعت میں ہمارا کامیاب ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے ۔

تدابیرِ دفاع

ہم ان خطرات اور اندرونی کمزوریوں پر بحث کر چکے ہیں۔ جن سے خاکم بدہن ہندوستان[1] میں اگر اسلام کے فنا ہو جانے کا نہیں تو کم از کم غریب و ستم دیدہ ہو جانے کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم نے اختصار کے ساتھ قارئین کے سامنے ان عمیق اور نہایت کارگر تدابیر کا بھی ایک خاکہ کھینچ دیا ہے جو اسلام کی مخالفت اس کی قوت کو توڑ دینے کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہم بھی جب تک اتنی ہی عمیق اور کارگر تدابیر اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک ہمیں اسلام کی حفاظت اور اشاعت میں کامیابی نہیں ہو سکتی اب ہم اس مسئلے پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ دفاع کے لئے ہمیں کیا کیا تدابیر اختیار کرنا چاہیئں۔ اور ہمارا طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے۔

۱۔ تعلیمات اسلامی کی عام اشاعت اور مذہبی شعور کی بیداری

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری جہالت ہے مسلمانوں کا ایک بہت

---

[1] مراد ہے تقسیم سے قبل کا ہندوستان

بڑا طبقہ اپنے مذہب کی تعلیمات، اس کے عقائد اور شعائر سے یکسر جاہل ہے اور یہی چیز ہے جو اعداء کو اسے مرتد بنانے میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے۔ پس اس لحاظ سے ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم ہندوستان[1] کے تمام جاہل مسلمانوں میں تعلیماتِ اسلامی کی اشاعت کریں۔ اسلام کے سادہ عقائد ان کے ذہن نشین کردیں۔ اور ان کے اندر اس حد تک مذہبی روح پیدا کردیں کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو جائیں۔ اس کے لئے ہم کو عام طور پر دیہات وقصبات میں ایک ایک شخص ایسا مقرر کرنا چاہیئے جو عوام کو ان کے فرصت کے اوقات میں نہایت تدریج کے ساتھ مذہبی تعلیم دے سکے۔ اور خود انہی کی زبان میں انہیں اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کرتا رہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں غیر مسلموں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دی جاسکتی ہے۔ مگر اس وقت ہماری تمام تر توجہ کافروں کو مسلمان بنانے کی بجائے خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی طرف مبذول رہنی چاہیئے ان کی سوئی ہوئی مذہبیت کو جگا دینے کے بعد جب ہم ایک دفعہ اپنے اندرونی استحکامات کو تمام بیرونی حملوں کے خطروں سے محفوظ کرلیں گے تو پھر ہمیں دوسروں کی طرف رُخ کرنے کا زیادہ موقع مل سکے گا۔

۲ مکاتب کا قیام

اس کے ساتھ ہی دوسری چیز یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دینے کے لئے گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم کر دیئے جائیں۔ اس کے لئے بھی کسی لمبے چوڑے نظام اور کسی خاص درسی نصاب کی ضرورت نہیں۔ انہیں مسلمان بنانے کے لئے ابتداً صرف اتنا کافی ہے۔ کہ نہایت سادگی کے ساتھ اسلامی عقائد ان کے ذہن نشین کر دیئے جائیں۔ وضو، استنجاء، نماز، روزہ وغیرہ کے متعلق معمولی مسائل یاد کرا

---

[1] مراد ہے تقسیم سے قبل کا ہندوستان، یعنی موجودہ پاکستان اور بھارت۔

دیئے جائیں۔ اور قرآن مجید پڑھا دیا جائے۔ قرآن مجید کو محض طوطے کی طرح پڑھ لینا ہی انسان پر اتنا اثر کرتا ہے۔ کہ اسلام کی عظمت دل میں بیٹھ جاتی ہے اور پھر مشکل ہی کوئی چیز اسے زائل کر سکتی ہے۔ پس اگر ہم اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنے بچوں کو کوئی کارآمد تعلیم دے سکیں۔ تو کم از کم ان کی لوح سادہ پر قرآن کا گہرا نقش تو ضرور بیٹھا دینا چاہیئے تاکہ ان پر کفر کا جادو نہ چل سکے۔

یہ وہ کم سے کم کام ہے۔ جسے انجام دینے میں ہمیں ذرہ برابر بھی توقف نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے سفری مبلّغین کارآمد نہیں ہو سکتے بلکہ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو مستقل طور پر ایک مقام پر رہ پڑیں اور آریہ مشنریوں کی طرح دیہاتی زندگی کی تکلیفیں برداشت کر کے پورے عزم و استقلال کے ساتھ دین و ملّت کی خدمات انجام دیں۔ ان میں اتنی استقامت ہونی چاہیئے کہ کامیابی کے ساتھ لوگوں کی جاہلانہ فطرت کا مقابلہ کر سکیں۔ اوّل اوّل کی ناکامیوں سے ہمت نہ ہاریں مشرکانہ عقائد اور رسوم و بدعات کو دور کرنے میں اگر کئی کئی برس بھی لگ جائیں تو بددل نہ ہوں۔ اور جلد بازی کر کے جہالت سے جنگ نہ کریں۔ بلکہ آہستہ آہستہ وعظ و تلقین اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعے طبیعتوں کو اصلاح کی طرف مائل کریں۔ اس کے ساتھ ہی قربانی کا اتنا جذبہ بھی ہونا چاہیئے کہ وہ اس مفلس قوم سے اپنی دینی خدمات کا کم سے کم معاوضہ لے سکیں۔ جو عیسائی مشنریوں کی طرح کروڑوں روپیہ پانی کی طرح نہیں بہا سکتی اور ان کے اخلاق میں اتنی پاکیزگی بھی ہونی ضروری ہے کہ سادہ لوح دیہاتیوں کو اپنے اعمال سے برگشتہ کر دینے کے بجائے انہیں اپنے حسن خلق کا گرویدہ بنا لیں۔ اور خود اپنے اندر اسلامی زندگی کا ایسا نمونہ

پیش کریں کہ لوگ ان سے اسلامی تعلیمات کا عملی سبق حاصل کرسکیں ۔

۳۔ طبعی حوادث کے اثرات سے بچانے کیلئے محتاج خانوں اور یتیم خانوں کی مستقل تنظیم

اس کے بعد دوسرا درجہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس قسم کے طبعی حوادث کے اثرات سے بچانے کے لیئے اقطاعی نظام قائم کریں جو انہیں عیسائی مشنریوں اور آریہ پرچار کرنے والوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ مثلاً قحطوں اور سیلابوں کے موقعہ پر ہزارہا مرد، عورت اور بچے بے خانماں ہو جاتے ہیں جنہیں کوئی پناہ دینے والا نہیں ہوتا ۔ اور مجبوراً انہیں اپنی متاعِ دین و ایمان کے عوض سرمایہ دار مشنریوں سے پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا لینا پڑتا ہے ۔ اسی طرح رات دن جن بچوں کا کوئی والی و وارث نہیں ہوتا محض اسی وجہ سے آوارہ پھرتے ہیں ۔ کہ ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے ۔ اور اس طرح اکثر انہیں عیسائی یا آریہ یتیم خانے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں یہ ارتداد کے دائمی شکار ہیں جنہیں محض مسلمانوں کی غفلت اسلام کی گود سے چھین کر کفر کی آغوش میں ڈال دیتی ہے ۔ انہیں اس خطرہ سے بچانے کیلئے محتاج خانوں کی مستقل تنظیم ضروری ہے اور اس کے لئے یہی لازم نہیں کہ کوئی بہت بڑے پیمانے پر نظام قائم کیا جائے بلکہ ایسا ممکن نہ ہو تو صرف اتنا انتظام کافی ہے ۔ کہ انہیں مشنریوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچایا جائے یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے کہ انہیں کام دینے اور دنیا میں کچھ کر کے کھانے کے قابل بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں ۔ فی الحال ہمارا نقطہ نظر صرف ان کے اسلام کی حفاظت ہونا چاہیئے ۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ انہیں پناہ دے کر ایسے مسلمان خاندانوں کی خدمت میں دے دیا جائے جو انہیں غلاموں کی طرح نہیں بلکہ قابلِ رحم خدمت گاروں کی طرح پرورش کر سکیں ۔ یا اگر

کچھ ہنرمند ہوں تو کسی کار سے لگا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یتیموں اور محتاجوں کا یہ حشر کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے لیکن اگر ہماری قوم میں اتنا احساس نہیں ہے کہ وہ اپنے نونہالوں کی پرورش کا کوئی بہتر انتظام کرنے کے اسباب بہم پہنچائے تو ہمیں حسبِ ارشادِ نبوی[1] دو بلاؤں میں سے ایک چھوٹی بلا کو قبول کرنا چاہیئے اور یقیناً ایک مسلمان بچے کا مسلمان رہ کر خدمت گار بن جانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کفر کا طوق گلے میں ڈال کر بیرسٹر بن جائے۔

۴۔ مشنری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ

ایک اور ضروری تدبیر یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کو مشن اسکولوں اور کالجوں سے اٹھانے کی ایک باقاعدہ تحریک شروع کی جائے۔ ان مدارس کا مقصد علم وفن کی روشنی پھیلانا نہیں ہے بلکہ بچوں کو ان کے مذہب سے پھیر کر سینٹ پال کے خود ساختہ مذہب کی دعوت دینا ہے۔ اور عام طور پر ان کی تعلیم کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر طلبہ علانیہ مرتد نہیں ہوتے تو کم از کم اپنے مذہب سے برگشتہ ضرور ہو جاتے ہیں ان کے دل میں اسلام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی اسلامی عقائد سے صریحاً انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ عبادات کو کھیل سمجھنے لگتے ہیں۔ اسلامی شعائر کی کھلی کھلی توہین کرتے ہیں۔ اور صرف خاندانی قیود اور رسمی مزاحمت کے باعث اسلام کے ساتھ ان کا رشتہ برائے نام رہ جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بقول مسٹر آرنلڈ مشنری مدارس کی تعلیم[2] نے بعض اوقات بالکل الٹا اثر بھی کیا ہے۔ اور بعض طلبہ مرتد ہونے کے بجائے مسیحیت

---

[1] حدیثِ مذکورہ سے یہ شرعی قاعدہ اخذ کیا گیا ہے کہ جب دو ناجائز (یا ناپسندیدہ) کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے تو ان میں سے وہ اختیار کیا جائے جو کم تر درجے کا ناجائز (یا ناپسندیدہ) کام ہو۔ اس قاعدے کو اختیارِ اَهْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن کا نام دیا گیا ہے۔

کی کمزوریوں سے واقف ہو کر اس کے زبردست حریف بن گئے ہیں۔ مگر ایسی سعید روحیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر تو مشنری مدارس کے طلبہ کی وہی حالت دیکھی جاتی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ اور یقیناً انہیں اس بے دینی کے خطرے سے نکالنا ایک عظیم خدمتِ دینی ہے۔

اس تحریک کے خلاف یہ عذر پیش کیا جاتا ہے۔ کہ پہلے ہی مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ اور اس کے لئے کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ اس پر اگر مشنری مدارس کا بھی بائیکاٹ کر دیا جائے تو پھر ہمارے بچے آخر کہاں پڑھیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اوّل تو مشنری مدارس کی کمی کو سرکاری اور اسلامی مدارس مل کر پورا کر سکتے ہیں۔ جن کی تعلیم ان سے بدرجہا زیادہ قابلِ ترجیح ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہاں بھی اس کی تلافی ممکن نہ ہو تو ایک سچے مسلمان کے نقطۂ نظر سے مذہب کو اعلیٰ تعلیم پر کسی طرح قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مشنری مدارس کے سوا مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لئے کوئی ٹھکانہ میسر نہ آئے تو اسے قبول کرنے سے اس کو ٹھکرا دینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ ہمارے بچوں کا اسلام سے پھر جانا ان کے جاہل رہ جانے سے زیادہ بڑی مصیبت ہے۔ پس ضرورت ہے کہ مشنری تعلیم گاہوں کے خلاف پوری سرگرمی کے ساتھ پروپیگنڈا کیا جائے اور صرف پروپیگنڈا ہی نہیں بلکہ عملاً ہر مسلمان کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو ان مدارس سے اٹھا لے۔

۵۔ اقتصادی غلامی سے نجات۔

آخری اور موجودہ حالات میں سب سے ضروری تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ اقتصادی غلامی سے نکالا جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی فلاح کا سب سے بڑا ذریعہ حکومت تھی۔ ان میں تجارت اور سرمایہ داری کا ذوق کبھی نہ تھا مگر

ایک صنعت وحرفت کا قدرتی ذوق موجود تھا ۔ سو اس کے فوائد کا انحصار بھی حکومت اور متوسلین حکومت کی قدردانیوں پر تھا ۔ جب کہ حکومت چلی گئی تو ان کی خوش حالی اور دولت مندی کا سرچشمہ بھی سوکھ گیا ۔ اور اب یہ حالت ہے کہ جتنے صنعت وزراعت پیشہ مسلمان ہیں سب کے سب سرمایہ دار ہندوؤں کے غلام ہیں ۔ اور جنہیں اللہ نے آبائی ثروت عطا کی ہے ۔ وہ اپنے بگڑے ہوئے نظام تمدن اور اپنی غلط مسرفانہ عادات کے باعث روز بروز اسے قرض داری کی نذر کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس اقتصادی غلامی کا یہ اثر ہے کہ کاروباری زندگی میں ہندوؤں کی قوت مسلمانوں کے لئے مہلک حد تک بڑھ گئی ہے ۔ اور وہ یہاں تک ان پر چھا گئے ہیں ۔ کہ جس وقت چاہیں ایکا کر کے مسلمانوں کو تباہ کر دیں ۔ شہروں اور بڑے بڑے قصبات میں تو یہ صرف اقتصادی غلامی ہی تک محدود ہے ۔ مگر دور دراز کے دیہات میں یہی چیز ارتداد کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار بن گئی ہے ۔ اور غیر مسلم مبلغین پوری مستعدی کے ساتھ جاہل مسلمان دیہاتیوں کو مرتد بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ پس حفاظت اسلام کے لئے اس بیماری کا علاج بھی نہایت ضروری ہے ۔ بلکہ شاید موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ اس وقت جو چیز ہندوستان[1] میں اسلام کے وجود کو دھمکی دے رہی ہے وہ یہی اقتصادی خطرہ ہے ۔

یا چناں کن یا چنیں !

یہ ایک مستقل بحث ہے کہ مسلمانوں کو اس خطرے سے بچانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اس پر یہاں بحث کرنے کی گنجائش بھی نہیں ۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عظیم الشان کام کو انجام دینے کے لئے ہماری قوتوں کا موجودہ انتشار اور

---

[1] غیر منقسم ہندوستان مراد ہے

ہماری قومی جماعتوں کا موجودہ افتراق کسی حیثیت بھی موزوں نہیں ہے ہم ابھی تک ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجدیں قائم کرنے میں مشغول ہیں۔ اور یہاں پوری قوم کی متحدہ قوت درکار ہے۔ ہمیں ابھی تک ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور یہاں برسوں کی لگاتار اور انتھک محنتوں کی ضرورت ہے ہم کو ابھی تک سطحی شور اور ہنگامے میں مزا آتا ہے اور یہاں اصل مقصد کا گہرا شعور اور اس کے لئے حقیقی اخلاص وایثار مطلوب ہے۔ ہمیں ابھی تک صرف آگ کی طرح بھڑک کر جلا دینا آتا ہے۔ مگر یہاں اس کی حاجت نہیں ہے۔ اب تو ہمیں ایسی ہلکی سی حرارت کی ضرورت ہے جو برسوں تک اندر ہی اندر پکا کر لعل وگوہر تیار کر دیتی ہے۔

پس تمام تدبیریں اور تمام تجویزیں اس وقت تک بے کار ہیں جب تک ہم کو کام کرنے کا صحیح ڈھنگ نہ آجائے۔ اگر تحریکات میں یہی جذبہ برابر کام کرتا رہے اور اگر ہم دوسروں سے مقابلے کے بجائے آپس کے مکابرہ ہی میں بدستور مشغول رہیں اور اگر ہمارے تمام کام اجتماع وائتلاف کے اسلامی اصول کے بجائے افتراق کے خالص غیر اسلامی اصول پر چلتے رہیں۔ تو پھر بہتر ہے کہ یہ تمام اسکیمیں لپیٹ کر رکھ دی جائیں اور ایک دفعہ سب ہماں اسلام کے مستقبل کا فاتحہ پڑھ کر اپنے اپنے دل پسند مشاغل میں مصروف ہو جائیں۔

پس اے معمارانِ حرم

جس طرح ایک عمارت تیار کرنے کے لئے اچھے ساز وسامان سے زیادہ معمار کی اعلیٰ قابلیت درکار ہوتی ہے اسی طرح ہمیں مفید تدبیروں اور کارآمد تجویزوں سے زیادہ کام کرنے کی صلاحیت درکار ہے۔ دوا خواہ کتنی ہی مفید اور کارگر ہو لیکن اگر طبیب میں علاج کرنے کی قابلیت نہ ہو تو وہ مریض کے لئے کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی

پس اگر ہماری قوم کے اربابِ حلّ و عقد وقت کی نزاکتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرتے ہیں تو انہیں تمام دوسرے ملحوظات کو نظر انداز کرکے سب سے پہلے تنظیم قوائے ملّی کی طرف توجّہ کرنی چاہیئے ۔ اور جلد سے جلد اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دینا چاہیئے ۔ جو اس وقت ہماری تمام قومی تحریکوں میں جاری و ساری ہے ۔

⁂

مسلمانوں کا ذوقِ تبلیغ

جب سے بعض نومسلم قوموں میں ارتداد کی وبا پھیلی ہے ہندوستان[1] کے مسلمانوں میں عام ہلچل مچ گئی ہے اور ہر طرف سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی آواز بلند ہونے لگی ہے مختلف جماعتیں اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی بساط کے مطابق دعوت دینِ حق کی خدمت انجام دے رہی ہیں اخبارات و رسائل میں اس کی اہمیت پر گرما گرم بحثیں جاری ہیں۔ وسائلِ تبلیغ کی تحقیق کے لئے مجلسیں منعقد ہو رہی ہیں اور فی الجملہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں درحقیقت کوئی ذوقِ تبلیغ پیدا ہو گیا ہے لیکن جب ہم اس مسئلہ پر غائر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج کل کے مسلمان اس ذوقِ تبلیغ سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جو کسی زمانے میں اسلام کی فاتحانہ قوتوں کا ضامن اور اس کی عالمگیری جہاں کشائی کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار تھا۔ اگر آج ہمارے اندر وہی ذوق موجود ہوتا تو شاید ان کانفرنسوں اور مجلسوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، اور اغیار کی چیرہ دستیوں سے ہمارے گھر میں ماتم بپا ہونے کی بجائے خود اغیار کے مجمع میں ہمارے مذہب کی بڑھتی ہوئی قوت سے کھلبلی مچی ہوئی ہوتی۔ بعض وقت جب ہم

---

[1] غیر منقسم ہندوستان مراد ہے (۱۹۲۵ء میں)

غور کرتے ہیں کہ یہ اس مذہب کے پیروؤں کی چیخ و پکار ہے جس کے عناصر ترکیبی میں دعوت الی الخیر اور تبلیغ دین الٰہی کا فرض ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے شامل تھا، جس کے داعیؑ نے اپنی ساری زندگی خدا کا آخری پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دی تھی اور جس کے مقدس پیروؤں نے ایک صدی کے اندر اندر بحر الکاہل کے کناروں سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک کلمۂ حق کی اشاعت کر دی تھی تو ہم حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آیا یہ وہی مذہب ہے یا ہم مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی طرح اپنے پیغمبر کے بعد کوئی اور نیا مذہب بنا لیا ہے

ہماری زبانوں پر تبلیغ تبلیغ کا ورد جاری ہے اور ہم تبلیغ کے لئے انجمنیں بنا کر اسلام کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں مگر شاید یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ اس کے پیروؤں نے عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنانے کی کوشش کی ہے، یا اس بے نوائی کے ساتھ تبلیغ کا شور مچایا ہے اگر کامیابی کا حقیقی راز صرف انجمن سازیوں اور شور و شغب میں ہوتا تو یقیناً ہماری ترقی کی رفتار ہمارے اسلاف سے زیادہ تیز ہونی چاہیئے تھی لیکن اس کے برعکس ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ساز و سامان کو لے کر ہمارا ہر قدم پیچھے اٹھ رہا ہے اور اس بے سامانی کے عالم میں ہمارے اسلاف کی کامیابیوں کا یہ عالم تھا کہ ان کی بدولت آج دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کے پیرو موجود ہیں اور خود ہندوستان میں ہماری تعداد سات؎ کروڑ تک پہنچی ہوئی ہے پھر آخر سوچنا تو چاہیئے کہ ہم میں کس چیز کی کمی ہے اور اشاعت اسلام کا اصلی راز کیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ آج یہ جتنی کمزوریاں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی ہیں سب صرف اس لئے ہیں کہ ان میں سے اسلامی روح نکل گئی ہے اور وہ بھول گئے ہیں کہ مسلمان ہونے

؎ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے اب تو برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آبادی کم و بیش سترہ کروڑ ہو چکی ہے۔

کی حیثیت سے وہ کیا ہیں اگر وہ اسلام کو سمجھ لیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور اس کا نصب العین کیا ہوتا ہے تو یہ تبلیغ و اشاعت اسلام کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے۔

مسلمان کا مقصد وجود

پروفیسر میکس مُلرؒ MAX. MULLER کے بقول اسلام دراصل ایک تبلیغی مذہب ہے جس نے اپنے آپ کو تبلیغ کی بنیادوں پر قائم کیا، اسی کی قوت سے ترقی کی اور اسی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے اسلامی تعلیمات پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اگر کوئی مقصد ہے تو وہ صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن حکیم میں مسلمان کا مقصد حیات یہ بیان کیا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران ۳-۱۱۰)

اور دنیا کے لئے اس کے وجود کی ضرورت صرف یہ ظاہر کی گئی ہے کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط (آل عمران: ۱۰۴)

اسے جگہ جگہ حکم دیا گیا ہے کہ:

اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل: ۱۲۵)

اور: فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ (قٓ: ۴۵)

اور فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ (الغاشیۃ: ۲۱)

یہی تعلیم تھی کہ جس کا اثر رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زندگی پر سب سے زیادہ غالب تھا اور اسی نے حضرات صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کو بالکل بدل دیا تھا۔ ان کی مقدس زندگیاں عبارت تھیں صرف دعوت و تبلیغ سے، ان کا

اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، غرض ہر کام اپنے اندر یہ معنوی مقصد پوشیدہ رکھتا تھا کہ خدا کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اللہ کے بندوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کریں۔

جب تک مسلمانوں میں قرآن حکیم اور اسوۂ رسول ﷺ کی ان تعلیمات کا اثر باقی رہا اس وقت تک ہر مسلمان کی زندگی ایک مبلغ اور داعی کی سی زندگی رہی۔ انہوں نے صنعت، تجارت، زراعت، حکومت اور دنیا کے سارے کام کیئے مگر دل میں یہ لگن رہی کہ اسلام کی جو نعمت خدا نے عطا کی ہے اس سے تمام بنی نوع انسان کو بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ حقیقتاً اسلام کو دنیا کیلئے بہترین نعمت سمجھتے تھے اور اس لئے ان کا ایمان تھا کہ ہر انسان تک اس نعمت کو پہنچانا ان کا فرض ہے جو شخص جس حال میں تھا اسی حال میں وہ یہ فرض انجام دیتا تھا۔ تاجروں نے تجارت کے کام میں، مسافروں نے اپنے سفر کے دوران میں، قیدیوں نے اپنے قید خانوں میں، ملازموں نے اپنے دفتروں میں مزارعوں نے اپنے کھیتوں میں یہ مقدس خدمت انجام دی اور یہ ذوق اس حد تک ترقی کر گیا کہ عورتوں تک نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کی۔

اسلام کی قوت کا اصلی سرچشمہ

یہی ذوق حقیقتاً اسلام کا اصلی سرچشمہ تھا۔

آج جو دنیا میں چالیس کروڑ؎ مسلمان نظر آرہے ہیں اور دنیا کی مختلف نسلوں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں پر اسلام کی حکومت قائم ہے وہ صرف اسی ذوق تبلیغ کا نتیجہ ہے۔

اسلام کے دشمن کہتے ہیں کہ اس کی اشاعت صرف تلوار کی رہین منت

؎ یہ اندازہ ۱۹۲۵ء کا ہے اب تو دنیا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً دوگنی ہو چکی ہے

ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ وہ صرف تبلیغ کی منت پذیر ہے اگر اس کی زندگی تلوار پر ہی منحصر ہوتی تو وہ تلوار ہی سے فنا بھی ہو جاتی، اور اب تک تلوار سے اس پر جتنے حملے ہوئے ہیں وہ اسے فنا کر دینے میں قطعاً کامیاب ہو جاتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات اس نے تلوار سے مغلوب ہو کر تبلیغ سے فتح حاصل کی ایک طرف بغداد میں قتل عام جاری تھا اور دوسری طرف سماٹرا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ (اندلس) سے اسلام مٹایا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف جاوا میں اس کا علم بلند ہو رہا تھا۔ ایک طرف صقلیہ سے اسے ختم کر جا رہا تھا اور دوسری طرف جاوا میں اس کو ایک نئی زندگی حاصل ہو رہی تھی۔ ایک طرف تاتاری اس کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اور دوسری طرف وہ خود ان کے دلوں کو فتح کر رہا تھا ایک طرف ترک اسے غلامی کا طوق پہنا رہے تھے اور دوسری طرف خو ملان کے دل اپنے آپ کو اس کی غلامی کے لئے پیش کر رہے تھے۔

اگر یہ اس کی تبلیغ کی فتح نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ آج اسلام کی وہ فتوحات جنہیں شمشیری فتوحات کہا جا سکتا ہے دنیا سے مٹ چکی ہیں۔ اسپین فنا ہو چکا، صقلیہ مٹ گیا، یونان تباہ ہو گیا، مگر وسط افریقہ، جاوا، سماٹرا، چین اور جزائر ملایا جنہیں اس نے تبلیغ کے ہتھیار سے فتح کیا ہے بدستور موجود ہیں اور اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے پھر کیا یہ تبلیغ مشنری سوسائیٹیوں کے ذریعے کی گئی تھی؟ کیا یہ عظیم الشان فتوحات اسی بے عمل چیخ و پکار کے ذریعے حاصل ہوئی تھی جس میں آج ہم مشغول ہیں؟ کیا یہ عالمگیریاں ان رسالہ بازیوں، ان کاغذی لڑائیوں اور ان قلمی ترکتازیوں کی منت کش ہیں جنہیں ہم نے مسیحی مبلغین کی تقلید میں اختیار کیا ہے تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے اس مضمون

میں ہم اسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں ۔

اشاعتِ اسلام کے اسباب

اگر واقعات و حقائق کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تین چیزیں لازمی عنصر کی حیثیت سے شریک ہیں ۔

ایک اس کے سادہ عقائد اور دل کش عبادات

دوسرے مسلمانوں کی زندگی میں اس کی تعلیم کے حیرت انگیز نتائج اور

تیسرے مسلمانوں کا ذوق تبلیغ ۔

پہلی چیز عقل سے اپیل کرتی ہے ، دوسری جذبات کو ابھارتی ہے اور تیسری ایک مشفق کی طرح بھولے بھٹکوں کو راہ راست پر لگاتی ہے جس طرح بازار میں ایک متاع کی مقبولیت کے لئے صرف اس کی ذاتی خوبی ہی ضمانت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے ایسے کارکنوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس کی خوبیاں اور فوائد لوگوں کے ذہن نشین کرائیں اور ایسے شاہد بھی درکار ہوتے ہیں جو اپنے اندر اس کے منافع کی عملی شہادت دیں ، اسی طرح دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لئے بھی ان تینوں چیزوں کے مساویانہ اشتراک عمل

کی ضرورت رہی ہے اور جب کبھی اس میں کسی ایک کی کمی رہ گئی ہے۔ تو ضرور اشاعت اسلام کی تیز رفتاری پر بھی اس کا اثر پڑا ہے یہ تینوں چیزیں کس طرح اپنا عمل کرتی ہیں اور ان کے اشتراک عمل سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں اس کو جاننے کے لئے ذرا تشریح کی ضرورت ہے۔

اسلامی عقائد کی سادگی اور فطرت سے ہم آہنگی

اسلامی عقائد اس قدر سادہ اور دل نشین ہیں کہ ایک معمولی سے معمولی عقل کا انسان بھی انہیں تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے نہ ان کے اندر کسی قسم کی پیچ در پیچ فلسفیت ہے نہ ان میں کسی قسم کے ظن و اوہام سے کام لیا گیا ہے۔ نہ ان کے اندر دور از کار باتوں کو دخل ہے چند نہایت صاف اور سیدھے سے اصول ہیں جنھیں عقل نہایت آسانی سے قبول کر لیتی ہے اور جنہیں قبول کر لینے کے بعد انسان کو اپنے اندر خود ایک حیرت انگیز انقلاب محسوس ہونے لگتا ہے ان سب باتوں کے ساتھ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر چیز نہایت صاف اور قطعی ہے جس کے اندر کسی قسم کے احتمالات نہیں ہیں۔

خدا کے متعلق اس نے بالکل واضح عقیدہ پیش کیا ہے۔

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (الانبیاء : ۱۰۸)

یعنی تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے اس میں دوئی کا ہرگز احتمال نہیں ہے۔

لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ (النحل : ۵۱)

اور اس کے لئے کسی مددگار کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝) ————

(وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ـــ ابراہیم ـــ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ـــ المائدہ) اس کی ذات والدین اور ولدیت سے بھی مبرّا ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

(لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ـــ الاخلاص)

اسے کسی قسم کے انسانی عوارض لاحق نہیں ہوتے۔

(اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ ـــ البقرہ)

آسمان اور زمین میں اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں ہے جس سے انسان استمداد اور استعانت کر سکتا ہو۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ ـــ البقرہ: ۱۰۷)

وہی اس قابل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

(فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ـــ الزمر: ۲)

اسی طرح رسالت کے متعلق بھی اس نے کسی قسم کی الوہیت کا شبہ باقی نہیں رکھا ہے اور نہایت صفائی کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا ہے کہ رسول ایک انسان کے سوا کچھ نہیں ہوتا جسے خدا نے اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے منتخب فرمایا ہے۔

(اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ـــ الکہف: ۱۱۰)

اور ہر قوم کے لئے خدا نے ایک ہادی بھیجا ہے۔ (وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۔ الرعد)

اعمال اور ان کی ذمہ داری کے متعلق اس نے پوری صفائی کے ساتھ متنبہ کیا ہے کہ یہاں کوئی کفارہ اور بدل نہیں ہے، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور جو شخص جیسے اعمال کرے گا اسے ویسی جزا یا سزا ملے گی

(فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال)

معاد کے متعلق اس نے ایسا صاف اور واضح عقیدہ پیش کیا ہے کہ کسی مذہب نے بھی نہیں کیا۔ نہ اس میں بدھ مذہب کا بعید از عقل فلسفۂ نجات ہے نہ ویدک دھرم کا پیچ در پیچ فلسفہ تناسخ اور نہ دہریت کا عقیدہ فنائے کامل، بلکہ اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ انسان اپنی موجودہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ اپنی آئندہ زندگی میں دیکھے گا اور اصلی زندگی وہی ہوگی۔

یہ عقائد اس قدر سیدھے سادے ہیں کہ انسانی عقل انہیں آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی ہے اور اسلامی مبلغین کو ہمیشہ اپنی تبلیغ میں اس لئے کامیابی ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی پیچیدہ چیز پیش نہیں کرتے جسے تسلیم کرنے سے عقل ابا کرتی ہو۔ ایک مشہور فرانسیسی عالم پروفیسر مانٹیٹ ان عقائد کے متعلق لکھتا ہے کہ: "ایسا عقیدہ جو اس قدر واضح، فلسفیانہ پیچیدگیوں سے اس قدر مبرا اور اس قدر معمولی عقل میں آجانے کے قابل ہو، اس میں یقیناً انسانی نفس کو مسخر کر لینے کی معجز نما قوت ہونی چاہیئے اور فی الواقع وہ ایسی قوت رکھتا ہے۔"

انسانی عقل پر ان عقائد کا جتنا گہرا اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یورپین سیاح افریقہ کی گالا قوم کے ایک آزاد شدہ غلام سے ملا جسے بچپن میں ساحل زنج سے پکڑ کر جدہ میں فروخت کر دیا گیا تھا سیاح نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے دل میں ان لوگوں کے لئے کوئی نفرت نہیں ہے جنھوں نے تم کو بلا کسی حق کے پکڑ کر جانوروں کی طرح فروخت کر دیا! اس کے جواب میں اس حبشی غلام نے کہا کہ:

"ہاں میرے دل میں طبعاً ان کی طرف سے رنج موجود ہے مگر ایک

چیز نے اس کی تلافی کر دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ میں ان کی بدولت کفر کی جہالت سے نکل گیا ہوں، میں اسے خدا کا فضل وکرم سمجھتا ہوں کہ میں اس ملک میں لایا گیا اور مجھے اسلام کی نعمت حاصل ہوئی یقین کیجئے کہ ایمان کی حلاوت سے بڑھ کر کوئی حلاوت نہیں ہے اور یہ ایسی حلاوت ہے جسے صرف دل ہی محسوس کرتا ہے، زبان سے اس کا بیان ممکن نہیں"

اسلامی عبادات کی دل کشی اور جاذبیّت

یہی حال اسلامی عبادات کا ہے، ان میں کچھ ایسی دل کشی اور جاذبیّت بھری ہوئی ہے کہ مانٹیسکیو کے بقول کوئی دل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سعید بن حسن، اسکندریہ کے ایک یہودی نے لکھا ہے:

"میں محض مسلمانوں کی عبادت دیکھ کر مسلمان ہوا ہوں۔ ایک دفعہ میں جامع مسجد میں نماز کا منظر دیکھنے گیا۔ سب سے پہلے جس چیز نے میرے دل پر اثر کیا وہ خطبہ تھا اس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر اثر کر رہا تھا اور خصوصاً جب خطیب نے کہا کہ

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ج ——— النحل: ۹۰

تو میرے دل میں ایسے مذہب کی بے حد عزت قائم ہو گئی جس کا خدا اتنی اعلیٰ تعلیم دیتا ہو پھر جب نماز شروع ہوئی اور مسلمان پرے کے پرے باندھ کر کھڑے ہوئے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ فرشتے ہیں جن کے سامنے خدا بے نقاب ہو کر آ گیا ہے اور میرے دل نے کہا کہ اگر خدا نے دو مرتبہ بنو اسرائیل سے کلام کیا تھا تو اس قوم کے ساتھ وہ روز پانچ مرتبہ کلام کیا

کرتا ہے:“

نماز کی یہ شان کہ اس کے لئے نہ کسی پروہت کی قید ہے نہ پادری کی۔ نہ کسی مندر کی شرط ہے نہ گرجا کی۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ ہر جگہ اس کی مسجد ہے اور ہر شخص بلا امتیاز درجہ و قومیت اس میں شریک ہو سکتا ہے نماز اس قدر بلا کی تاثیر اپنے اندر رکھتی ہے کہ متعصب سے متعصب دشمنانِ اسلام بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ان دیکھے خدا کی عبادت اس انداز کے ساتھ کہ محض اس کے ذہنی تصور سے دلوں پر خشوع وخضوع طاری ہے اور تمام حرکات و سکنات سے انتہائی عظمت وخوف کے آثار نمایاں ہیں، پتھر سے پتھر دل کو بھی موم کر دیتی ہے پادری لیفرائے جس سے علمائے ہند کے معرکتہ الآرا مناظرے شاید ابھی تک لوگوں کی یاد میں محفوظ ہوں، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

> ”کوئی شخص مسلمانوں کی اس عبادت کو دیکھ کر اس کے اثر سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان خواہ کہیں ہو، سڑک پر چل رہا ہو، ریلوے اسٹیشن پر ہو، دوکان پر بیٹھا ہو یا میدان میں ٹہل رہا ہو، اذان ہوتے ہی سب کام چھوڑ دیتا ہے اور ایک خدا کے آگے جھک جاتا ہے خصوصیت کے ساتھ جس شخص نے دہلی کی جامع مسجد میں الوداع کے دن پندرہ بیس ہزار مسلمانوں کو نہایت خاموشی اور خشوع وخضوع کے ساتھ دیکھا ہو وہ اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کے دل میں اس قوت کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے جو اس مذہبی نظام میں کام کر رہا ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کی روزانہ پنج وقتہ نماز کی باقاعدگی اور انتہائی شوروغل

کے اوقات میں بھی ان کا سکون اور اطمینان سے اپنا فرض ادا کرنا اپنے اندر ایک خاص پیغام رکھتا ہے "

اسلامی تعلیمات کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر

عقائد و عبادات کے بعد دوسری چیز جو اپنی عملی تاثیر کے اعتبار سے اسلام کی اشاعت میں سب سے زیادہ کارگر قوت ہے وہ مسلمانوں کی اسلامی زندگی ہے۔ اسلام اگر صرف اصول ہی پیش کرتا اور اس کی تعلیمات میں وہ انقلاب انگیزیاں نہ ہوتیں جنہوں نے وحشی قوموں کو بھی انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا تو شاید دنیا اس کی طرف بہت کم مائل ہوتی لیکن اس نے اصول کے ساتھ اعمال بھی پیش کئے ہیں اور فی الحقیقت یہ انہی کی مقناطیسی قوت ہے جو دلوں کو اس طرف کھینچتی ہے۔

خدا کی وحدانیت، اس کی قدرت اور صرف اسی کے سزاوار استعانت ہونے کے متعلق اسلام کی تعلیمات نے مسلمانوں کو اس قدر خوددار، اس قدر صابر و شاکر اور اس قدر متحمل و مستقل مزاج بنا دیا ہے کہ وہ نہ کسی سے دنیا میں ڈرتے ہیں، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور نہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت کے مقابلے میں مایوس ہوتے ہیں۔ جزا و سزا اور یوم آخر کے متعلق اسلام کی تعلیم نے ان کے اندر اتنی شجاعت و بہادری پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کو فانی سمجھ کر ہر وقت اسے خدا کے نام پر قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور ان کے خون کی حرارت دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ پرہیزگاری اور اتقاء کے متعلق اسلامی تعلیمات نے ان کے اندر غیر معمولی زہد و تقویٰ پیدا کر دیا ہے، اور شراب، چوری اور

اخلاقی جرائم سے احتراز کرنے میں وہ تمام مذاہب کے پیرووں سے بڑھے ہوئے ہیں ۔ انسانی مساوات اور اسلامی اخوت کے متعلق اسلام کی تعلیم نے ان کے اندر ایسی جمہوری روح پھونک دی ہے کہ نہ ان کے ہاں نسل و رنگ کا امتیاز ہے نہ ذات پات کی قید، نہ امیر غریب کا فرق اور نہ قومیت و وطنیت کا تعصب ۔ ہر شخص اسلام قبول کر لینے کے بعد اسلامی برادری کا ایک رکن بن جاتا ہے خواہ وہ کالا ہو یا گورا، امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، بہرحال مسلمان اس کو اپنا بھائی سمجھنے پر مجبور ہیں اور وہ نماز میں بڑے سے بڑے مسلمانوں کے برابر کھڑے ہونے کا حق رکھتا ہے ۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی زندگی میں دوسری اسلامی تعلیمات کے اثرات بھی نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں مثال کے طور پر وہ علم اور تہذیب و تمدن ہے جو اسلام قبول کرتے ہی وحشی سے وحشی قوموں میں گھر کر لیتا ہے ۔ یورپ کے مسیحی مبلغین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں کہ افریقہ کی وحشی سے وحشی قوموں میں اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مدنیت کے آثار بھی پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ مساجد کی تعمیر، مدارس کا قیام، اجتماعی زندگی اور اس کے ساتھ تجارت اور خوشحالی کی ترقی، یہ ایسی چیزیں ہیں جو رفتہ رفتہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ افریقہ کی وحشیانہ زندگی کو تمدن و حضارت سے بدل دیتی ہے اور انہیں دیکھ کر دوسری وحشی قوموں کو بھی وہی مذہب قبول کر لینے کی خواہش ہوتی ہے جو ان کے ہم جنسوں کو اتنی جلدی اتنے بلند درجے پر پہنچا دیتا ہے ۔ تاریخوں میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں جب بالائی نائیجیریا کی سب سے زیادہ طاقت ور ریاست جنی ملے میں بربروں

نے اسلام کی اشاعت شروع کی تو وہاں نہایت کثرت سے علماء فضلاء پیدا ہو گئے اور جب بادشاہ نے اسلام قبول کرنے کے لئے ایک مجلس مقرر کی تو اس میں دو ہزار چار سو علماء شریک ہوئے۔ اسلام کے ان مدنیت پرور اثرات نے عرب، ہندوستان، مصر اور اسپین (اندلس) میں جو حیرت انگیز نقوش چھوڑے ہیں ان کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔ تاریخ و آثار کی ان پر نہایت روشن شہادت موجود ہے۔

اسلامی مساوات کی اثر انگیزی

اسلامی زندگی میں سب سے زیادہ مؤثر چیز مساوات ہے وہ تمام ان قوموں کے لئے ایک آسمانی رحمت ہے جنہیں رسم و رواج اور طاقت و اقتدار کی خود غرضی نے انسانیت کی عام سطح سے نیچے رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسلام ان کے لئے پیغام نجات کا حکم رکھتا ہے اور زمانہ شاہد ہے کہ اس نے ایسی ہزاروں قوموں کو قعر ذلت سے اٹھا کر آسمان عزت و شرافت تک پہنچا دیا ہے۔ اس شان مساوات نے اسلام کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور تقریباً تمام ان علاقوں میں جہاں ایسی مظلوم قومیں رہتی ہیں اسلام کی مقبولیت کا واحد ذریعہ یہی چیز ہے۔ سر ولیم ہنٹر بنگال کی نیچ ذات قوموں میں اشاعت اسلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

> ان غریب مچھیروں، شکاریوں اور نیچ ذات کسانوں کے لئے اسلام ایک آسمانی رحمت بن کر نازل ہوا۔ وہ نہ صرف حکمران قوم کا مذہب تھا بلکہ اس میں اتنی مساوات بھی تھی کہ وہ اس کی بدولت خود ان لوگوں سے بھی زیادہ

> بلند درجہ حاصل کر سکتے تھے جو انہیں ذلیل خیال کرتے تھے (یعنی ہندو) اس بنا پر اسلام ملک کے سب سے زیادہ خوشحال صوبہ پر قابض ہو گیا۔ اگرچہ تاریخ میں کہیں کہیں جبریہ اشاعت اسلام کی مثالیں بھی ملتی ہیں مگر دراصل قوت وہ چیز نہیں ہے جس کا اسلام ممنون ہے، بلکہ وہ خود اس کی خوبیاں ہیں۔ اس نے اہل بنگال کی عقل کو اپیل کیا، ان کے سامنے انسانیت کا ایک بلند مفہوم پیش کیا، انسانی برادری کا ایک ایسا عجیب اصول قائم کیا۔ جس سے وہ بالکل ناآشنا تھے اور ذات پات کی قیدوں کو بالکل توڑ دیا“

جنوبی ہند میں زیادہ تر اسی مساوات کی بدولت اسلام نے ہندوبت پر فتح پائی ہے آج سے بیس پچیس سال پہلے تناویلی کے علاقہ میں جو واقعہ پیش آیا تھا وہ اس فتح کا ایک سبق آموز نمونہ ہے اس علاقے میں شنار نامی ایک قوم رہتی ہے جس کا شمار نیچ قوموں میں ہوتا تھا اپنی ہنرمندی اور مستعدی کی بدولت اس نے کافی دولت پیدا کی اور تعلیم ومعاشرت کے اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلے میں اس کا درجہ بہت بلند ہو گیا مگر پھر بھی ہندو اس کے ساتھ وہی اہانت آمیز سلوک کرتے رہے جو اچھوتوں کے ساتھ وہ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس سے شناروں کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچتا تھا اور ان کے دل ہندو مذہب سے پھرتے جاتے تھے آخر ایک مرتبہ ہندوؤں سے ان کی سخت جنگ ہوئی اور محض چند شناروں کے ایک مندر میں گھس جانے پر ہندوؤں نے ان کو سخت زدوکوب کیا اس پر تمام شناروں نے مسلمان ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تقریباً چھ سو شنار اسی تاریخ کو مسلمان ہو گئے اور جوں جوں آس پاس کے دیہات میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچتی گئی شنار ذات کے لوگ اسلام قبول کرتے چلے گئے۔

افریقہ کے حبشیوں میں بھی یہی انسانی مساوات اور اسلامی اخوت اشاعتِ اسلام کی سب سے زیادہ مؤثر قوت ہے مسٹر بلائیڈن اپنی کتاب "عیسائیت، اسلام اور نیگرو نسل"

"جونہی کسی بت پرست حبشی کے متعلق پیروانِ محمدؐ کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام لانے کا ارادہ رکھتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی وحشی اور ادنی درجے کا آدمی کیوں نہ ہو اسے فوراً اپنی اسلامی برادری میں ایک برابر کے رکن کی حیثیت سے شامل کر لیا جاتا ہے اور محض تالیفِ قلبی ہی کے لئے نہیں بلکہ حقیقتاً بھائی سمجھ کر اس کی اتنی خاطر مدارت کی جاتی ہے کہ وہ بہت جلدی اپنے لئے اسلام کی غیر معمولی نعمتوں کو محسوس کر لیتا ہے افریقہ میں اسلام کو عیسائیت پر جو تفوق حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔"

صوفی مُبلّغینِ اسلام کی خدماتِ جلیلہ

گزشتہ صفحات میں اشاعت اسلام کے دو اہم اسباب سے بحث کی جا چکی ہے اب اس کے عملی پہلو پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیئے کہ اس آسمانی صداقت پر ایمان لانے والوں نے اس کی روشنیوں کو اقطاع عالم میں پھیلانے کے لئے کیا کیا کوششیں کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصل چیز تو وہی اسلام کی ذاتی خوبیاں اور عملی محاسن ہیں جو ہر قلب سلیم سے اس کو ایک سچا دین قبول کرا لیتی ہیں لیکن دنیا کے مشاہدہ میں ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ اچھی سے اچھی متاع بھی، اگر اس کا اشتہار نہ ہو تو رکھی رہ جاتی ہے اور بیچنے والے مستعد کارکن بُری سے بُری متاع کے خریدار بھی بازار میں پیدا کر لیتے ہیں جب تک کسی چیز کے اوصاف اور منافع کو لوگوں تک پہنچایا نہ جائے اور دلوں میں اس کیلئے شوق پیدا نہ کیا جائے اس وقت تک خاص خاص طبائع کے سوا عام

طبیعتیں اس کی طرف کم رجوع کرتی ہیں؛ اور اسی لئے ہر متاع کی کامیابی عموماً اس کے سوداگروں کی سرگرمی، مستعدی اور قوت تشہیر پر منحصر ہوا کرتی ہے یہی اصول مذاہب کی اشاعت پر بھی یکساں حاوی ہے اسلام خواہ کتنا ہی سچا اور بہتر مذہب ہو مگر اس کی اشاعت کے لئے صرف اس کی ذاتی خوبیاں ہی کافی نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کے پیروؤں کا ذوق تبلیغ بھی ضروری ہے بلکہ وہ صحیح طور پر یہ ذوقِ تبلیغ اشاعت اسلام کے ارکان ثلثہ میں عملی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسلمانوں کے ذوقِ تبلیغ کی جہانگیری

آج ہم بے عمل مسلمان اس حیرت انگیز ذوقِ تبلیغ کا ٹھیک ٹھیک تصور بھی نہیں کر سکتے جو گزشتہ زمانے کے دیندار مسلمانوں میں کام کر رہا تھا اور جو ہمارے موجودہ زمانہ میں بھی افریقہ، چین[1] اور جزائر ملایا کے مسلمانوں میں کام کر رہا ہے ان لوگوں کے وظائفِ حیات میں سب سے زیادہ اہم وظیفہ اگر کوئی تھا تو وہ صرف اس دین کی صداقت کو بنی نوع انسان کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانا تھا جس کی روشنی سے ان کے دل معمور تھے۔ ان کے دلوں پر عقیدہ پتھر کی لکیر بنا ہوا تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے ان کی پیدائش کا مقصد صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے وہ جہاں جاتے تھے وہ مقصد ان کے ساتھ جاتا تھا اور ان کی زندگی کے ہر عمل میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ وہ قریش کے مظالم سے بھاگ کر حبشہ گئے تو وہاں بھی انہوں نے صرف یہی کام کیا انہیں مکہ سے نکل کر مدینہ میں

---

[1] یہ اس زمانے کی بات ہے جب چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ نہ ہوا تھا۔

امن کی زندگی نصیب ہوئی تو اپنی تمام قوت انہوں نے اسی تبلیغ دینِ الٰہی میں صرف کردی۔ ان کو ساسانی اور رومانی تہذیبوں کے بوسیدہ قصر گرا دینے کی خدمت عطا کی گئی تو شام و عراق اور ایران و روم میں بھی انہوں نے صرف یہی مقدس فرض انجام دیا۔

> انہیں خدا نے زمین کی خلافت عطا فرمائی تو اس سے بھی انہوں نے عیش پرستی نہیں کی بلکہ وہ اللہ کے دین کی اشاعت کرتے چلے گئے یہاں تک کہ ایک طرف اوقیانوس کی طوفانی موجوں نے انہیں روک دیا اور دوسری طرف چین کی سنگین دیوار ان کے راستے میں حائل ہوگئی وہ اپنے تجارت کے مال لے کر نکلے تو اس میں بھی ان کے دلوں پر یہی خواہش چھائی رہی اور انہوں نے افریقہ کے تپتے ہوتے ریگستانوں میں، ہندوستان کی سرسبز وادیوں میں، بحرالکاہل کے دور افتادہ جزیروں میں اور یورپ کے سپید رنگ کفرزاروں میں ملت حنیفی کی روشنیوں کو پھیلا دیا۔

یہ ذوق تبلیغ یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ قید خانوں کی کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلتے وقت بھی ان کے دلوں سے اس کی لذت محو نہیں ہوتی تھی۔ وہ اندھیری کوٹھڑیوں میں اپنے اصحاب سجن کو بھی اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور حد یہ ہے کہ دار پر بھی انہیں اگر کسی چیز کی تمنا ستاتی تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ اپنے آخری لمحات زندگی کو اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دیں۔

بیلجین کانگو کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب حکومت بلجیئم نے وہاں کے ایک مسلمان امیر کو گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم سنا دیا تو اس نے دنیا سے چلتے چلتے خود اس پادری کو بھی مسلمان کر لیا جو اسے مسیحیت کا

پیغام نجات دیتے گیا تھا۔

حضرت سید مجدد احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتب سیر میں لکھا ہے کہ جہانگیر کی قید میں دو سال کا زمانہ انہوں نے محض فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی میں گزارا اور جب رہا ہوئے تو کئی سو ہندو قیدی ان کی برکت سے دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے ہمارے موجودہ زمانے میں بھی مولانا محمد جعفر تھانیسریؒ نے، جو مجاہدین سرحد سے ساز باز رکھنے کے الزام میں کالے پانی بھیجے گئے تھے، انڈمان کے بہت سے قیدیوں کو مسلمان کر لیا تھا مشرقی یورپ میں تو اسلام کی اشاعت تنہا ایک مسلمان عالم کی کوششوں کا نتیجہ تھی جو نصاریٰ سے جہاد کرتا ہوا گرفتار ہو گیا تھا۔ قید کی حالت میں وہ پابہ زنجیر ڈان اور ڈینیوب کے درمیانی علاقے میں بھیج دیا گیا اور وہاں اس کے خلوص قلب کی روشنی اس قدر پھیلی کہ تھوڑے عرصے میں بارہ ہزار آدمی مسلمان ہو گئے اور چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تقریباً سارا علاقہ اسلام کی برکات سے معمور ہو گیا۔

مسلمان خواتین کا ذوق تبلیغ

اس عالمگیر ذوق سے مسلمانوں کی عورتیں بھی خالی نہ تھیں۔ تاتاری مغلوں سے جن ہاتھوں نے مسلم کشی کی تلوار چھین کر اسلام کی اطاعت کا طوق پہنایا تھا وہ انہی ضعیف اور نازک عورتوں کے ہاتھ تھے جنہیں یہ لوگ ممالک اسلامیہ سے لونڈیاں بنا کر لے گئے تھے غازان شاہ کے بھائی اولجایتو خاں کو اس کی بیوی ہی نے مسلمان کیا تھا اور اسی کی بدولت ایلخانی حکومت ایک اسلامی حکومت بن گئی تھی۔ چغتائی خاندان مسلمانوں کا سب سے بڑا

دشمن تھا مگر قُرّہ ہلاکو خاں کی مسلمان بیوی نے اپنے سب سے پہلے اسلام سے متعارف کیا اور اسی کے اثر سے مبارک شاہ اور براق خاں مسلمان ہوئے۔ تاتاری فوجوں کے ہزارہا سپاہی اپنے ساتھ مسلمان عورتوں کو لے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے کافر شوہروں کا مذہب اختیار کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ تر ان کے بچوں کو، مسلمان کر لیا اور انہی کی بدولت تمام بلادِ تاتار میں اسلام پھیل گیا۔ اسی طرح ملک حبش میں بھی خواتین ہی نے اشاعت اسلام کا کام کیا ہے چنانچہ متعدد ایسے حبشی رئیسوں کا تذکرہ تواریخ میں مذکور ہے جنہیں ان کی مسلمان بیویوں نے اسلام کا حلقہ بگوش بنایا تھا سنوسی مبلغین نے تو وسط افریقہ میں مستقل طور پر اشاعت اسلام کے لئے خواتین کے اداروں سے کام لیا ہے چنانچہ وہاں سینکڑوں زنانہ مدارس قائم ہیں جن میں لڑکیوں کو اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔

صوفیائے کرامؒ کی خدمات ہندوستان میں

مگر مسلمانوں میں جو جماعت سب سے زیادہ تبلیغ دین الٰہی کے ذوق وشوق سے گرم سعی رہی ہے وہ وہی صوفیائے کرام کی جماعت ہے جو آج ہندوستان[1] میں اس طرف سے تقریباً بالکل ہی غافل ہے خود ہندوستان میں اولیاء صوفیا نے جس بے نظیر استقلال اور دینی شغف کے ساتھ اسلام کی روشنیوں کو پھیلایا ہے وہ ہمارے آج کل کے حضرات متصوفین کے لئے اپنے اندر ایک عمیق درس بصیرت رکھتا ہے یہاں کے سب سے بڑے اسلامی مبلغ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی برکت سے

---

[1] غیر منقسم ہندوستان یعنی موجودہ پاکستان اور بھارت مراد ہے۔

راجپوتانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور جن کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مریدین تمام اقطاع ملک میں اسلام کی شمع ہدایت لے کر پھیل گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی کے اطراف میں، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے علاقہ پنجاب میں، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی اور اس کے نواح میں، حضرت سید محمد گیسو درازؒ، حضرت شیخ برہان الدینؒ اور حضرت شیخ زین الدینؒ اور آخر زمانہ میں اورنگ آباد کے حضرت نظام الدینؒ نے ملک دکن میں اور دوسرا آخر میں حضرت شاہ کلیم اللہؒ جہاں آبادی نے دہلی مرحوم میں بھی دعوت الی الخیر اور تبلیغ اوامر اسلام کی خدمت انجام دی۔ ان کے علاوہ دوسرے سلسلوں کے اولیائے عظام نے بھی اس کام میں انتھک مستعدی سے کام لیا۔ پنجاب میں سب سے پہلے اسلامی مبلغ حضرت سید اسماعیل بخاریؒ تھے جو پانچویں صدی ہجری میں لاہور تشریف لاتے تھے ان کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ ہزارہا کی تعداد میں ان کے ارشادات سننے آتے تھے اور کوئی شخص جو ایک مرتبہ ان کا وعظ سن لیتا وہ اسلام لاتے بغیر نہ رہتا۔ مغربی پنجاب میں اسلام کی اشاعت کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاء الحق زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے علاقہ بہاولپور اور مشرقی سندھ میں حضرت سید جلال بخاریؒ کے فیضان تعلیم سے معرفت حق کی روشنی پھیلی اور ان کی اولاد میں سے حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پنجاب کے بیسیوں قبائل کو مسلمان کیا۔ ایک اور بزرگ حضرت سید صدر الدین اور ان کے صاحبزادے حضرت حسن کبیر الدینؒ بھی پنجاب کے بہت بڑے اسلامی مبلغ تھے۔ حضرت حسن کبیر الدینؒ کے متعلق تواریخ میں لکھا ہے کہ ان کی شخصیت میں عجیب کشش تھی جسے انہیں دیکھ لینے سے دل پر اسلام کی عظمت و صداقت کا نقش مرتسم

ہو جاتا تھا اور لوگ خود بخود ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے ۔

سندھ میں اشاعت اسلام کا اصلی زمانہ وہ ہے جب حکومت کا دور ختم ہو چکا تھا ۔ آج سے تقریباً چھ سو برس پہلے حضرت سید یوسف الدینؒ وہاں تشریف لائے اور ان کے فیض اثر سے لوہانہ ذات کے سات سو خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ کچھ اور گجرات میں حضرت امام شاہ پیرانویؒ اور ملک عبد اللطیفؒ کی مساعی سے اسلام کی اشاعت ہوئی ۔ بنگال میں سب سے پہلے شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس مقدس فرض کو انجام دیا جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدان خاص میں سے تھے آسام میں اس نعمت عظمیٰ کو حضرت شیخ جلال الدینؒ فارسی اپنے ساتھ لے گئے جو سلہٹ میں مدفون ہیں ۔ کشمیر میں اسلام کا علم سب سے پہلے بلبل شاہؒ نامی ایک درویش نے بلند کیا اور ان کے فیض صحبت سے خود راجہ مسلمان ہو گیا جو تاریخوں میں صدرالدین کے نام سے مشہور ہے ۔ پھر ساتویں صدی ہجری میں سید علی ہمدانیؒ سات سو سیدوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور تمام خطہ کشمیر میں اس مقدس جماعت نے نور عرفان کو پھیلایا حضرت عالمگیرؒ کے عہد میں سید شاہ فرید الدینؒ نے کشتواڑ کے راجہ کو مسلمان کیا اور اس کے ذریعہ علاقہ مذکور میں اسلام کی اشاعت ہوئی ۔ دکن میں اسلام کی ابتدا پیر مہابیر کھدایت سے ہوئی جو آج سے سات سو برس پہلے بیجاپور تشریف لائے تھے ایک اور بزرگ جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے علاقہ کوکن کے ہادی اور رہبر تھے دھارواڑ کے لوگ اپنے اسلام کو حضرت شیخ ہاشم گجراتیؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ابراہیم عادل شاہ کے پیر طریقت تھے ۔ ناسک میں حضرت محمد صادق سرمست اور

خواجہ اخوند میر حسینیؒ کی برکاتِ روحانی کا اب تک اعتراف کیا جاتا ہے ۔
مدراس بھی اپنی ہدایت کے لئے چند صاحب حال بزرگوں کا رہین منت ہے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور سید نثار شاہ مدفون ترچناپلیؒ ہیں دوسرے بزرگ سید ابراہیم شہید ہیں جن کا مزار اردادی میں ہے اور تیسرے بزرگ شاہ الحامدؒ ہیں جن کا مدفن ناگور میں واقع ہے **نیوگنڈا** کی طرف اسلامی آبادی عام طور پر اپنے اسلام کو حضرت بابا فخر الدینؒ کی طرف منسوب کرتی ہے جنہوں نے وہاں کے راجہ کو مسلمان کیا تھا۔

حضرات صوفیائے کرام کی انہی تبلیغی سرگرمیوں کا اثر آج تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت اگرچہ مسلمان نہ ہو سکی مگر اب تک اسلامی پیشواؤں کی گرویدہ ہے چنانچہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں صوبہ شمال مغربی (موجودہ صوبۂ متحدہ) کے ۲۳۲۳۶۴۳ ہندوؤں نے اپنے آپ کو کسی خاص دیوتا کا پرستار بتلانے کی بجائے کسی نہ کسی مسلمان پیر کا پجاری ظاہر کیا ہے افسوس کہ وہ لوگ ہندوؤں کی ایک کثیر آبادی پر اسلام کا غیر معمولی اثر چھوڑ گئے مگر آج ہم اس اثر سے بھی فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔

ہندوستان سے باہر

ہندوستان سے باہر بعض دوسرے ممالک میں بھی اس مقدس جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں نے حیرت انگیز نتائج پیدا کئے ہیں خصوصیت کے ساتھ قرون متوسط کی تاریخ میں تو یہ واقعہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب فتنۂ تاتار نے اسلامی حکومت کے قصر فلک بوس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو تمام وسط ایشیا میں صرف ایک صوفیائے اسلام کی روحانی قوت تھی جو اس

صرف ایک صوفیائے اسلام کی روحانی قوت تھی جو اس کے مقابلے کے لئے باقی رہ گئی تھی اور بالآخر اسی نے اسلام کے اس سب سے بڑے دشمن پر فتح حاصل کی لیکن مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ زبردست قوت بھی جس نے اقطاع عالم میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور تاتار کے زبردست فتنے تک کو اس کے لئے مسخر کر دیا جو قریب تھا کہ وسط ایشیا سے اس کو بالکل فنا کر دیتا، آج بالکل مضمحل ہو گئی ہے اور اگر ہمارے محترم حضرات متصوفین ہمیں معاف کریں تو ہمیں اس امر واقعی کے اظہار میں بھی کچھ تامل نہیں ہے کہ اب وہ اسلام کی برکات و فیوض سے دنیا کو معمور کرنے کے بجائے بہت حد تک خود ہی غیر اسلامی مفاسد سے مغلوب ہو کر رہ گئی ہے۔

افریقہ میں

موجودہ عہد میں یہ قوت صرف افریقہ میں زندہ ہے اور تبلیغ دین الٰہی کے سلسلے میں اس کی عظیم الشان کامیابیاں ہمارے ملک کے صوفیائے کرام کیلئے سرمایہ عبرت و بصیرت ہیں۔

ان صوفی جماعتوں میں ایک "**جماعت امیرغنیۃ**" ہے جس کے بانی محمد عثمان الامیر غنی نے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۳ء تک مشرقی سوڈان کے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی اور اطراف میں بیسیوں بت پرست قبائل کو مسلمان کر لیا

دوسری **جماعت قادریہ** ہے مغربی افریقہ میں اس سلسلے کے لوگ نویں صدی ہجری سے موجود ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ان کے اندر بھی ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور انہوں نے مغربی سوڈان سے لے کر ٹمبکٹو اور

سینگال تک اپنے حلقے قائم کر لئے خصوصیت کے ساتھ نانگا، ٹیمبو اور مسارد و میں انہوں نے بہت بڑے حلقے قائم کر لئے اور نہایت کثرت سے بت پرست قبائل میں اسلام کی اشاعت شروع کر دی ان کا اصول یہ ہے کہ جب کسی آبادی میں اسلام کی اشاعت کر چکتے ہیں تو وہاں کے ذہین اور صاحب استعداد لڑکوں کو اپنے مرکزی حلقوں میں تعلیم کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ یا اگر ان میں زیادہ صلاحیت دیکھتے ہیں تو علوم دینی کی تکمیل کے لئے قیروان، فاس طرابلس یا الازہر (مصر) بھیج دیتے ہیں اور پھر واپسی پر انہی کو اپنی بستیوں میں تبلیغ و تعلیم کے لئے مقرر کر دیتے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے نہایت کثرت سے اندرون افریقہ میں مدارس قائم کر رکھے ہیں اور ان میں صحیح اصولوں پر وحشی قبائل کے لڑکوں کی تربیت کرتے ہیں۔

ایک اور سلسلہ "تیجانیہ" کے نام سے مشہور ہے جو سب سے پہلے الجزائر میں قائم کیا گیا تھا اس کے اصول تبلیغ تقریباً وہی ہیں جو سلسلہ قادریہ کے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ تبلیغ کے ساتھ جہاد بھی کرتا ہے اور اس لئے عیسائی مشنریوں کو اس کے خلاف یورپی استعمار سے مدد حاصل کرنے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے اس کا حلقہ اثر شمالی افریقہ کا مغربی حصہ ہے اور اس کا سب سے زیادہ سرگرم داعی الحاج عمر تھا جو اپنے زہد و تقویٰ کے لئے افریقہ سے حجاز تک شہرت رکھتا تھا۔ اس نے ۱۸۳۳ء میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور بالائی نائجیریا اور سینگال تک کے بت پرست قبائل کو مسلمان کر کے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی، جسے آخر میں فرانسیسی استعمار نے پیوند خاک کر دیا۔

ان تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ زبردست **سنوسی جماعت** ہے ۱۸۳۳ء میں الجزائر کے ایک مشہور عالم سیدی محمد بن علی السنوسی نے طریقۂ سنوسیہ کی ابتدا کی، جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح، فرنگی استعمار کی مدافعت اور اسلام کی اشاعت تھا۔ بائیس سال کے عرصے میں انہوں نے ایک ایسی زبردست جماعت تیار کر لی جس کا نظام سلطنتوں کے نظام سے زیادہ مکمل تھا۔ جس کا ہر شخص جماعتی مقاصد کی لگن میں ڈوبا ہوا تھا اور جس کے ہر رکن کو خالص اسلامی تربیت دے کر سچا مسلمان بنا دیا گیا تھا۔ اس میں قرآن مجید کے لفظ لفظ پر عمل کرنا پہلی شرط ہے۔ اولیاء کی پرستش، مزارات کی زیارت، کافی اور تمباکو کا استعمال، یہودیوں اور عیسائیوں سے تعلقات سب ممنوع ہیں اور ہر شخص ایک سچے مجاہد کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ مصر سے لے کر مراکش تک اور ساحلِ طرابلس سے لے کر صحرائے افریقہ کے آخری کونوں تک اس کی خانقاہیں قائم ہیں اور افریقہ کے علاوہ عرب، عراق اور جزائر ملایا تک اس کا اثر پھیلا ہوا ہے اس کی تبلیغی کوششوں نے افریقہ کے ان تمام قبائل کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دیا ہے جو صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے اور گالا، ٹبسٹی اور بورکو کے علاقوں تک اسلام کی ایک نئی روح پھونک دی ہے قادریہ سلسلہ کے لوگوں کی طرح، ان کے ہاں بھی صرفِ واعظ و تلقین نہیں ہے بلکہ یہ مسلمان بنانے کے بعد نومسلموں کو عملی تربیت بھی دیتے ہیں تا کہ وہ خود اپنے ہم جنسوں کو اسلام کی دعوت دے سکیں۔

ان افریقی جماعتوں نے وحشی قبائل میں جو عجیب زندگی پیدا کر دی ہے اس کے متعلق ایک یورپی سیاح لکھتا ہے کہ:۔

"دریائے نائیجیریا کے کنارے کنارے جب میں وسط افریقہ کی طرف روانہ ہوا تو پہلے دو سو میل تک مجھے اپنے خیالات کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہوئی جو میں افریقی وحشت و بربریت اور مردم خوری کے متعلق رکھتا تھا مگر جب میں وسط سوڈان کے قریب پہنچ گیا تو مجھے قبائل کی زندگی میں ایسے ترقی پذیر آثار نظر آنے لگے جنہیں دیکھ کر میری رائے بدلنے لگی میں نے دیکھا کہ وہاں مردم خوری کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بت پرستی کا خاتمہ ہو چکا ہے شراب خوری وغیرہ کی عادات زائل ہو چکی ہیں تمام قبائل کپڑے پہنتے ہیں۔ اور لباس میں نفاست، پاکیزگی اور معاشرت میں تہذیب موجود ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اخلاقی درجہ اپنے ہم جنس قبائل سے بہت بالاتر ہے۔ ہر چیز ترقی کرتی نظر آرہی ہے حبشی فطرت کسی بلند تر فطرت سے بدل رہی ہے اور یہ سب کچھ اسلام کے طفیل ہے۔ "لوکوجا" سے گزرنے کے بعد میں اسلامی تبلیغ کے اصلی مرکز میں پہنچا اور وہاں میں نے ایک اعلیٰ درجہ کی منتظم حکومت کو کار فرما پایا۔ ہر طرف آبادی میں تمدن کے آثار موجود تھے تجارت اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک مہذب ملک میں ہوں۔"

اشاعتِ اسلام افریقہ میں

ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ مسلمانوں میں کبھی باقاعدہ مشنری سوسائٹیوں کا وجود نہیں رہا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہب نے خدمتِ دین کو کسی خاص طبقے تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر مسلمان پر یکساں فرض کیا ہے کہ وہ بشرطِ امکان اپنی تمام قوتیں دین کی خدمت میں صرف کر دیں جس طرح عیسائیوں میں ایک خاص جماعت کے سوا نہ کوئی جماعت مذہبی امور میں حصہ لیتی ہے اور نہ مذہبی شغف رکھتی ہے اس طرح اگر مسلمانوں میں بھی کوئی مذہبی طبقہ قائم کر دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ ان میں بھی اپنے مذہب کی اشاعت کا ذوق صرف ایک مختصر سی جماعت تک محدود رہتا اور عام مسلمان اس سے بے بہرہ رہتے۔

لیکن اس جمہوری مذہب کے لئے جو فضیلت کا معیار صرف اعمالِ حسنہ کو قرار دیتا ہے، یہ بہت مشکل تھا کہ وہ برکت و سعادت میں بھی یہی تعمیم (عمومیت) نہ برتتا۔ چنانچہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیروؤں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا ذوق سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور جس کا ہر فرد ایک مبلغ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم گذشتہ صفحات میں اس ذوقِ تبلیغ کی جہانگیری و عمومیت پر بحث کر چکے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی جائے کہ اس ذوقِ عمیم نے کس طرح ملکوں کو فتح کیا ہے اور وہ کون لوگ تھے جن کے ہاتھوں اسلام کو اس قدر عالمگیر وسعت حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان[1]، ایران، اور عرب و مصر وغیرہ ممالک کو جانے دیجئے کہ یہاں مسلمانوں کو حکومت بھی حاصل ہوئی ہے۔ اور اس لئے مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ ان ممالک میں اشاعت اسلام تلوار کی رہینِ منت ہو۔ ہمیں افریقہ، چین اور جزائر ملایا کو لینا چاہیئے جہاں تمام مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کو کبھی تلوار استعمال کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور اس سے زیادہ ممالک تاتار و ترکستان کو لینا چاہیئے۔ جہاں تاریخ کا صریح فتویٰ یہ ہے کہ غیر مسلح اسلام نے مسلح کفر کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی ہے۔ ان مثالوں سے ہم قارئین کرام کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مذہبی شغف رکھنے والے مسلمانوں نے اس دینِ مقدس کی کس طرح خدمت کی۔ اور اگر ہم بھی اسی طرح مذہبی جذبے سے متحرک ہو جائیں تو کس طرح تبلیغ و حفاظتِ اسلام کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں جن کے لئے کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے افریقہ سے بحث کریں گے۔

افریقہ میں آفتابِ اسلام کا طلوع۔

مغربی سوڈان میں اسلام کی اشاعت سب سے پہلے ان نو مسلم بربروں نے کی جو تجارت کے سلسلے میں وہاں آتے جاتے تھے ان بربری قبائل میں لمطونہ اور جدالہ نامی دو قبیلوں نے یوسف بن تاشفین کے عہد میں تقریباً تمام مغربی سوڈان کو اسلام کی روشنیوں سے

[1] برصغیر پاک و ہند

منور کر دیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں انہی بربری تاجروں نے گھانا (GHANA) کی حبشی ریاست کو مسلمان کر لیا۔ اور اس کے بعد سوڈان کی قدیم ترین ریاست سونغائی بھی ان کے ہاتھوں مسلمان ہو گئی۔ چھٹی صدی ہجری میں ان کے اثرات دُور دُور تک پہنچ گئے۔ اور اس کے بعد ٹمبکٹو کا مشہور تجارتی شہر اشاعت اسلام کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ حبشی لوگ تجارت کے سلسلے میں یہاں آتے تھے اور بربری تاجروں سے اسلام کی متاعِ گراں بہا لے کر تمام سوڈان اور نائیجیریا میں پھیل جاتے تھے۔ ان لوگوں میں مذہبی شغف اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ ابن بطوطہ جب وہاں پہنچا تو اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"یہ لوگ قرآن کے عاشق ہیں اور نماز کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ جمعہ کے دن اگر سویرے سے جا کر مسجد میں نہ بیٹھ جاؤ تو جگہ ملنی محال ہو جاتی ہے"

ان نومسلم قوموں میں اسلام کی سب سے زیادہ سرگرم مبلّغ ماندِنگو قوم تھی جو تمام افریقہ میں اپنی عادات وخصائل کے اعتبار سے نہایت ممتاز قوم ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہاؤسا قوم نے اسی کی کوششوں سے اسلام قبول کیا اور ہاؤسا قوم وہ ہے جو وسطی بالائی افریقہ میں نہایت ذہین، مستعد اور تجارتی قوم شمار ہوتی ہے۔ تقریباً تمام سوڈان اور نائیجیریا کی تجارت پر قابض ہے اور گیانا سے لے کر قاہرہ تک اس کے تجارتی کاروان آتے جاتے ہیں۔ اشاعتِ اسلام کے لئے اس تجارتی قوم کی زبردست کوششوں کا ذکر آگے آتا ہے۔

مشرقی سوڈان میں اسلام کی اشاعت مصری تاجروں نے کی اور خصوصیت کے ساتھ جب مصر کی فاطمی خلافت کا خاتمہ ہوا تو بہت سے عرب بھاگ کر سوڈان کے علاقے میں پہنچ گئے اور انہوں نے اس علاقے میں دُور دُور اسلام کو پھیلا دیا۔ اس علاقہ میں تونس اور طنجہ کے عرب تاجروں نے بھی اس فریضہ مقدسہ کو انجام دیا ہے اور خصوصاً

جنوب مغربی سوڈان اس سعادتِ عظمیٰ کے لئے انہی کا منت کش احسان ہے بعد میں احمد نامی ایک عرب نے "دارفور" میں اسلامی حکومت بھی قائم کر دی جسے کئی سو برس بعد محمد علی پاشا نے اپنی حکومت میں جذب کر لیا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں ۔۔۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں بالائی افریقہ کے مسلمانوں میں ایک نئی تبلیغی روح پیدا ہوئی جس کی ابتدا شیخ عثمان وا نفودیو سے ہوتی ہے اس شخص نے عبدالوہاب نجدی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مردہ سنت میں دوبارہ جان ڈال دی خصوصیت کے ساتھ فلبی قوم میں اس نے کچھ ایسا اسلامی جوش بھر دیا کہ وہ اسلام کی خدمت کے لئے سربکف کھڑی ہو گئی۔ اور گوبر کی قدیم ریاست میں بت پرستی کا خاتمہ کر کے تمام ہاؤسا لینڈ کو کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک کر دیا سنہ ۱۸۱۶ء میں جب عثمان وا نفودیو کا انتقال ہوا تو وہ ممالک سکاہا کا کامل خود مختار بادشاہ تھا اور اس کی وسیع قلمرو میں کہیں بت پرستی کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں انگریزوں نے اس اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا مگر ہاؤسا اور فلبی قوموں کے ذوق تبلیغ پر اس محکومی کا کوئی اثر نہیں پڑا چنانچہ اسی بیسویں صدی میں انہوں نے یوروبا کے بت پرست علاقہ کو اسلام سے روشناس کرایا ہے۔ اور دریائے نائجر کے جنوب تک دین مبین کی اشاعت کی ہے۔ اجیبو کے علاقہ میں پہلی مرتبہ انہوں نے سنہ ۱۸۹۴ء میں اپنا کام شروع کیا۔ اور چند ہی سال میں اس قدر ترقی کی کہ سنہ ۱۹۰۲ء میں وہاں کے ایک شہر میں بیس اور دوسرے میں بارہ مسجدیں بن گئیں۔ اسی طرح دریائے نائجر کے جنوب میں وہ سنہ ۱۸۹۸ء کے بعد اسلام کا پیغام لے کر گئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ کیفیت ہو گئی کہ اس علاقے میں مشکل ہی سے کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو گا جس نے اس صدائے حق پر لبیک نہ کہی ہو۔

افریقہ کا مغربی ساحل مسلمانوں کا ایک اور تبلیغی میدان ہے۔ گیانا، سیرالیون لائبیریا اور منڈی[1] وغیرہ ساحلی علاقوں میں آج سے کوئی سوا سو برس پہلے مسلمان تاجروں اور دیگر کاروباری آدمیوں نے تبلیغ اسلام کی ابتداء کی اور تھوڑی ہی مدت میں وہاں کی وحشت کو تہذیب و تمدن سے بدل دیا اور سنہ ۱۸۰۲ء میں سیرالیون کی ایک انگریزی کمپنی نے دارالعوام میں ایک درخواست پیش کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ:۔

> "یہاں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر آج سے ستر برس پہلے چند مسلمان تاجر آکر مقیم ہوئے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح یہاں بھی انہوں نے مدرسے قائم کرکے اسلامی تعلیم دینی شروع کر دی اور اس بات کا عہد کر لیا کہ جو شخص اسلام قبول کرے گا۔ اسے غلام بنا کر نہیں بیچا جائے گا۔ تھوڑے عرصے میں یہاں تہذیب اور تمدن کے اثرات رونما ہونے لگے۔ آبادی بڑھ گئی۔ خوشحالی نے ترقی کی اور رفتہ رفتہ اس علاقے میں اسلام کا اثر سب پر غالب آگیا۔ لوگ فوج در فوج مسلمانوں کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب سارا علاقہ مسلمان ہو جائے گا"۔

سیرالیون ہی کے لوگوں میں جو تبلیغ اسلام ہوئی اس کے متعلق ڈاکٹر ڈیلر کہتا ہے کہ:۔

> "ان لوگوں کے ہاں کوئی خاص جماعت تبلیغ دین کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کا ہر فرد مبلغ ہے۔ جہاں کہیں پانچ چھ مسلمان جمع ہو جاتے ہیں وہاں ایک مسجد بن جاتی ہے۔ اور وہ چھوٹی سی عمارت ہی اس بستی میں اشاعت اسلام کا مرکز ہوتی ہے۔ ان کے اصول بھی نہایت سادہ ہیں۔ ہر شخص جو کلمہ پڑھ کر نماز پڑھنے اور شراب سے پرہیز کرنے کا اقرار کر لیتا ہے وہ ان کی عالمگیر برادری کا ایک رکن بن جاتا ہے۔"

---

[1] Mendi سیرالیون سے تقریباً ایک میل جنوب میں ایک علاقہ۔

گیانا میں اسلام کے سرگرم مبلغ ہاؤسا قوم کے تاجر ہیں۔ ان کی دلکش معاشرت اور امتیازی نشان وحشی قبائل کو ان کے گرد کھینچ لاتی ہے۔ اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ انہیں اپنے مذہب میں داخل کر لیتے ہیں۔ داہومی اور اشانتی میں ان قوموں نے ابھی چند ہی سال سے کام شروع کیا ہے۔ اور اس لئے تمام مغربی افریقہ یہی دو علاقے ایسے ہیں جہاں ابھی تک تھوڑا بہت کفر بت پرستی کا نام و نشان باقی ہے۔ لاگوس میں مسلمانوں کا بڑا زور ہے۔ ان کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار تک پہنچ چکی ہے جن میں فلبی، ہاؤسا اور مانڈنگو تینوں قوموں کے لوگ موجود ہیں۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ان لوگوں کو دور دور تک جانا پڑتا ہے۔ اور اس لئے ان کی بدولت تمام ساحل نائجیریا اور گولڈ کوسٹ نور اسلام سے منور ہو رہا ہے سینیگال کے دہانہ سے لاگوس تک دو ہزار میل کے ساحل پر تقریباً ایک بستی بھی ایسی نہیں جہاں کم از کم ایک مسجد اور ایک مولوی موجود نہ ہو ہر مسلمان خواہ وہ تاجر ہو یا انگلستان و فرانس و بلجیم کا ملازم، اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ جس کافر و بت پرست سے ملتا ہے اس تک قرآن کی تعلیم پہنچا دیتا ہے۔ اس زبردست ذوقِ تبلیغ نے عیسائی مشنریوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

مشرقی افریقہ بھی عربی تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہوا۔ بیسویں صدی تک ان لوگوں نے تمام سواحل زنج کو اسلام سے روشناس کر دیا تھا اور جگہ جگہ اسلامی بستیاں قائم ہو گئی تھیں۔ مگر اصل تبلیغی کام اس وقت شروع ہوا جب جرمنی، انگلستان اور اٹلی وغیرہ نے ان ممالک میں نو آبادیاں قائم کیں اور اندرون ملک تک پہنچنے کے ذرائع مکمل کر لئے۔ اس وقت نظام حکومت قائم کرنے کے لئے ان سلطنتوں کو مسلمانوں کے سوا اور کوئی جماعت نہیں مل سکتی تھی چنانچہ فوج، پولیس، عدالت، تعلیمات، مالگذاری، غرض ہر محکمہ میں مسلمان بھرتی کئے گئے اور انہوں نے اندرون

افریقہ میں پہنچ کر سب سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ جو خدمت انجام دی وہ اسلام کی اشاعت تھی۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں انہوں نے بوندی اور وادیگو قبائل کو تقریباً بالکل مسلمان کر لیا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد وہ مغرب میں ٹانگانیکا تک اور شمال میں اوسمبارا تک اور جنوب میں نیاسا تک قرآنی تعلیمات لے کر پھیل گئے۔ ۱۸۹۱ء میں اوسمبارا میں ایک مسلمان نہیں تھا۔ بلکہ ان سے نفرت کی جاتی تھی۔ مگر جب باقاعدہ حکومت قائم ہوئی اور مسلمان افسر وہاں پہنچے تو تھوڑے ہی عرصے میں تقریباً تمام وہ لوگ مسلمان ہو گئے جو سرکاری افسروں سے کوئی واسطہ رکھتے تھے۔ اور اکثر ان مدارس میں اسلام پھیل گیا جہاں مسلمان مدرس مامور تھے۔ اسی طرح نیاسا لینڈ میں بھی دس سال کے اندر اندر اسلام نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور مسیحی مبلغین معترف ہیں کہ ان ممالک میں مسلمان بن جانا انسان بن جانے کا ہم معنی ہے۔

کیپ کالونی میں اسلام کی اشاعت جزائر ملایا کے تاجروں نے کی ہے یہ لوگ حکومتِ ہالینڈ کے زیر اثر ہونے کے باعث عرصے سے یہاں مقیم ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے دین کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں کولبروک نے لکھا تھا کہ:۔

> "ہمارے مبلغین کی انتہائی کوششوں کے باوجود مسلمان مُبلّغ نہایت کثرت کے ساتھ سیاہ رنگ غلاموں اور آزاد لوگوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں ہمارے مشنری کافی وقت اور کثیر روپیہ صرف کر کے بھی بمشکل چند آدمیوں کو عیسائی کرتے ہیں۔ مگر مسلمان مُبلّغ بغیر کسی دِقّت کے جمِ غفیر اکٹھا کرتے جا رہے ہیں۔"

گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے بیرونی مسلمان بھی یہاں پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے تبلیغی کام میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اس وقت خصوصیت کے ساتھ کلیراماونٹ میں تبلیغ کا سب سے زیادہ زور ہے اور یتیم و لاوارث بچے نہایت کثرت کیساتھ مسلمان ہو رہے ہیں

اشاعتِ اسلام چین میں

افریقہ کے بعد مسلمانوں کی تبلیغی فتوحات کا دوسرا میدان مشرقِ اقصیٰ ہے۔ یہاں بھی محض تاجروں، سپاہیوں اور عام کاروباری مسلمانوں نے محض اپنے طبعی ذوق اور اسلامی جوش کی بنا پر اسلام کی اشاعت کی اور باوجودیکہ انہیں دولت و حکومت کی کبھی تائید حاصل نہ ہو سکی بلکہ اکثر حالات میں دشمنوں کی تلوار کا مظلومانہ مقابلہ کرنا پڑا لیکن پھر بھی انہیں اپنے دین کی اشاعت میں اس قدر زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ اس وقت چین و جزائر ملایا میں ان کی مجموعی آبادی کسی طرح آٹھ نو کروڑ سے کم نہیں ہے۔

چین میں اسلام کی ابتداء دولتِ بنو اُمیّہ کے عہد سے ہوتی ہے۔ اگرچہ خلفائے راشدین ہی کے مبارک زمانے میں وہ عرب تاجر، جن کی بحری ترکتازیوں نے بحرِ عرب سے لے کر بحرالکاہل تک تمام سمندروں کو چھان مارا تھا۔ سواحلِ چین پر اسلام کو لے کر پھیل گئے تھے لیکن زرد قوم سے اسلام کا باقاعدہ تعارف اس وقت ہوا جب دولتِ بنو اُمیّہ کے عہد میں چینیوں سے سفارتی تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ بعد میں جب بادشاہ سُوان سونگ کو ایک غاصب نے تخت سے محروم کر دیا تو اس کے بیٹے نے خلیفہ منصور عباسی سے مدد طلب کی اور اس نے چار ہزار سپاہی اس کی مدد کو بھیج دیئے جن کی قوتِ بازو کے طفیل اس نے دوبارہ تاج و تخت حاصل کیا۔ یہ سپاہی اسلام

کے اصلی مبلغ تھے۔ انہوں نے وطن واپس آنے کے بجائے چین ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ یہیں شادی بیاہ کیئے اور عام چینی آبادی میں تبلیغ اسلام کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ چند صدیوں کے اندر کینٹن کا سارا علاقہ اسلام کی روشنی سے معمور ہو گیا۔

اشاعتِ اسلام —— منزل بہ منزل

اس واقعے کے چھ سو برس بعد پھر ایک مرتبہ چین میں باہر سے اسلامی عناصر داخل ہوئے اور وہ تمام ملک میں پھیل گئے یہ عرب، ایرانی اور ترکی مہاجرین تھے جو ساتویں صدی ہجری میں منگولی سیلاب سے بہہ کر یہاں چلے آتے تھے ان لوگوں کی وجہ سے سو ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر چین کے اکثر اطراف میں اسلام کی اشاعت ہو گئی اور خصوصیت کے ساتھ شمالی اور مغربی چین میں پورے کے پورے علاقے مسلمان ہو گئے تیرھویں صدی عیسوی میں مارکوپولو کا بیان ہے کہ یُنّان کا صوبہ بڑی حد تک مسلمان ہو چکا ہے۔ چودھویں صدی کا ایک اور مورخ لکھتا ہے کہ تالیفو کی پوری آبادی مسلمان ہے جنوبی چین کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ تمام شہروں میں پورے کے پورے محلے مسلمانوں کے موجود ہیں۔ جو اپنی پاکیزگی اور تہذیب کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہیں مسلمان چینی عورتوں سے شادیاں کرتے اور عام چینیوں سے نہایت عمیق تعلقات رکھتے ہیں اور اس کی بدولت اسلام بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ پندرھویں صدی میں ایک مسلمان تاجر علی اکبر لکھتا ہے۔ کہ پیکنگ میں تقریباً تیس ہزار مسلمان خاندان آباد ہیں۔ سترھویں صدی کی ابتدا میں چینی یہودیوں کی ایک بہت بڑی جماعت مسلمان ہو گئی۔ اٹھارویں صدی میں کین لنگ نے زنگاریہ کی بغاوت فرو کر کے دس ہزار خاندانوں کو وہاں لے جا کر آباد کیا جو آس پاس کی اسلامی آبادی سے متاثر ہو کر سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ شیان تنگ میں ایک قحط کے موقعے پر مسلمانوں نے دس ہزار چینی بچوں کو پناہ دی اور ان سب

کو مسلمان کر لیا۔ ایک اور قحط کے موقعے پر کوان تُنگ میں مسلمانوں کو تقریباً دس ہزار چینی بچے مل گئے جنہیں اسلامی تربیت دے کر پالا گیا اس طرح کے غیر معمولی مواقع کے علاوہ عام حالات میں بھی مسلمان اس کثرت سے اسلام کی اشاعت کرتے ہیں کہ ایک چینی مسلمان سید سلیمان کے بقول ہر سال اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کا احصاء کرنا بہت مشکل ہے۔

موجودہ عہد میں[1] بھی چینی مسلمانوں کے اندر تبلیغِ اسلام کا خاص ذوق موجود ہے تاجروں اور صناعوں کے علاوہ حکومت کے مسلمان ملازم بھی عمومیت کے ساتھ اُن حلقوں میں دینِ مبین کی تبلیغ کرتے ہیں جن سے انہیں میل جول کا موقعہ ملتا ہے۔ اور چینی فوج کے مسلمان افسر اور سپاہی بھی اس فرض سے غافل نہیں ہیں کچھ عرصے سے چینی مسلمانوں نے اپنی پوزیشن کو محسوس کر کے تبلیغ اسلام کی اہمیت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے چنانچہ پہلے کانسو میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا گیا تھا اور اب تقریباً دس صوبوں میں ایسے ہی مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اگر چین میں باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کا شمار کیا جائے تو شاید ان کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز نہ ہو مگر صرف یہی عالمگیر ذوقِ تبلیغ ہے جس نے انہیں پانچ کروڑ کی عظیم الشان تعداد تک پہنچا دیا ہے اور جس کی بدولت ایک روسی مبصر یہ دیکھ کر کانپ اٹھا ہے کہ اگر اشاعتِ اسلام کی رفتار کا یہی حال رہا تو کچھ عجب نہیں کہ ایک وقت میں مسلمان سیاستِ مشرقِ اقصیٰ کا نقشہ بالکل بدل دیں گے۔[2]

---

[2] اشتراکیت کے سیلاب کے بعد چین میں اہلِ اسلام پر جو مصیبت گزری ہے اس کا واضح اندازہ اس زمانے کے اور موجودہ زمانے کے حالات کا مقابلہ کرنے سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے اشتراکی انقلاب کے وقت وہاں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے زائد تھی لیکن ۱۹۶۲ء کی سرکاری مردم شماری کے مطابق یہ تعداد کم ہو کر صرف ایک کروڑ رہ گئی ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ

[1] مراد ہے ۱۹۳۵ء کے زمانے میں

اشاعتِ اسلام جزائر ملایا میں

جزائر ملایا[1] میں اسلام کے مبلغ وہ عربی اور ہندی تاجر تھے جو بحری استعمار کے میدان میں پرتگال کے قدم رکھنے سے پہلے تمام چین اور جزائر شرق الہند کی تجارت پر قابض تھے۔ وہ اسپینیوں اور پرتگالیوں کی طرح فاتح بن کر نہیں آئے تھے اور نہ تلوار کی مدد سے اپنے مذہب کی اشاعت کرنا چاہتے تھے ان کے پاس ایسی بھی کوئی قوت نہ تھی جس سے وہ بالاتر قوت بن کر رہتے۔ وہ صرف ایک ایمان کی قوت رکھتے تھے۔ ایک حق و صداقت کی متاع لے کر آتے تھے۔ انہی ہتھیاروں سے انہوں نے تمام جزائر ملایا کو فتح کیا۔ انہی کے بل پر انہوں نے حکومتوں کو تسخیر کیا اور انہی کی قوت سے انہیں یہ فروغ حاصل ہوا کہ چھ سو برس کے اندر مجمع الجزائر کی پانچ کروڑ آبادی میں سے چار کروڑ کے قریب مسلمان ہو گئی قدیم بت پرستانہ توہمات نے انہیں قدم قدم پر روکا۔ ہسپانیہ اور پرتگال کی استعماری

---

[1] مراد ہیں جزائر شرق الہند، جو اب انڈونیشیا اور ملیشیا کہتے ہیں انڈونیشیا کی فیڈریشن میں جاوا، سماٹرا، بورنیو کا کالی منتن، سلیبس (سیلا ویسی) مغربی نیوگنی (ویسٹ ایریان) اور ہزاروں چھوٹے چھوٹے جزیرے شامل ہیں، اور فیڈریشن آف ملیشیا، ملایا کی گیارہ ریاستوں اور برطانوی شمالی بورنیو (صباح) اور ساراوک پر مشتمل ہے۔

ہوسناکی بار باران پر تلوار سونت کر کھڑی ہوگئی اور ہالینڈ[1] کی مسیحی قوت نے ان کی ہمت شکنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر کوئی چیز ان کے جذبہ خدمت دین پر غالب نہ آسکی اور انہوں نے اپنی ذہانت، مستعدی، استقلال اور دولت کو اپنی شان و شوکت بڑھانے کی بجائے اپنے مذہب کی قوت بڑھانے میں صرف کردیا۔ ان کی کوششوں سے گذشتہ چھ صدیوں کے اندر جزائر ملایا کی جس طرح اسلام کی اشاعت ہوئی ہے اس کی داستان نہایت سبق آموز ہے۔

سماٹرا

سماٹرا میں اسلام کی ابتدا اتجہ سے ہوئی جہاں ایک بزرگ عبداللہ عارف نے سب سے پہلے صدائے حق بلند کی اور اس کے بعد ان کے مرید برہان الدین نے پریامان تک تمام مغربی ساحل کو اسلام سے روشناس کرادیا ۱۲۰۵ء میں پوری ریاست اتجہ نے اسلام قبول کرلیا اور خود راجہ بھی مسلمان ہو گیا جس کو "جہاں شاہ" کا لقب دیا گیا۔ یہاں سے سواحل کی تجارتی کشتیوں پر اسلام شمالی سماٹرا میں پہنچا۔ پرلاک اور پسوری میں مسلمانوں کی تجارتی نوآبادیاں قائم ہوئی۔ چودھویں صدی عیسوی میں مکہ کے چند علما شیخ اسماعیل کی سرکردگی میں سماٹرا پہنچے اور انہوں نے لمبری سے آروتک تمام ساحلی علاقے کو نور اسلام سے منور کیا آخر سمندرا کا راجہ مسلمان ہوگیا جس کو "الملک الصالح" کا لقب دیا گیا، اور اس کی کوششوں سے پرلاک کی ریاست بھی مسلمان ہوگئی۔ ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران میں جب یہاں پہنچا تو "الملک الصالح"

---

[1] ملیشیا یکم فروری ۱۹۴۸ء کو برطانوی تسلط سے آزاد ہوا اور انڈونیشیا کو ہالینڈ کی طویل غلامی سے نجات ۱۷ اگست ۱۹۵۰ء کو حاصل ہوئی۔

کا بیٹا "الملک الظاہر" حکمران تھا اور سلطان محمد تغلق سے اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے۔

پالمبانگ میں ہندو مذہب کا سب سے قوی تھا، پندرھویں صدی کے وسط میں راڈن رحمت نے جو جاوا کا سب سے بڑا اسلامی مبلغ تھا، یہاں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے بعد بھی اسلام کا اثر پھیلتا رہا مگر اس علاقے کو صحیح معنوں میں اسلام کی نعمت اس وقت میسر ہوئی ہے جب یہاں ہالینڈ کی حکومت قائم ہونے کے بعد مسلمانوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں انتھک کوششیں شروع کی ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا سے یہاں کی بت پرست آبادی نہایت کثرت کے ساتھ اسلام قبول کر رہی ہے۔

جنوبی سماٹرا میں اسلام کی اشاعت سب سے آخر میں ہوئی۔ یہاں اسلام کا پہلا داعی ایک جاوی سردار منک کمالا لومی تھا جس نے بنٹام میں اسلام قبول کیا، مکہ جا کر علوم اسلامیہ کی تحصیل کی اور لمپانگ میں نہایت کثرت سے بت پرست قبائل کو مسلمان کیا۔ اب تمام جزیرہ سماٹرا میں صرف ایک بٹک ایسا مقام رہ گیا ہے جہاں قدیم بت پرستی کا اثر ہے اس علاقے نے اس زمانے میں تو اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار نہیں کی جب کہ وہ ہر طرف سے طاقت ور اسلامی ریاستوں کے درمیان گھرا ہوا تھا مگر اب ہالینڈ کی سخت گیر مسلم کش حکومت قائم ہونے کے بعد وہ اسلام کی اطاعت قبول کر رہا ہے۔ ہالینڈ نے تلوار کی قوت سے اسلام کی اشاعت کو روکنے کی کوشش کی مگر اس سے مسلمانوں کا جوش تبلیغ بہت زیادہ تیز ہو گیا اور انہوں نے مسیحی مبلغین

کو شکستِ فاش دی۔ چنانچہ خود ایک مشنری کا بیان ہے کہ ایک موقعہ پر پورے دو گاؤں میں جو بپتسمہ لے چکے تھے، دفعتاً مسلمان ہوگئے اسی طرح ایک اور جگہ صرف ایک امام مسجد کی کوشش سے پیپروک کا پورا ضلع مسلمان ہوگیا۔ ایک اور مبلغ کے متعلق عیسائی مشنریوں کا بیان ہے کہ اس نے دس سال کے عرصے میں بت پرستوں کے ایک قبیلہ کو عیسائیت کے اثر سے نکال لیا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود حکومت ہالینڈ کے سرکاری ملازم بھی تبلیغ اسلام کا کام کرتے ہیں اور حکومت اس کی مخالفت ہونے کے باوجود انہیں روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

جزیرۂ سماٹرا سے اسلام کا اثر جزیرہ نمائے ملایا میں پہنچا۔ بارھویں صدی عیسوی میں سماٹرا کے بہت سے مسلمان تجارت کی غرض سے سنگاپور میں جا کر آباد ہوئے اور ایک صدی بعد انہوں نے ملکا کی بندرگاہ میں اپنی نوآبادی قائم کی۔ ان کی کوششوں سے سواحل کی اکثر تجارتی آبادی مسلمان ہوگئی اور ان کے ذریعہ اندرونِ ملایا اسلام کی اشاعت ہوئی۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہاں کا راجہ بھی ایک عرب تاجر سیدی عبدالعزیز کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا اور اس کا نام سلطان محمد شاہ رکھا گیا۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں ملایا کی جنوبی ریاست کوبڈا بھی اسلام کے اثر میں آگئی اور ۱۵۰۱ء میں وہاں کے راجہ پیراؤنگ مہاونگسا نے ایک مسلمان عالم شیخ عبداللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جس کا نام سلطان مزلف شاہ رکھا گیا۔ اس راجہ نے اپنی ساری زندگی اسلام کی اشاعت میں صرف کر دی اور مرنے سے پہلے ریاست کوبڈا کے ایک بڑے حصے کو بت پرستی کی لعنت سے آزاد کر دیا۔

ملایا سے اسلام کا اثر سیام پہنچا اور سنگاپور کے مسلمان تاجروں نے اسے ہند چینی تک پہنچا دیا۔ اس وقت ان دونوں ممالک میں اسلام کا جتنا اثر پایا جاتا ہے وہ سب انہی تاجروں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

جاوا

جزائر ملایا میں ہندویت اور بت پرستی کا سب سے زیادہ اثر جزیرہ جاوا میں تھا۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیمات کے باوجود اوہام پرستی کے عقائد صدیوں تک ان لوگوں کی طبیعتوں پر مستولی رہے اور منو کی دھرم شاستر کے رواج کا تو سنہ ۱۴۷۸ء تک پتہ چلتا ہے لیکن ان تمام عمیق اور راسخ اثرات کو اسلام کے خاموش مبلغوں نے صدیوں کے اندر بالکل دور کر دیا اور اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ تمام جزیرۂ جاوا کی آبادی، باستثنائے قلیل، مسلمان ہو چکی ہے اور جاوی مسلمانوں کا شغف دینی شرق الہند کے جزائر میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔[1]

اس عظیم الشان کام کی ابتدا ایک جاوی تاجر حاجی پُروانے کی جو پاجاجارن کے راجہ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے تخت و تاج اپنے چھوٹے بھائی کے لئے چھوڑ دیا اور خود مال تجارت لے کر ہندوستان پہنچا۔ یہاں آ کر متاع دنیا کے بجائے متاع آخرت اسے نصیب ہو گئی اور اس نے سب کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی کا مقصد صرف اس نعمت سے اپنے ہم وطنوں کو بہرہ ور کرنا قرار دے لیا۔ چنانچہ ایک عرب عالم کو لے کر جاوا پہنچا اور تمام عمر اسلام کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے بعد عربی اور ہندی تاجروں اور سیاحوں کی توجہ اس جزیرہ کی طرف منعطف ہو گئی اور انہوں نے کثرت سے یہاں آ کر سواحل پر اسلام کی اشاعت شروع

---

[1] یہ ذکر سنہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔

کردی۔ اس قسم کے سیاحوں کی بڑی جماعت چودھویں صدی میں مولانا سید ابراہیم کی زیر قیادت گریسک میں وارد ہوئی اور اس کو جاوا کی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ کامیابی حاصل ہوئی کہ چرمن کے راجہ نے اسلام قبول کر لیا۔ اور یہیں سے قریبی ریاستوں میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔

راڈن رحمت کا ظہور رحمت

پندرھویں صدی میں جزیرہ جاوا کا سب سے بڑا اسلامی مبلغ راڈن رحمت پیدا ہوا جس نے اسلام کو غربت کے بوریئے سے اٹھا کر بادشاہی اور بالادستی کے تخت پر پہنچا دیا اس نے شاہانہ ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور اگر چاہتا تو خود بھی کسی تخت کا مالک بن جاتا مگر اس کے دل میں اپنی نفسانیت کی خدمت کے بجائے اپنے مذہب کی خدمت کا جوش بھرا ہوا تھا۔ اس لئے اپنی زندگی کا مقصد وحید صرف تبلیغ و اشاعتِ اسلام کو قرار دیا اور "وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ[۲]" کے ارشاد ربانی کے مطابق سب سے پہلے اپنے خاندان سے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس نے اپنے نانا کو جو جمپا کا راجہ تھا، اسلام کی دعوت دی پھر "پالم بانگ" پہنچا اور اپنے رشتے کے بھائی آریہ دامر کو جو راجہ کی طرف سے وہاں کا گورنر تھا مسلمان کر لیا۔ اس کے بعد مولانا جمادی الکبریٰ کی معیت میں "ماجا پاہت" پہنچا اور راجہ کو جو اس کا خالو تھا، اسلام کی دعوت دی۔ راجہ نے خود تو اسلام قبول نہیں کیا مگر اسے امپیل کا گورنر مقرر کر کے پوری آزادی کے ساتھ اشاعت اسلام کی آزادی دے دی۔ چنانچہ اس نے اپنے زمانہ گورنری میں امپیل کے تقریباً تین ہزار خاندانوں کو مسلمان کیا اور اسلامی مبلغین کی

---

[۲] ترجمہ:- اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ (الشعراء: ۲۱۴)

ایک بڑی جماعت کو اطراف وجوانب کے جزیروں اور ریاستوں میں پھیلا دیا شیخ خلیفہ حسین، جس نے مدورا کو اسلام کی روشنیوں سے معمور کر دیا تھا۔ اسی کا فرزند تھا مولانا اسحاق جنہوں نے ریاست "بالنگن" میں اسلام کی اشاعت کی اسی کے فیض یافتوں میں سے تھے۔ راڈن پاکو، جس نے گریسک کے علاقہ میں بت پرستی کا کھوج مٹا دیا تھا، اسی کے فیض تربیت کا پروردہ تھا۔ خود اس کے دونوں بیٹے بھی جاوا کے مشہور اسلامی مبلغین میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے دو قریبی رشتہ دار راڈن پٹہ اور راڈن حسین، جاوا کی تاریخ میں اس حیثیت سے بہت مشہور ہیں کہ انہوں نے ہندو مذہب کی سب سے بڑی قوت یعنی "ماجاپاہت" کو قطعی طور پر مسخر کر لیا۔ راڈن حسین نے "ماجاپاہت" کی فوج کو سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے اسلام کی طرف دعوت دی اور راڈن پٹہ نے ۱۴۷۸ء میں کفر کو آخری شکست دے کر "ماجاپاہت" کو ایک اسلامی حکومت بنا دیا۔

مغربی جاوا میں اشاعت اسلام کا کام اس سے بھی زیادہ مشکل تھا کیونکہ وہاں کے ہندو عام جاویوں سے بھی زیادہ راسخ العقیدہ تھے۔ اگرچہ وہاں مولانا حسن الدین چیریبونیؒ جیسے زبردست اسلامی مبلغین نے بڑی سرگرمی سے اسلام کی تبلیغ کی تھی لیکن ہندومت ایک عرصے تک دین الٰہی کا مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ سولھویں صدی میں حق کی آخری فتح ہوئی اور "پاجاجارن" کی ہندو ریاست کُلّیتاً مسلمان ہو گئی۔

اس طرح بارھویں صدی سے شروع ہو کر سولھویں صدی تک چار سو برس کے

جاوا کا ایک ساحلی مقام

سے

عرصے میں جزیرہ جاوا کی تسخیر مکمل ہو گئی اور بغیر کسی قتل و خون کے محض تبلیغ و تلقین کی قوتوں سے ہندو مت نے اسلام کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیئے۔

مجموعۂ جزائر ملکا[1]

جاوا کے بعد اسلامی قوت کا دوسرا مخزن "مجموعۂ جزائر ملکا" ہے۔ یہاں اسلام کی اشاعت بہت بعد میں ہوئی ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر تو ہسپانی اور پرتگالی تجارت اور اسلام دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور پرامن مسلمان تاجروں نے جنگ آزما مسیحیت اور اسلام دونوں اپنے مذہب کی کامیاب تبلیغ کی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان یہاں جاوا اور ملایا کے تاجروں نے جو لونگ اور مسالے کے جہاز بھر کر لاتے تھے، اسلام کی اشاعت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کے ذوقِ تبلیغ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ پورے مجموعۂ جزائر میں اسلام پھیل گیا اور چار زبردست اسلامی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ایک ٹرنیٹ[2] کی حکومت تھی جس کا سلطان ٹرنیٹ الماہرہ کے ایک معقول حصہ پر حکمران تھا دوسری ٹیڈور کی حکومت تھی جس میں جزیرہ ٹیڈور[3]، الماہرہ[4] کا ایک حصہ، سیرام کا ایک حصہ اور نیوگیانا کا مغربی حصہ شامل تھا۔ تیسری حکومت سلطان گلوتو[5] کی تھی جو وسط الماہرہ اور شمالی سیرام پر حکومت کرتا تھا اور چوتھی تیجان[6] کی حکومت تھی جس کا اقتدار جزیرہ تیجان اور جزائر ادبی[7] پر حاوی تھا۔ یہ چاروں سلطنتیں کچھ مدت تک بہار دکھلانے کے بعد مسیحی استعمار کی بادِ سموم سے مرجھا کر فنا ہو گئیں مگر اسلام کا وجود نہ ان کا منت کش تھا اور نہ ان پر انحصار رکھتا تھا۔ چنانچہ اب ہالینڈ[8] وغیرہ کی مسیحی طاقتوں میں

تقسیم ہوجانے کے بعد بھی جزائر ملکا میں نہایت تیزی کے ساتھ اسلام پھیل رہا ہے اور عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ جب اسلام کے سوا وہاں اور کوئی مذہب نہ رہے گا۔

ان جزائر میں سب سے پہلے جزیرہ ٹیڈور اسلام کا حلقہ بگوش ہوا۔ پندرھویں صدی میں ایک عرب تاجر شیخ منصور نے یہاں کے راجہ کو مسلمان کرکے اس کا نام جمال الدین رکھا۔ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی مستعمرین (آبادکاروں) کی دوسری مہم یہاں پہنچی ہے تو جمال الدین کا بیٹا سلطان منصور حکمران تھا اور اسلام کو پھیلے ہوتے صرف پچاس گزرے تھے پرتگالی تاجروں کا بیان ہے کہ ٹرنیٹ میں ٹیڈور سے بھی پہلے اسلام کی اشاعت ہوچکی تھی چنانچہ ۱۵۲۱ء میں، جب پرتگالی مہم وہاں پہنچی تھی، اس کا مورخ لکھتا ہے کہ یہاں اسلام کو پھیلے ہوتے اسی برس گزر چکے ہیں اس جزیرے میں اشاعت اسلام کا عجیب قصہ ہے۔ ایک جاوی تاجر داتو ملا حسین جو اپنی تجارت کے سلسلے میں یہاں آکر مقیم ہوا تھا، روزانہ صبح کو بلند آواز سے قرآن پڑھتا تھا اس کی آواز پر بت پرست عاشق ہوگئے اور کثرت سے اس کے گرد جمع ہونے لگے تھوڑی مدت میں اس نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کرلی اور آخر ۱۴۹۵ء میں خود راجہ نے بھی گریسک جاکر اسلام قبول کرلیا۔

امبوئنا میں ایک مقامی تاجر "پاتی پوٹہ" نے اسلام کی روح پھونکی اور جاوا سے اس متاع گراں بہا کو لاکر تمام سواحل امبوئنا میں اسے پھیلا دیا

یہ پرتگالی استعمار کے ابتدائی عروج کا زمانہ تھا۔ پرتگالیوں نے تلوار کی قوت سے اس مذہب کی ترقی کو روکنا چاہا جس سے دراصل وہ صلیبی لڑائیوں کا بدلہ لینے کے لئے نکلے تھے نگران کے سخت مقابلے کے باوجود دین حق کی ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ عام باشندوں میں اس کو کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ جب سولھویں صدی کے اواخر میں پرتگال اپنے اندرونی خدشوں میں مبتلا ہوا تو امبوئنا والوں نے تمام مسیحی مشنریوں کو مار مار کر نکال دیا اور جوق در جوق اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے۔ ان جزائر کے ساتھ تجارتی تعلقات ہونے کی وجہ سے ملکا کے بقیہ جزائر بھی مسلمان ہو گئے۔

جزیرہ بورنیو

سنہ ۱۵۲۱ء میں گلولو کا راجہ مسلمان ہوا۔ اس صدی میں بورنیو بھی نور اسلام سے فیضیاب ہوا۔ سب سے پہلے ریاست "بنجرماسن" نے اسلام قبول کیا پھر شمالی بورنیو کی ریاست برونائی مسلمان ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۵۵۰ء میں پالمبانگ کے تاجروں نے سوکڈنا کی ریاست میں اسلام پھیلایا اور سنہ ۱۵۹۰ء میں بورنیو کا سب سے طاقتور راجہ مسلمان ہو گیا، جس کا نام سلطان محمد صفی الدین رکھا گیا سنہ ۱۶۰۰ء میں جب ایک مغربی سیاح بورنیو پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تمام سواحل مسلمان ہو چکے ہیں اور صرف اندرونی علاقے میں کفر و بت پرستی کا اثر باقی ہے۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے اندرون بورنیو میں بھی اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی۔ ایک طرف سرمایہ دار اور منظم مسیحی جماعتیں اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی ہیں اور دوسری طرف منتشر اور بے زر مسلمان تاجر اپنے دین کی طرف بلا رہے ہیں مگر دنیا یہ دیکھ کر

حیران ہے کہ مسیحی ناکام ہیں اور مسلمان کامیاب ، انہوں نے چند سال کی کوشش سے شمال بورنیو کی ایک بہت بڑی قوم "ایدان" کو مسلمان کر لیا ہے اور وسط بورنیو کی "ڈائک"، قوم بھی مسیحیت کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

جزیرہ سیلبس

جزیرہ سیلبس[1] میں بھی اسلام کی اشاعت اسی عام اصول کے مطابق ہوئی کہ پہلے جاوی اور ملائی تاجر اسلام کو لے کر سواحل پر پہنچے اور پھر دیسی تاجروں کے ذریعے وہ اندرون ملک میں پہنچ گیا سنہ ۱۵۴۰ء میں جب پرتگالی مستعمرین یہاں پہنچے تو اسلام کی ابتدا ہو رہی تھی اور صرف گوا[2] میں چند مسلمان رہتے تھے۔ ساٹھ سال کے اندر اندر اسے اتنی ترقی ہوئی کہ تمام سواحل مسلمان ہو گئے اور مکاسر کی ریاست نے راجہ سمیت اسلام قبول کیا مکاسر سے الفرا اور بوگی قوموں میں اس کی اشاعت ہوئی اور مؤخرالذکر قوم پر اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کی تمام فطری قابلیتیں جاگ اٹھیں اس کی ذہانت، جفاکشی اور مستعدی نے اسے جزائر ملکا کی سب سے زیادہ مہذب قوم بنا دیا اور اب وہ ایک مبلغ قوم کی حیثیت سے شرق الہند میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے[3] نیوگیانا سے لے کر سنگاپور تک اس کے تاجر اپنے جہاز لیے پھرتے ہیں اور ان کے اثر سے نہایت تیزی کے ساتھ اسلام پھیل رہا ہے۔ سُمباوا، لومبوک[4]، جزیرہ چوب صندل، وغیرہ تمام جزائر میں اس کی بدولت دین مبین کی اشاعت ہوئی اور خود سیلبس میں اس نے مسیحیت کو نہایت زبردست شکست دی اٹھارویں صدی میں مسیحی مبلغین نے بولانگ[5] اور

موبگونڈاؤ کے راجہ کو عیسائی کرلیا تھا اور اس کے اثر سے پوری ریاست عیسائی ہوگئی تھی مگر بوگی تاجروں نے ایک صدی کے اندر اندر اسے عیسائیت کے چنگل سے آزاد کرا لیا اور آخر ۱۸۴۴ء میں خود راجہ جیکوبس نے اسلام قبول کر لیا۔

جزائر فلپائن

نہتے اسلام کے اعجاز تسخیر کا سب سے بڑا مظاہرہ جزائر فلپائن میں ہوا۔ یہاں اسلام کی ابتدا ملایا کے ایک تاجر شریف کابنگ سوان نے کی تھی جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ منڈاناؤ میں آکر آباد ہوا تھا۔ یہاں اس نے کثرت کے ساتھ اہل فلپائن کو مسلمان کیا اور اس کے بعد مسلمان تاجروں کی آمد اور اسلام کی اشاعت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان وحشی قبائل میں اسلام کی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ ۱۵۲۱ء میں جب ہسپانوی مستعمرین وہاں پہنچے تو انہوں نے مسلمانوں اور کافروں کی معاشرت، تہذیب اور اخلاق میں ایک نمایاں امتیاز پایا اور انہیں حیرت ہوئی کہ اس قلیل عرصے میں بت پرست وحشیوں کی زندگی میں یہ عظیم انقلاب کیونکر پیدا ہو گیا۔ چونکہ یہاں اسلام کا اثر بہت حدیث العہد (تازہ) تھا اس لئے ہسپانیہ نے اسے مٹا کر مسیحیت کو پھیلانے کیلئے نہایت سخت کارروائیاں شروع کیں اور تلوار کے زور سے قبائل کو عیسائی بنانے لگے۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے مہذب ایام کی ابتدا تک جاری رہا۔ اور اسپین نے مذہب کی خاطر ظلم وستم ڈھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن اس کے باوجود وہاں مسیحیت کے مقابلے میں اسلام کی اشاعت نہایت تیزی کے ساتھ ہوئی۔ کیونکہ فلپائن کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں تمام اطراف سے بھاگ بھاگ کر منڈاناؤ اور سولو کی اسلامی ریاستوں میں آتے تھے۔ اور فوج در فوج

اسلام قبول کرتے تھے اور پھر حیرت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جب یہاں امریکہ کا تسلط قائم ہوا اور مذہبی تشدد کا دور ختم ہو گیا تو اشاعتِ اسلام کی وہ تیز تر رفتاری بھی باقی نہیں رہی تاہم زمانۂ امن میں مسلمان تاجر نہایت کثرت کے ساتھ اطراف میں پھیل گئے اور جدید ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں خاموشی اسلامی تبلیغ کا سلسلہ نئے سرے سے جاری ہو گیا ہے ۔

نیوگنی

نیوگیانا میں اسلام کی اشاعت جدید ترین عہد سے تعلق رکھتی ہے اور زیادہ تر سواحل تک محدود ہے ۔ ابتداً اس کا مغربی علاقہ سلطان بتجان کے تابع فرمان تھا ۔ اس لئے سولھویں صدی میں شمال مغربی گیانا میں اسلام کا اثر زیادہ وسعت اختیار کر گیا ۔ سنہ ۱۶۰۶ء میں مسلمان تاجر اسے مغرب کی طرف بھی لے گئے ۔ اور جزیرہ نما اونلین کی بت پرست آبادی میں اسلام کو پھیلا دیا ۔ مگر ان اطراف میں اشاعتِ اسلام کا اصل زمانہ انیسویں صدی کا ہے ۔ انیسویں صدی کے وسط میں جزیرہ آدی نے اسلام قبول کیا اور بیسویں صدی کی ابتداء میں سیرام اور گورام کے مسلمان تاجروں نے پلّاوا وغیرہ جزائر کو اسلام سے روشناس کیا ۔ جزائر کائی میں انیسویں صدی کے وسط تک مسلمانوں کا نام و نشان نہ تھا ۔ صرف جزیرہ بندا کے چند تاجر رہا کرتے تھے ۔ دفعتاً سنہ ۱۸۶۸ء میں تبلیغ کا کام شروع کیا ۔ اور تھوڑی ہی مدت میں مدورا جاوا اور ربائی کے مسلمان تاجروں نے اس قدر کثرت کے ساتھ جزائر کائی کے باشندوں کو مسلمان کر لیا کہ اس وقت وہاں مسلمانوں کی تعداد ۱۶۰۰۰ سولہ ہزار سے متجاوز کر چکی ہے ۔ جو کل آبادی کے نصف کے برابر ہے ۔

مجمع الجزائر ملایا میں اسلام کی عظیم الشان کامیابی جس کا مختصر سا حال آپ نے

ان سطور میں ملاحظہ کیا ہے۔ چھ صدیوں کی خاموش مساعی کا نتیجہ ہے جو زیادہ تر تاجروں اور عام سیاحوں نے انجام دی ہیں۔ ان کے پاس کوئی تلوار یا حاکمانہ قوت نہیں تھی بلکہ صرف تبلیغ دین الٰہی کا ایک زندہ و تابندہ ذوق تھا جس نے انہیں اپنے سفر کے خطرات اور مہالک اور تجارتی منافع کی زرپرستانہ زندگی میں بھی مذہب کی خدمت کا والہ و شیدا بنائے رکھا۔ اور ان کے اندر ایسی شیفتگی پیدا کر دی کہ انہوں نے تمام دوسرے مقاصد کو ثانوی درجہ دے کر صرف دعوت الخیر اور تبلیغ دین مبین کو اپنا اوّلین مقصد قرار دیا۔ جدید دور میں بھی جبکہ تمام دنیا کے مسلمان باستثنائے افریقہ فرض سے غافل ہو گئے ہیں۔

شرق الہند کے عام مسلمانوں میں یہ ذوق باقی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب بھی تاجروں اور کاروباری آدمیوں کے علاوہ حکومت ہالینڈ کے سرکاری ملازم تک تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے ملائی زبان کو اس قدر کثرت کے ساتھ اسلامی لٹریچر سے بھر دیا ہے۔ کہ جو غیر مسلم سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کو سیکھتے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ اور اکثر اوقات مسلمان ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

دعوتِ عمل

یہ طویل داستان سرائی محض اس لئے نہیں تھی کہ اس سے کچھ افسانہ ہائے پارینہ کو چھیڑنا مقصود تھا بلکہ اس سے دراصل ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ اسلام کی دینی اور دنیاوی قوت کا اصلی سرچشمہ وہی **دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** ہے جس پر اس کی ساری زندگی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور جس کے لئے مسلم نام کی ایک قوم کو حضرت حق جل شانہٗ نے پیدا کیا تھا۔ اور چونکہ پیغام کی فطرت اس بات کو چاہتی ہے کہ اسے مرسل الیہ تک پہنچایا جائے۔ اس لئے تبلیغ خود اسلام کی فطرت میں شامل ہے اسلام حقیقت میں ایک الٰہی پیغام ہے جس کی مخاطب کرۂ ارض کی تمام بشری مخلوقات ہے۔ اور ہر شخص جس تک یہ آسمانی برکتوں کا پیغام پہنچ جائے اس امر پر عنداللہ مامور ہے کہ اپنے بنی نوع کے زیادہ سے زیادہ افراد تک اس کو پہنچا دے یہی حقیقت تھی جس کو آیتِ کریمہ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ [1]

میں ظاہر کیا گیا تھا۔ اور یہی ایک مقصد تھا جسے پورا کرنے کے لئے اللہ عزّ وجل نے مسلمانوں کی قوم کو پیدا کیا تھا کہ:۔

---

[1] ترجمہ دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آلِ عمران: ۱۱۰)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط [1]

اس ماموریت کے احساس نے اسلام کی تیرہ سو سالہ زندگی میں جو حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں ان کا ایک نہایت مختصر سا خاکہ پیش کیا جا چکا ہے اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت خوب روشن ہو گئی ہو گی کہ جن مسلمانوں میں اپنے مسلمان ہونے کی ذمہ داری کا احساس موجود تھا انہوں نے کس طرح "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" [2] کے امر الٰہی پر عمل کرتے ہوئے محض تلقین و تبلیغ کی قوت سے ایک دنیا کو اسلام کے لئے مسخر کر لیا۔ افریقہ کے وسیع برّ اعظم میں بغیر کسی جبر و لالچ اور مکر و دغا کے جس طرح کروڑوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، چین میں بغیر کسی مادی اور جبّاری قوت کے جس طرح آبادیوں کی آبادیاں اسلام کی تابع فرمان بن گئیں، جزائر ملایا میں نہتے اور بے زور تاجروں کے ہاتھوں جس طرح ۴/۵ آبادی خدائے واحد کی پرستار بن گئی، تاتارستان کے مسلم کش اور خونخوار وحشیوں کو ضعیف اور نازک عورتوں اور بے نوا درویشوں نے جس طرح اسلام کے آستانۂ رحمت پر لا کر جھکا دیا اس کی بصیرت افروز داستان ہم نے اسی احساس کے کرشمے دکھانے کے لئے اپنے برادرانِ ملت کے سامنے پیش کی ہے اور اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان میں بھی کسی طرح یہ احساس جاگ اٹھے۔

---

[1] ترجمہ: تم میں کچھ لوگ تو ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ (آل عمران: ۱۰۴)

[2] اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ (النحل ۱۲۵)

۱۸۵۷ء کے بعد کی تبلیغی سرگرمیاں

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے زمانے میں مسلمانانِ ہند کی اسلامی حمیت کو جو دلگداز صدمات پہنچے تھے انہوں نے کچھ عرصے کے لئے ان کی دینی حسیات کو بیدار کر دیا تھا اور اس کی بدولت ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً چالیس سال تک اشاعتِ اسلام کا کام نہایت تیزی کے ساتھ ہوتا رہا۔ مگر افسوس کہ بعد میں استیلائے کفار کے اثر سے وہ دینی احساس اور وہ ذوقِ تبلیغ ختم ہو گیا اور خدمتِ دین کا وہ عام جوش جو کچھ عرصے کے لئے پیدا ہو گیا تھا آپس کی کفر بازیوں اور باہمی جنگ و فساد میں کام آنے لگا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو حیرت انگیز واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ کہ اس زمانے میں کوئی باقاعدہ تبلیغی نظام قائم نہ ہونے کے باوجود نومسلموں کی تعداد میں ہر سال دس ہزار سے لے کر چھ لاکھ تک اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس زمانے میں علماء اور واعظین کی ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی تھی جس نے اپنی زندگی تبلیغِ دین کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اپنی انفرادی حیثیت میں شہر در شہر پھر کر سینکڑوں آدمیوں کو مشرف باسلام کیا تھا۔ ان کے علاوہ عام کاروباری مسلمانوں میں بھی یہ ذوق اس قدر پھیل گیا تھا کہ دفتروں کے ملازم اور معمولی دوکاندار تک اسلام کی اشاعت کرتے تھے۔ چنانچہ انجمن حمایت اسلام کی پرانی رپورٹوں میں ہم مدارس کے اساتذہ، سرکاری محکموں کے ملازموں، چھوٹے چھوٹے تاجروں حتیٰ کہ ایک اونٹ گاڑی والے تک کو اپنے دین کی اشاعت میں مشغول پاتے ہیں۔

لیکن اب ......

موجودہ دور میں اشاعتِ اسلام کی سست رفتاری کی وجہ پر اگر غور

کریں تو یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ اس کی ذمہ داری صرف ہماری اپنی ہی غفلت اور دینی بے حسی پر عائد ہوتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس کی فطرت میں کوئی تغیر نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ البتہ ہم بدل گئے ہیں۔ ہماری زندگی بدل گئی ہے۔ ہمارے جذبات و حسیات بدل گئے ہیں۔ اور یہ سب تنزل اسی کا نتیجہ ہے پس آج اگر ہندوستان[1] میں اشاعت اسلام کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر گیا ہے تو اس کا صحیح حل یہ نہیں ہے کہ ہم کانفرنسوں پر کانفرنسیں منعقد کریں، انجمنوں پر انجمنیں بنائیں، رسالوں پر رسالے شائع کریں اور محض شور و شغب میں اپنا وقت ضائع کریں، بلکہ اس کا اصلی حل یہ ہے۔ کہ ہم مسلمانوں کو مسلمان بنائیں ان میں صحیح اسلامی روح پھونک دیں، ان کی زندگیوں کو خالص اسلامی زندگی کے قالب میں ڈھال دیں ان کے اندر سے اُن تمام باطل عقائد، مبتدعانہ رسوم اور غلط عادات کو دور کر دیں جو صدیوں تک ایک مشرک قوم کے ساتھ ساتھ رہتے رہتے پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ان کے اندر مذہبیت کا ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیں جو ہر مسلمان کو اپنے دین کا ایک سرگرم مبلّغ بنا دے۔

ہم نے جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی عیسائیوں کی طرح تبشیری سوسائٹیاں بنا کر کام نہیں کیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم تنظیم کے ساتھ کام کرنے کے مخالف ہیں بلکہ دراصل مراد یہ ہے کہ یہ کام محض ایک جماعت یا چند جماعتوں کا نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مسلمانوں میں تبلیغ دین کے ایک ایسے عام ذوق کی ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو اس مقدس کام کے لئے مامور سمجھنے لگے۔

---

[1] مراد ہے متحدہ ہندوستان۔

محض تبلیغی جماعتیں یا ہمہ گیر ذوقِ تبلیغ ؟

اگر عام مسلمان اس ذوق سے بے بہرہ رہیں اور محض ایک انجمن یا چند انجمنوں پر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو ہم کبھی غیر مسلموں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر جگہ مسلمانوں کا عام ذوقِ تبلیغ ہی فتح و کامرانی سے سرفراز ہوا ہے۔ اگر افریقہ میں مسلمانوں کا یہ عام ذوق نہ ہوتا اور صرف چند انجمنیں ہی فریضۂ تبلیغ کو انجام دینے کے لئے چھوڑ دی جاتیں تو عیسائیوں کی بدرجہا زیادہ طاقتور اور دولت مند سوسائیٹیوں کے مقابلے میں انہیں قیامت تک وہ کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی تھی جس پر آج ساری مسیحی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی ہے۔ اسی طرح اگر مجمع الجزائر ملایا میں عام تاجروں اور سیاحوں کا جذبۂ خدمتِ دینی کام نہ کرتا اور صرف وہ چند عربی اور ہندی واعظین اور علماء ہی دعوتِ اسلام کا فرض انجام دیتے جو وقتاً فوقتاً وہاں پہنچتے رہے تھے تو شاید آج بحر الکاہل کے ساحلوں پر اذان کی وہ گونج اس کثرت سے سنائی نہ دیتی جو آج بت پرستی اور مسیحی استعمار کی متحدہ مزاحمت کے باوجود سنائی دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوتِ اسلام ایک فرضِ کفایہ ہے جس کے لئے کسی ایک جماعت کا کھڑا ہو جانا تمام امت کے لئے کفایت کرتا ہے۔ لیکن شریعت کی یہ رخصت محض مسلمانوں کی آسانی کے لئے ہے۔ نہ کہ انہیں دینی خدمات سے بالکل سبکدوش اور بے پرواہ کر دینے کے لئے اس رخصت کا مطلب اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ فرض عائد تو تمام مسلمانوں پر ہوتا ہے جسے سب کو ادا کرنا چاہیئے۔ لیکن کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور رہنی چاہیئے جو ہمیشہ بالالتزام اسے ادا کرتی رہے اور وہ جماعت یقیناً علماء و صلحائے امت کی جماعت ہے۔

پس ہمارے نزدیک اسلام کی اشاعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں کو مخاطب کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو مخاطب کریں اور ان میں اس قسم کی مذہبی روح

پھونک دیں کہ ہر مسلمان ایک مُبلّغ بن جائے اس سے نہ صرف فریضۂ تبلیغ ہی بہترین صورت سے انجام پا سکے گا بلکہ ہمارے سینکڑوں دینی امراض کو بھی خود بخود شفا ہو جائے گی۔

اصلاحِ حال کیلئے چند عملی تدابیر

ان مختلف اصلاحی تدابیر میں سے چند تدبیریں، جو دیگر ممالک کے تبلیغی تجربات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے خیال میں اشاعتِ اسلام کے لئے مفید ہیں، ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ زُعمائے ملت ان پر غور کریں گے۔

ا۔ ذات پات اور عدم مساوات کا خاتمہ

مسلمانوں میں سے ذات پات کے اس امتیاز کو مٹا دیا جائے جو ہندوؤں کی ہمسائیگی سے ان کے اندر پیدا ہو گیا ہے اسلام کا یہ مساوات پرور عقیدہ کہ کوئی انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے نجس یا ذلیل نہیں ہے ہمیشہ اس کی کامیابی کا بڑا ذریعہ رہا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ ہم دوبارہ اس کو اپنے تمام معاملات میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے داخل کریں۔

ب۔ نسبی امتیازات کا خاتمہ۔

ہمارے ہاں عام طور پر نومسلموں کو نسبی مسلمانوں کے مقابلے میں ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اس غیر اسلامی عقیدے کا سختی کے ساتھ استیصال کر دینا چاہیئے۔ اور نومسلم عورتوں اور مردوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنے کی رسم دوبارہ زندہ ہونی چاہیئے۔ ہمارے ہاں کے شرفا اس سے پرہیز کرتے ہیں مگر ہم میں کا کوئی شریف ترین آدمی بھی رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقابلے میں اپنی شرافت کو پیش نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے دو نومسلموں، یعنی حضرت

ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹیاں لی تھیں اور دونو مسلموں، یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو اپنی بیٹیاں دی تھیں ۔

ج۔ اخوتِ اسلامی کا فروغ

مسلمانوں میں اخوّتِ اسلامی کے جذبہ کو ترقی دینی چاہیئے تاکہ غیر مسلموں کو اسلامی برادری میں داخل ہونے کا شوق پیدا ہو۔

د۔ عام دینی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح

اگر مسلمانوں کی اندرونی زندگی کی اصلاح کسی عمیق تحریک کی محتاج ہو تو کم از کم ان کی ظاہری زندگی میں ایسی اسلامی کشش پیدا کرنی چاہیئے کہ غیر مسلم قومیں خودبخود ان کی طرف کھنچنے لگیں مثلاً نماز باجماعت اور روزوں کی پابندی شرک اور رسوم وبدعات سے احتراز اور منہیات شرعیہ سے پرہیز کی عام تلقین کی جائے اور خصوصاً مسلمانوں میں اخلاقی جرائم کے استیصال کی سخت کوشش کی جائے کیونکہ جب مسلمانوں کا اخلاقی درجہ بلند ہوگا تو غیر مسلموں کے دل میں ان کی عظمت قائم ہو جائے گی ۔

۷ مذہبی مسائل کی تعلیم اور تبلیغی سرگرمیوں کی تحریک و ترغیب

جمعہ کے مواعظ، شبینہ مجالس، ومدارس اور عام رسائل کے ذریعے مسلمانوں کو مذہبی مسائل کی تعلیم دی جائے تقابلِ ادیان کے معمولی مباحث نہایت وضاحت کے ساتھ بتائے جائیں اور ان کے اندر تبلیغ کا شوق پیدا کیا جائے خصوصیت کے ساتھ مدارس کے اساتذہ، سرکاری محکموں کے ملازموں اور عام کاروباری لوگوں میں اس تحریک کو پھیلانا بہت مفید ہے کیونکہ انہیں عوام سے بہت زیادہ میل جول کا موقعہ ملتا ہے ۔ اور وہ بہت کامیابی کے ساتھ تبلیغ کر سکتے ہیں ۔

حرفِ آخر۔

یہ ایک نہایت زبردست کام ہے۔ اور اس کو انجام دینے کے لئے ضرورت ہے۔ کہ ہمارے علماء اور سجادہ نشین حضرات اپنے حجروں سے نکلیں۔ علماء کا فرض تو ظاہر ہے کہ انہیں درجۂ "خشیۃ"[1] اور انبیائے بنی اسرائیل سے مشابہت جیسی فضیلتیں کچھ مفت ہی نہیں مل گئی ہیں بلکہ ان پر اُمت کی اصلاح وہدایت کا ایک بہت بڑا بار رکھ دیا گیا ہے۔ جسے اٹھانے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کرنے پر وہ خدا کی شدید گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ مگر ہم حضراتِ صوفیائے کرام کو بھی ان کا فرض یاد دلانا چاہتے ہیں۔ جن سجادہ ہائے طریقت پر وہ جلوہ فرما ہیں وہ ارشاد وہدایت کی سندیں ہیں۔ ان کی وراثت اپنے ساتھ صرف چند فضیلتیں اور دنیاوی فوائد ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ بہت سی ذمہ داریاں اور بہت سی مسئولیتیں بھی رکھتی ہے جن کے احساس نے قدمائے متصوفین کو اسلام کی خدمت کے سوا اور کسی مطلب ہی کا نہ رکھا تھا۔ آج اگر یہ حضرات ان ذمہ داریوں کو محسوس کرلیں جو ایک مسلمان سے بیعت لینے کے بعد اس کی اصلاح وتزکیۂ نفس کے لئے ان پر عائد ہوتی ہیں تو مسلمانوں کے سینکڑوں مصائب کا علاج ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے سجادہ نشینوں اور پیرانِ طریقت کا حلقۂ ارادت کم از کم کروڑ ڈیڑھ کروڑ[2] مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس میں ان کو ایسا زبردست اثر حاصل ہے کہ وہ اپنے ایک اشارے سے اُن

---

[1] اس آیۂ قرآنی کی طرف اشارہ ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸) ترجمہ:۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف (صفاتِ الٰہی کا) علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

[2] یہ اندازہ ۱۹۲۵ء کا ہے اب صورتِ حال یقیناً اس سے مختلف ہے۔

کی زندگیوں کا نظام بدل سکتے ہیں۔ ایسی کثیر جماعت میں اسلامی خدمت کا جوش پیدا کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ چند ہی سال میں اس سرزمین کا نقشہ بدل جائے تو کیا ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے کاشانۂ امن و عافیت سے نکل کر اس نازک وقت میں کچھ خدا اور اس کے دینِ برحق کے لئے بھی دوڑ دھوپ کریں گے۔

حصہ دوم

سدّباب ذریعہ

اُصول تشریع میں سے ایک اصل عظیم

از افادات علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ

سدِّ باب ذریعہ

اُصولِ تشریع میں سے ایک اصلِ عظیم

از افادات علامہ ابن القیم رحمہ اللہ

(علامہ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین فقہ اسلام کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں علامہ موصوف نے اسلامی قانون ماخذ اور اس کی روح اور اس کے اسرار و حکم اور طریق قیاس و استنباط اور اصول فتویٰ پر اس خوبی سے بحث کی ہے کہ اس کی نظیر علماء اسلام کی تصنیفات میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس اشاعت میں ہم اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ درج کر رہے ہیں جس میں شریعت کے اصول میں سے ایک اصل عظیم کی تشریح کی گئی ہے۔ اگر موقع ملا تو علامہ کے بعض اور مقالات بھی ان صفحات میں نقل کئے جائیں گے۔

انسان جب کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کے مناسب اسباب و وسائل اختیار کرتا ہے اور مقصد تک پہنچنا اسباب ہی کے ذریعہ سے ممکن ہوتا ہے پس تشریعی نقطۂ نظر سے جو حیثیت مقصد کی ہوگی وہی اس تک لے جانے والے ذرائع کی ہوگی یعنی جو مقصد حرام اور گناہ ہے اس کے اسباب اسی درجہ میں مکروہ اور ممنوع ہوں گے جس درجہ میں وہ اس مقصد تک پہنچانے کے لئے ممد و معاون

ہوں اور جو مقصد طاعات و قربات کے قبیل سے ہو اس کے اسباب اسی درجہ میں محمود اور پسندیدہ ہوں گے جس درجہ میں وہ اس مقصد تک پہنچانے کے لئے مددگار اور مفید ہوں حاصل یہ نکلا کہ وسیلہ، مقصود خود مقصود کے تابع ہوتا ہے۔ اگرچہ مقصد دونوں ہیں، مگر ایک قصد غایات کا مقصود ہے اور دوسرا قصد وسائل کا مقصود۔ اللہ تعالےٰ جب کسی شے کو حرام قرار دیتا ہے تو اس تک پہنچانے والے جتنے طریقے اور وسائل ہوتے ہیں۔ ان کو بھی وہ ممنوع کر دیتا ہے تاکہ اس شے حرام کی تحریم مضبوط اور مستحکم ہو جائے اور لوگ اس کے پاس تک نہ پھٹک سکیں۔ کیونکہ اگر اس کے وسائل و ذرائع کو مباح کر دیا جاتا تو اس سے تحریم کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اور لوگ مخمصہ میں مبتلا ہو جاتے، اللہ کی حکمت اور اس کے علم سے ایسی کھلی ہوئی فروگذاشت بعید بلکہ ابعد ہے۔ اللہ تعالےٰ تو خیر الحاکمین ہے، اس نادانی کو تو دنیوی بادشاہونکی سیاست بھی قبول نہیں کرتی۔ بادشاہ جب کسی چیز کو جرم قرار دیتے ہیں تو اس جرم کے ارتکاب میں مدد دینے والے آلات اور وسائل کو بھی ممنوع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس کو مباح رہنے دیا جائے تو خلاف ورزی قانون کے امکانات بڑھ جائیں۔ اور قانون سازی کا مقصود ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح اطباء جب بیماری کا علاج کرتے ہیں تو بیمار کو ان تمام چیزوں سے روک دیتے ہیں جو بیماری کو پیدا کرنے اور بڑھانے کی باعث ہوتی ہے اگر ایسا نہ کریں تو اصلاح بدن کا مقصود ہی پورا نہ ہو۔ جب حال یہ ہے تو اس شریعت کاملہ کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے۔ جو مصلحت اور کمال کے بلند ترین مدارج پر پہنچی ہوئی ہے، جو شخص اس شریعت کے قواعد اور احکام پر غور کرے گا اس کو معلوم ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول نے تمام محرمات کا سدِّ باب کرنے کے لئے ان ذرائع پر پابندیاں عائد کر دی ہیں، جو ان محرمات تک لے جانے والے ہیں۔

کسی مفسدہ تک لے جانے والا فعل یا قول دو قسموں میں کسی ایک قسم ہوتا ہے۔

ایک وہ جو خصوصیت کے ساتھ اسی مفسدہ کے لئے موضوع ہو جیسے شراب کہ وہ نشہ پیدا کرنے ہی کے لئے بنائی جاتی ہے۔ یا جیسے قذف کہ وہ کسی کو بدنام کرنے ہی کے لئے کیا جاتا ہے اور زنا کہ اس کا لازمی نتیجہ اختلاط انساب و فساد فراش ہے۔ یہ ایسے افعال یا اقوال ہیں جن کا کوئی دوسرا پہلو ان مفاسد کے سوا نہیں ہے۔

دوسرا وہ جو موضوع تو کسی جائز یا مستحب امر کے لئے ہے مگر اس کو کسی حرام چیز کے لئے یا تو بالقصد وسیلہ بنا لیا جاتا ہے یا وہ بلا قصد و ارادہ اس کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ بالقصد بنائے جانے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص نکاح کرے اور اس کا مقصد کسی مطلقہ مغلظہ عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لئے حلال کرنا ہو، یا کوئی شخص بیع کا معاملہ کرے اور اس کا مقصد سود سے نفع اٹھانا ہو یا کوئی شخص اپنی بیوی سے خلع کا معاہدہ کرے اور اس کا مقصد قسم توڑنا ہو اور بلا قصد و ارادہ اس کے ذریعہ فساد بن جانے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص تطوع کی نیت سے اوقات ممنوعہ میں نماز پڑھے، یا مشرکین کے سامنے ان کے بزرگوں اور معبودوں کو گالی دے یا قبر کے سامنے خدا کی عبادت کرے۔

دوسری قسم کے ذرائع کی پھر دو قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ اس قول یا فعل کی مصلحت اس کے مفسدہ کے مقابلہ میں لائق ترجیح ہو۔

دوسری یہ کہ اس کا مفسدہ اس کی مصلحت سے بڑھا ہوا ہو۔

پس تمام ذرائع کل چار اقسام کے ہوئے۔

(۱) وہ ذریعہ جو مفسدہ ہی کی طرف لے جانے کے لئے خاص ہو۔

(۲) وہ ذریعہ جو امر مباح کے لئے وضع کیا گیا ہو مگر اس کو کسی گناہ کے لئے بالقصد ذریعہ بنا لیا جائے اور اس کا فساد اس کی مصلحت پر غالب ہو۔

(۳) وہ ذریعہ جو کسی جائز مقصد کے لئے اختیار کیا جائے مگر بلا ارادہ وہ فسا

کو کسی مفسدہ میں مبتلا کر دے۔

(۴) وہ ذریعہ جو امر مباح کے لئے مقرر ہو۔ اور اس میں مفسدہ کا خطرہ بھی ہو مگر اس کی مصلحت اس کے مفسدہ پر مرجح ہو۔

پہلی اور دوسری قسم کی مثالیں اوپر بیان کی جا چکی ہیں تیسری قسم کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اوقات ممنوعہ میں نماز پڑھے یا مشرکین کے معبودوں کو ان کے سامنے گالی دے، یا کوئی بیوہ عورت زمانۂ عدت میں بناؤ سنگھار کرے۔ چوتھی قسم کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اجنبی عورت کو اس ضرورت سے دیکھے کہ وہ اُسے نکاح کا پیغام دینا چاہتا ہے، یا اس سے کوئی معاملہ کر رہا ہے، یا وہ قاضی ہے اور عورت اس کے سامنے گواہ یا فریقِ معاملہ کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے یا ممنوعہ اوقات میں کسی مجبوری سے کوئی فعل کرے، یا کسی ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہے۔ شریعت نے اس آخری قسم کے افعال کو ان کی مصلحتوں کے درجات کے لحاظ سے مباح یا مستحب یا واجب ٹھیرایا ہے۔ اور پہلی قسم کے ذرائع کو اسی درجہ میں مکروہ یا حرام قرار دیا ہے جس درجہ کے مفسدہ تک وہ لے جانے والے ہیں۔ اب رہ گئے بیچ کی دو قسموں کے ذرائع تو زیادہ تر انہی کے باب میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شریعت ان کو مباح ٹھیراتی ہے یا ممنوع؟ میں کہتا ہوں کہ اس امر کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ شارع نے ان دونوں قسم کے ذرائع کو بھی روکا ہے چنانچہ ذیل میں ان کی چند نظیریں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے کہ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ "جن معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے بجائے پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو، کہ یہ دشمنی سے بے سمجھے بوجھے خدا کو گالیاں دیں گے۔" دیکھئے! معبودانِ باطل کو برا کہنا ظاہر ہے کہ خدا پرستانہ حمیت اور شرک سے نفرت ہی کی بنا پر ہوگا۔ اور یہ مقصود برا نہیں لیکن اللہ تعالےٰ نے اس سے منع کر دیا، کیوں کہ یہ اللہ کی شان میں گستاخی کا سبب بن جاتا ہے۔ اور معبودانِ باطل کی اہانت میں خواہ

رئی بھی مصلحت ہو، بہر حال وہ اس مفسدہ کے مقابلہ میں کم ہے جو اس سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس بات پر نہایت صریح دلیل ہے کہ اگر کسی فعل جائز سے کوئی مفسدہ پیدا ہوتا ہو اور وہ اس کی مصلحت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہو تو اس کو ممنوع قرار دینا درست ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ۔ عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مارتی نہ چلیں کہ اس زینت کا اظہار ہو جو انہوں نے چھپا رکھی ہے۔"

زمین پر پاؤں مارنا فی نفسہ کوئی گناہ نہیں۔ مگر اس کو اس لئے ممنوع ٹھہرایا گیا کہ پازیب وغیرہ کی جھنکار سننے والوں کے جذبات شہوانی میں حرکت اور عورتوں کی طرف توجہ کا سبب نہ بن جائے۔

(۳) حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ الآیہ

"اے ایمان والو! تمہارے غلام اور وہ لڑکے جو ابھی بالغ نہیں ہوئے ہیں۔ تین وقتوں میں جب تمہارے پاس آنا چاہیں تو پہلے اجازت مانگ لیا کریں ایک صبح کی نماز سے پہلے، دوسرے دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیا کرتے ہو تیسرے نماز عشاکے بعد" اس آیت میں اصل مقصود تو یہی ہے کہ ہوشیار بچے اور غلام اچانک داخل ہو کر لوگوں کو کسی نادیدنی حالت میں نہ دیکھیں۔ کیونکہ اس سے مفاسد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، لیکن اس کے لئے وہ تین اوقات مخصوص کر دیئے گئے جن میں مفسدہ کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ باقی رہے دوسرے اوقات تو گو مفسدہ کے امکانات ان میں بھی ہیں لیکن چونکہ وہ بہت قلیل ہیں اسلئے ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔

(۴) ارشاد باری ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا "اے مسلمانو! نبی کو پکارتے وقت رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو[1]" اللہ تعالیٰ

---

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تقریر فرماتے اور دوران کلام میں کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی تو

نے یہ کلمہ کہنے سے مسلمانوں کو کیوں منع فرمایا؟ مسلمان جب رَاعِنَا کہتے تھے تو اُن کی نیت اچھے ہی معنی کی ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ ان کے لئے جائز ہونا چاہیئے تھا۔ مگر حق تعالیٰ نے ان کو اس لئے روک دیا کہ وہ اس قول میں بلا قصد و ارادہ یہودیوں کے ہم زبان نہ بن جائیں جو اس لفظ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے لئے استعمال کرتے تھے اور اس لئے بھی کہ اگر مسلمانوں میں یہ محاورہ رائج ہو گیا تو یہودیوں کو سبِّ نبی کے لئے ایک پردہ مل جائے گا؛ اور وہ اس کے استعمال کو آڑ بنا کر نبی کو گالی دیتے رہیں گے۔

(۵) اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ مگر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا خدا کا خوف کھائے۔ دیکھیئے! ایک بدترین دشمن خدا اور کٹّے کافر اور شدید سرکش سے نرمی کے ساتھ کلام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیوں؟ باوجودیکہ وہ سخت سے سخت زجر و توبیخ اور ملامت کا مستوجب تھا۔ مگر اس لئے نرمی کی تاکید کی گئی کہ کہیں غلظیت اور شدت اس کی تنفیر کا سبب نہ بن جائے اور اتمام حجت میں خلل نہ واقع ہو۔ اس کے حق میں سختی کلام جائز تھی۔ مگر اس جائز کو اس لئے ممنوع کیا گیا کہ اس کا مفسدہ اس کی مصلحت سے زیادہ وزنی تھا۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو مشرکین کے خلاف طاقت استعمال کرنے سے روکا اور درگزر کا حکم دیا۔ اگرچہ مشرکوں سے لڑنا غیر جائز نہ تھا۔ مگر منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ ان کی جان اور ان کے دین اور اولاد کو ہلاکت سے بچانے کی مصلحت انتصار اور مقابلہ کی مصلحت کے مقابلہ میں راجح تھی۔

بقیہ صـ وہ رَاعِنَا کہا کرتا تھا یعنی پھر عنایت ہو ہم نہیں سمجھے لیکن یہ ذومعنی لفظ تھا یہودی بھی ایسے مواقع پر قصداً یہی برتتے تھے اور ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ اے احمق شیخی خورے (نعوذ باللہ) اور کبھی وہ زیادہ بدتمیزی سے کام لے کر راعنا کے کسرے کو کھینچ دیتے تھے جس سے رَاعِینَا بن جاتا تھا یعنی اے ہمارے گڈریئے

(۷) اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اذان کے وقت خرید و فروخت سے منع فرما دیا۔ تجارت ایک جائز فعل ہے مگر منع اس لئے کیا گیا کہ یہ نماز جمعہ چھوٹ جانے ذریعہ نہ بن جائے یا اس کو ترک نماز کے لئے بہانہ بنا لیا جائے۔

(۸) متفق علیہ حدیث ہے، جناب حمید بن عبدالرحمٰن، حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا من الکبائر شتم الرجل والدیہ۔ کسی شخص کا اپنے باپ کو گالی دینا بڑے گناہوں میں سے ہے، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا کوئی اپنے باپ کو بھی گالی دے گا؟ فرمایا ہاں! یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امہ فیسب امہ۔ وہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیگا تو دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے گا۔ بخاری میں اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ان من اکبر الکبائر ان یلعن الرجل والدیہ قیل یا رسول اللہ کیف یلعن الرجل والدیہ قال یسب ابا الرجل فیسب اباہ یسب امہ فیسب امہ۔ دیکھئے! وہ شخص جو کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا قرار دیا گیا۔ گو اس کا مقصد اپنے ماں باپ کو گالی دینا نہیں ہے، مگر جب اس نے گالی کے سبب کو حرکت دے دی اور اس کے وسیلہ کو کھٹکھٹایا۔ تو گویا وہ خود ہی اپنے ماں باپ کا شاتم اور لاعن بن گیا۔

(۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کو قتل کرنے سے باز رہتے تھے۔ گو ان کو قتل کرنے میں بھی مصلحت تھی۔ لیکن اس مصلحت کے مقابلہ میں یہ مفسدہ زیادہ عظیم تھا، کہ اس سے لوگوں میں بددلی پھیلے گی۔ اور وہ کہیں گے کہ محمدؐ تو خود اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ حضور کو اندیشہ ہوا کہ یہ خیالات اگر پھیل گئے تو لوگ اسلام میں داخل ہونے سے رک جائیں گے اور جو نئے نئے داخل ہوئے ہیں وہ کھٹک جائیں گے۔ پس آپ کے نزدیک ترک قتل کے مفسدہ سے تغیر قلوب کا مفسدہ عظیم تر تھا اور مصلحت قتل کے مقابلہ میں مصلحت تالیف قلوب زیادہ وزنی تھی اس لئے آپ نے ایک جائز اور ایک حد تک ضروری فعل کو ترک فرما دیا۔

(۱۰) اللہ تعالےٰ نے شراب کو حرام کیا کیونکہ اس میں بہت سے مفاسد ہیں جو زوال عقل پر مترتب ہوتے ہیں۔ پھر جب شراب کو حرام کر دیا گیا تو اس کا ایک قطرہ پینے کو بھی حرام کر دیا گیا، اُسے گھر میں رکھنے سے بھی منع کر دیا گیا تاکہ ایک قطرہ کا پینا اس رکاوٹ کو دور نہ کر دے جو دل میں شراب کی طرف سے پیدا ہو چکی ہے۔ اور اس کو اپنے پاس کسی جائز مقصد مثلاً تخلیل (سرکہ بنانے) کے لئے رکھنا ایک ناجائز فعل یعنی شرب اور بیع کا ذریعہ نہ بن جائے۔ پھر سدِّ باب ذریعہ میں اور زیادہ مبالغہ کیا گیا شراب کے مرکبات کو ممنوع کیا گیا۔ عصیر پر اگر تین دن گذر جائیں تو اس کے استعمال کو بھی حرام کر دیا گیا۔ ایسے برتنوں میں نبیذ بنانے سے بھی روک دیا گیا۔ جن میں شراب بنائی جاتی ہو یا جن میں نبیذ کے شراب بن جانے کا خدشہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرِ قلیل کی حرمت بیان کرنے کے ساتھ اس کی مصلحت بھی بیان فرما دی۔ کہ اگر میں اس کی اجازت دے دوں تو سُکر کی حد تک پینے کا دروازہ کھل جائے گا۔

(۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے سے منع کر دیا اگرچہ وہ قرآن پڑھنے ہی کے لئے کیوں نہ ہو اور اجنبیہ کے ساتھ سفر کرنے کو بھی منع فرمایا خواہ وہ حج کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی سدِّ باب کے قبیل سے ہے۔

(۱۲) اللہ تعالےٰ نے اجنبی عورتوں کی دید سے باز رہنے کا حکم دیا۔ اگرچہ دیکھنے والے کا مقصود محض اللہ کی صنعت کے محاسن دیکھنا اور خدا کی کاریگری میں تفکر کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی اس لئے ہے کہ اس قسم کی دیدہ بازی کہیں بالقصد یا بلا قصد ایک ناجائز فعل کا ارادہ اور خواہش پیدا کرنے کا سبب نہ بن جائے۔

(۱۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر مسجدیں بنانے سے منع فرمایا۔ اور ایسا کرنے والے پر لعنت کی اور قبروں کو پختہ بنانے اور بلند کرنے سے روکا اور ان کے سامنے یا ان کے قریب نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی اور ان پر چراغ جلانا یا میلے کرنا یا شدّ رحال کر کے ان کی طرف جانا بھی ناجائز قرار دیا اور قبروں کو زمین کے برابر کرنے کا حکم دیا۔

یہ سب اس لیے تھا کہ پچھلی امتوں اور جاہل قوموں کی طرح مسلمان بھی کہیں رفتہ رفتہ اس کو بُت نہ بنالیں اور شرک نہ کرنے لگیں۔ یہ سب افعال جس طرح ان کے لیے حرام ہیں جو شرک اور بت پرستی کا قصد کریں، اسی طرح ان کے لیے بھی حرام ہیں جن کے دل میں ایسا کرنے کا خطرہ تک نہ ہو کیونکہ شارع کا مقصود تو حرام تک لے جانے والے ذریعہ کا سدّ باب ہے۔

(۱۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آفتاب نکلنے اور اس کے غروب ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمادیا اس لیے کہ یہ آفتاب پرستوں کے ہاں سجدہ کے اوقات تھے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اگر ان اوقات میں نماز پڑھے گا تو اس کا مقصد خدا ہی کو سجدہ کرنا ہوگا۔ لیکن اس میں مشرکین کے ساتھ جو مشابہت ہے اس سے شارع کو خدشہ ہوا کہ یہ ظاہری مشابہت آگے چل کر مشارکت کا ذریعہ نہ بن جائے۔ غور کیجیے کہ جب اتنے بعید ذریعہ کا بھی دروازہ بند کیا گیا تو جو ذرائع اس کی بہ نسبت قریب ترین ہیں۔ ان کا دروازہ کیسے کھلا چھوڑ دیا جائے۔

(۱۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں اہل کتاب سے تشبہ کرنے کو منع فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ اپنی ڈاڑھیاں نہیں رنگتے۔ تم ان کے خلاف کرو۔ یہودی جوتیاں پہن کر نماز نہیں پڑھتے۔ تم ان کے خلاف کرو۔ یہودی صرف عاشوریٰ کے دن روزہ رکھتے ہیں تم ان کے خلاف کرو۔ ایک دن اس سے پہلے اور ایک دن اس کے بعد بھی روزہ رکھو۔ نیز فرمایا کہ عجمیوں سے تشبہ نہ کرو اور ترمذی کی روایت ہے کہ آپ نے کہا جس نے ہمارے سوا کسی غیر قوم سے مشابہت کی وہ ہم میں سے نہیں ہے اور امام احمد ابن حنبل کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا "جس نے کسی قوم سے تشبہ کیا۔ وہ اسی قوم سے ہے"۔ اس میں راز یہ ہے کہ ظاہری طریقوں میں مشابہت رفتہ رفتہ قصد اور عمل میں موافقت کا سبب بن جاتی ہے۔

(۱۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے سے منع فرمادیا، فرمایا کہ "اگر ایسا کرو گے تو قطع رحمی کرو گے"۔ اس فعل کی ممانعت

میں اتنا مبالغہ کیا گیا کہ اگر عورت اس پر راضی بھی ہو تب بھی ایسا کرنا جائز نہیں وجہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دی ہے کہ یہ اس قطع رحمی کا ذریعہ بن جائے گا جس کو خدا نے حرام کیا ہے۔

(۱۷) چار بیویوں سے زیادہ کرنے کو حرام کر دیا گیا کیونکہ یہ جور و ظلم کا ذریعہ نہ بن جائے بعض لوگوں نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس سے انسان پر مصارف کا اتنا بار پڑے گا جو اکل حرام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بہر صورت یہ بھی سد باب ذرائع کا قبیل سے ہے اور چار بیویوں کو مباح کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی جور کا خدشہ ہے۔ لیکن اس کی اباحت میں جو مصلحتیں ہیں وہ خدشہ جور کے مفسدہ پر غالب ہیں۔

(۱۸) اللہ تعالےٰ نے زمانۂ عدت میں عورت کو صریحاً نکاح کا پیغام دینے سے منع فرما دیا حتیٰ کہ عدت وفات میں بھی اس کی اجازت نہ دی۔ کیونکہ اگر ایسا کرنے سے نہ روکا جاتا تو خطرہ تھا کہ کوئی اچھا پیغام آنے کی صورت میں عورت جلدی نہ کر بیٹھے اور قبل از وقت عدت پوری ہو جانے کا یقین دلا کر نکاح نہ کرے۔

(۱۹) اللہ تعالےٰ نے زمانۂ عدت میں اور حالت احرام میں عقد نکاح کو حرام کر دیا خواہ یہ قرارداد کر لی گئی ہو کہ وطی عدت گذرنے یا احرام اترنے کے بعد ہو گی۔ یہ اس لئے کہ عقد ہو جانا کہیں وطی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ بخلاف اس کے روزے کی حالت میں عقد کرنے سے نہیں روکا۔ اگرچہ خطرہ اس میں بھی تھا مگر بہت بعید تھا کیونکہ افطار کا وقت دن کے چند گھنٹے گزارنا کچھ ایسا مشکل نہیں کہ انسان بے صبر ہو جائے۔

(۲۰) شارع نے احرام کی حالت میں عطر لگانے سے منع کر دیا کیونکہ خوشبو دواعی شہوت میں سے ہے پس اس کی تحریم بھی سد باب ذریعہ کے قبیل سے ہے۔

(۲۱) شارع نے نکاح کے لئے دوسرے عقود کے مقابلہ میں زائد شرطیں مقرر کیں جن سے نکاح اور سفاح کے درمیان مشابہت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ مثلاً اس کے لئے اعلان کو شرط قرار دیا گیا اور اس کو اظہار کرنے کے لئے دف بجانے اور آواز بلند کرنے اور ولیمہ کی ضیافت کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کا اظہار کرتے

سے کے لیے دف بجانے اور آواز بلند کرنے اور ولیمہ کی ضیافت کرنے کا حکم دیا گیا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو خفیہ نکاح ہونے لگیں جو سفاح بصورت نکاح ہیں اور جن سے عقد نکاح کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ پھر مزید تاکید اس میں یہ کی گئی کہ نکاح کی حرمت قائم کرنے کے لئے عدت کا زمانہ استبرا[1] رحم کی مقدار سے زیادہ رکھا گیا اور اس کے ساتھ حرمت مصاہرت کے احکام دیئے گئے اور منکوحہ عورت کو میراث بنانے سے منع کیا گیا۔ یہ سب چیزیں مجرد استمتاع پر زائد ہیں اور ان سے مقصود یہ ہے۔ کہ نکاح کو سفاح کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

(۲۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص قرض اور بیع کو ایک ہی معاملہ میں جمع کرے۔ حالانکہ اگر ان دونوں میں کسی ایک صورت پر معاملہ کیا جائے تو وہ درست ہے، اور بجائے خود دونوں طریقے حلال ہیں پس دو حلال طریقوں کو یکجا جمع کرنے سے جو روک دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں اس کو سود خواری کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے مثلاً ایک شخص کسی کو ایک ہزار روپیہ قرض دے اور اس کے ہاتھ آٹھ سو روپے کا مال فروخت کرے اس کی قیمت اس دباؤ میں ایک ہزار لگا دے کہ خریدار اس کا قرضدار ہے اس طرح اس نے دیا تو ایک ہزار نقد اور آٹھ سو کا مال، اور وصول کئے دو ہزار۔ یہی معنی ہیں ربوا کے۔ اب غور کرو کہ شارع نے محرمات و ممنوعات کے ذرائع پر کس طرح ہر ہر جانب سے پابندیاں عائد کی ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک ہزار کے عوض ہزار سے اور پانچ سو میں مال دے تو یہ جائز ہے۔ حالانکہ یہ بعینہ[2] وہ چیز ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے اور یہ سود خواری کے قریب ترین ذرائع میں سے ہے۔ جو شخص ذریعہ کا دروازہ بند نہیں کرتا اسے چاہیئے کہ نصوص کی مخالفت کرے اور ذریعہ

---

[1] واضح ہو کہ استبراء رحم کے لئے صرف ایک حیض آجانا کافی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔

[2] بیع العینہ یہ ہے کہ کسی مال کو قرض دینے کی صورت میں اس کی قیمت زیادہ کر دی جائے مثلاً جو چیز نقد ایک روپیہ میں فروخت کی جاتی ہو۔ اسکی قیمت قرض کی صورت میں ایک روپیہ ایک آنہ لگائی جائے۔

کو جائز کر دے، ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان کسی ممنوع فعل کا تارک بھی ہو اور ہر صورت سے اس کے نظائر کا ارتکاب بھی کرتا چلا جائے۔

(۲۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے بیع العینہ کی تحریم پر صریح آثار منقول ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فروخت کنندہ کے پاس اصل قیمت پر مال کے واپس آجانے کا امکان ہے اگرچہ دونوں کے درمیان ربوا کا معاملہ باقاعدہ طے نہ ہوا ہو۔ اس کا مقصد ربوا ہی کا سد باب ہے۔

(۲۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو قرضدار سے ہدیہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی، اسی طرح صحابہ نے بھی اس سے روکا۔ ظاہر ہے کہ ہدیہ ناجائز نہیں۔ مگر اس میں خدشہ ہے کہ ہدیہ دے کر قرضدار مہلت قرض میں اضافہ چاہے گا۔ اور قرضدار اس کے ہدیہ کی وجہ سے مہلت دینے پر راضی ہو جائے گا۔ اس طرح ہدیہ خود بخود سود بن جا گا، کیونکہ قرض خواہ کو اس کا راس المال بھی واپس ملا اور اضافہ مہلت کے معاوضہ میں ہدیہ بھی مل گیا۔ پس شارع نے ایک جائز فعل سے محض اس لئے روک دیا کہ وہ بلا ارادہ یا بالارادہ سود خواری کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۲۵) حاکم اور قاضی اور سفارش کرنے والے کو بھی قبول کرنے ہدیہ سے منع کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہدیہ فساد معاملات کی جڑ ہے۔ اہم امور کو غیر اہل کے سپرد کرنا، اور خائنوں کو عہدے دینا، اور ناکارہ لوگوں کو ذمہ داری کی جگہوں پر مامور کرنا، یہ سب کچھ انہی ہدیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور ان سے اتنے فسادات پیدا ہوتے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا جب کوئی شخص کسی ایسے شخص کا ہدیہ قبول کرتا ہے جس کے ساتھ اس کے کوئی ایسے گہرے روابط نہ ہوں جن کی بنا پر دونوں کے درمیان ہدایا کا مبادلہ ہوتا رہتا ہو، تو لامحالہ یہ اسی لئے ہوتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ناروا رعایت کرے گو اس کو لالچ نہ ہو، تب بھی یہ خواہش پیدا ہو گی کہ اس ہدیہ کے بدلہ میں اس کی کوئی غرض پوری کرے

(۲۶) سنت نبوی یہ ہے کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے وہ مقتول کی میراث نہیں پا سکتا یہ اس لئے ہے کہ قاتل کو وراثت دلوانا کہیں قتل کی ترغیب کا ذریعہ نہ بن جائے، اور کوئی

شخص محض کسی کی میراث جلدی پانے کے لیے قتل کا ارتکاب نہ کرے۔ اس مصلحت کو پیش نظر رکھ کر عام قاعدہ یہ بتایا گیا کہ قاتل کو کسی حال میں میراث نہ ملے گی۔ خواہ قتل سے اس کی نیت میراث حاصل کرنے کی ہو یا نہ ہو۔ یہ حکم بھی سد باب ذریعہ کے قبیل سے ہے۔

(۲۷) مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین کا قاعدہ یہ تھا۔ کہ جس عورت کو حالت مرض میں طلاق بائن دی جاتی اس کو وہ میراث دلواتے تھے، کیونکہ اس حالت کی طلاق میں اس شبہ کی گنجائش تھی کہ شاید اس سے مقصد عورت کو ورثہ سے محروم کرنا ہو لیکن انہوں نے عام قاعدہ ہی بنا لیا کہ خواہ عورت کو محروم کرنا مقصود ہو یا نہ ہو، بہر حال وہ ایسی مطلقہ کو میراث دلائیں گے تاکہ طلاق کو اس ظلم کے لئے ذریعہ نہ بنایا جائے جس جگہ ایسے شبہ کی گنجائش نہ ہو وہاں بھی اس عام قاعدہ میں استثنا نہیں کیا گیا کیونکہ وہ باب ذریعہ کو بالکلیہ بند کرنا چاہتے تھے، اور بعض کا خیال یہ بھی تھا کہ جب مرض الموت کی حالت شروع ہو گئی تو شوہر کے مال میں عورت کا حق واجب ہو گیا اور اس حق کو قطع کرنا ممکن نہیں۔ اس مسئلہ میں جو اختلاف ہوا ہے وہ سابقین کے اجماع سے متاخر ہے۔

(۲۸) صحابہ اور عامۃ فقہاء کا بالاتفاق یہ فتویٰ ہے کہ ایک شخص کو اگر چند آدمیوں نے مل کر قتل کیا ہو تو سب سے قصاص لیا جائے گا، اگرچہ یہ بات اصول قصاص کے خلاف ہے، لیکن یہ فتویٰ اس لئے دیا گیا کہ کہیں عدم قصاص، خونریزی میں تعاون کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۲۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت جنگ میں سارق کا ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا۔ محض اس لئے کہ حد کا خوف کہیں سارق کو کفار سے جا ملنے پر آمادہ نہ کر دے۔ اسی بنا پر حالت جنگ میں اقامت حدود موقوف رکھنے کا عام قاعدہ جاری ہوا۔

(۳۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان سے ایک دن یا دو دن قبل روزہ رکھنے کی ممانعت فرما دی الا یہ کہ کسی شخص کو کسی خاص دن روزہ رکھنے کی عادت ہو اور اتفاق سے وہ دن رمضان سے متصل آجائے اسی طرح حضور نے یوم الشک کے روزے سے بھی منع فرمایا۔ اس میں

مصلحت یہ تھی کہ یہ فرض اور غیر فرض کی تمیز اُٹھ جانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ اور لوگ فرائض کے ساتھ خود اپنی اختراع سے غیر فرائض کو ملحق نہ کرنے لگیں۔ اسی طرح حضور نے یوم عید کا روزہ حرام کر دیا کہ وقت عبادت اور غیر وقت عبادت کی تمیز باقی رہے اور لوگ اپنی طرف سے فرائض میں اضافہ نہ کرنے لگیں۔ جیسے کہ نصاریٰ اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس باب میں شارع نے بہت احتیاطیں کی ہیں۔ مثلاً افطار میں تعجیل اور سحر میں تاخیر کا حکم دیا تاکہ لوگ روزہ کی مقدار مقررہ میں بطور خود اضافہ نہ کریں۔

عید کے روز نماز سے پہلے افطار میں جلدی کرنے کا استحباب بھی اس لئے ہے۔ نیز آپ نے حکم دیا کہ فرض نماز اور نفل نماز میں فرق کیا جائے اور امام کے لئے اس فعل کو مکروہ قرار دیا کہ وہ اپنے مصلے پر سنن و نوافل ادا کرے۔ حتیٰ کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کے قبلہ رو بیٹھے رہنے کو بھی ناپسند فرمایا۔ یہ تمام احکام اسی لئے ہیں کہ شارع زیادت فی الفرض کے چھوٹے سے چھوٹے ذریعہ کا بھی سد باب کرنا چاہتا ہے

(۳۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ کسی ایسی چیز کو نماز کے وقت سامنے نہ رہنے دیا جائے جس کی عبادت مشرک قوموں میں رائج ہو حتیٰ کہ آپ نے اس کو بھی ناپسند فرمایا کہ نماز کے وقت کسی لکڑی یا ستون یا درخت وغیرہ کی طرف رخ کیا جائے۔

آپ کی ہدایت یہ ہے کہ کوئی چیز ایسی سامنے ہو تو اس سے ذرا سا رخ پھیر کر کھڑا ہو تاکہ ٹھیک وہ سامنے نہ رہے۔ یہ سب اس لئے تھا کہ سجود لغیر اللہ کے ساتھ تشبہ کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۳۲) آپ نے شفعہ کو مشروع فرمایا اور شریک کو یہ حق دیا کہ وہ خریدار کے ہاتھ سے براہ راست اپنا حق لے لے اس سے مقصود ان جھگڑوں کا سد باب تھا جو شرکت اور شرکت اور تقسیم میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۳۳) حاکم کو منع کیا گیا ہے کہ وہ فریقین میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اونچی جگہ دے یا ایک فریق کی طرف زیادہ متوجہ ہو، یا اس سے مشاورت کرے یا اس کے لئے تعظیماً کھڑا ہو۔ مقصود یہ ہے کہ حاکم کا یہ طرز عمل کہیں فریق ثانی کو مایوس

اور دل شکستہ نہ کردے، اور ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے مخالف کو حاکم کے پاس زیادہ با اثر پاکر اپنی حجت پوری قوت کے ساتھ پیش نہ کرسکے اور یہ بے انصافی کا ذریعہ بن جائے۔

(۳۴) حاکم کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرنے سے منع کر دیا گیا تاکہ یہ بھی بے انصافی کا ذریعہ نہ بن جائے اور ایسا نہ ہو کہ حاکم غلط فیصلے کرنے لگیں اور بہانہ یہ کریں کہ ہم اپنے ذاتی علم کی بنا پر ایسا فیصلہ کر رہے ہیں۔

(۳۵) شریعت نے کسی شخص کے مقابلہ میں اس کے دشمن کی شہادت قبول کرنے سے منع کر دیا، خواہ وہ کیسا ہی سچا آدمی ہو شاہد کے صادق یا غیر صادق ہونے کا لحاظ کئے بغیر یہ عام قاعدہ اسی لئے بنایا گیا ہے کہ دشمنی کی بنا پر باطل شہادت دینے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔

(۳۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کو باواز بلند پڑھنے سے روک دیا۔ تاکہ یہ کفار میں جہالت کا جوش پیدا کرنے اور ان کی زبان سے قرآن اور اللہ تعالیٰ اور جبرئیلؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالی نکلوانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۳۷) اللہ تعالیٰ نے گناہ کے بعد توبہ کرنے والے کو ایسا قرار دیا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں، جو شخص توبۃ النصوح کے بعد خدا کے سامنے حاضر ہوگا اس کو اس گناہ پر عذاب نہ دیا جائے گا جس سے وہ توبہ کر چکا ہے مگر احکام دنیا کا حال اس سے مختلف ہے، اگر کوئی شخص کوئی ایسا جرم کرے جس کے لئے شرعی سزا مقرر ہو اور پھر گرفتاری کے بعد توبہ کرنے لگے تو یہ اس کو سزا سے نہ بچائیگی خواہ وہ اس کی توبہ توبۃ النصوح کیوں نہ ہو یہ اس لئے کہ کہیں توبہ کو تعطیل حدود اللہ کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ ہاں اگر وہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی سچی توبہ کر چکا ہو تو اصح قول علماء یہ ہے کہ اس پر سے حد ساقط ہو جائے گی۔

ترجمان القرآن شوال سنہ ۱۳۵۵ ہجری

(۳۸) شارع نے جمعہ اور عیدین اور استسقاء اور صلوٰۃ خوف میں ایک ہی امام کے تحت جمع ہونے کا حکم دیا۔ باوجودیکہ صلوٰۃ خوف میں دو اماموں کے پیچھے الگ الگ جمع ہونا جنگی ضروریات کے لحاظ سے زیادہ قرین مصلحت تھا، مگر شارع نے ایک ہی امام کے پیچھے نماز ادا کرنے پر زور دیا۔ محض اس لیے تھا کہ تفرق اور اختلاف اور تنازع کا سدِّ باب ہو اور اجتماع قلوب اور وحدت اور اتفاق کی صورتیں پیدا ہوں یہ چیز شریعت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے اور اس نے ہر ممکن طریقہ سے اس مقصد کو نقصان پہونچانے والے ذرائع کی روک تھام کی ہے حتیٰ کہ نماز میں صفیں برابر کرنے کی تاکید بھی اسی لیے ہے کہ دلوں میں انتشار و اختلاف نہ پیدا ہو اس کے شواہد اتنے کثیر ہیں کہ یہاں سب کو بیان نہیں کیا جاسکتا

(۳۹) سنت یہ ہے کہ رجب کے مہینے یا جمعہ کے دن[1] کو روزے کے لیے مخصوص کر لینا مکروہ ہے اسی طرح شب جمعہ کو قیام کے لیے مخصوص کرنا بھی مکروہ قرار دیا گیا ہے اس میں مصلحت ہے کہ لوگ کسی ایسی چیز کو اپنے لئے شرع

---

[1] سچی توبہ کی علامت یہ ہے کہ توبہ کے بعد پھر اس نے جرم کا اعادہ نہ کیا ہو اور مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ بالفرض ایک شخص پہلے جرم کرتا تھا۔ پھر اس نے توبہ کر لی اور جرم کرنا چھوڑ دیا اور ثابت ہو گیا کہ اس نے نیک زندگی اختیار کر لی ہے تو اب اس کو پرانے جرم کی بنا پر گرفتار کرنا اور سزا دینا درست نہیں۔ یہ اس لئے کہ کہیں تعزیر میں اتنا مبالغہ لوگوں کو جرائم میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ جب ایک دفعہ جرم کرنے کے بعد ایک شخص کو یقین ہو کہ اب میں ہر حال سزا کا مستوجب ہی ہو چکا ہوں اور سزا سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ لاؤ اب دل کھول کر ہی کیوں نہ جرم کریں +

نہ بنا لیں جس کو اللہ نے مشروع نہیں کیا ہے اگر خدا کے حکم کے بغیر لوگ کسی مخصوص وقت یا زمانہ کی عبادت کو لازم کرنے لگیں تو اس سے انہی خرابیوں کا دروازہ کھلتا ہے جن میں اہل کتاب مبتلا ہوئے۔

(۴۰) اہل ذمہ پر جو قیود عائد کی گئی ہیں وہ سب اس غرض کے لیے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان لباس اور وضع قطع اور سواری وغیرہ میں تمیز ہو مقصد یہ تھا کہ ظاہری مشابہت کی وجہ سے مسلمان اور غیر مسلم خلط ملط نہ ہو جائیں اور ایسا نہ ہو کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کا سا معاملہ ہونے لگے۔ اسی فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے تمیز قائم رکھنے پر زور دیا گیا۔

(۴۱) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جب ناجیہ بن کعب الاسلمی کے ساتھ بیت اللہ کی طرف ہدی کے اونٹ روانہ کئے تو فرمایا کہ اگر ان اونٹوں میں سے کوئی اپنے مقام تک پہنچنے سے پہلے بیکار ہو جائے تو اس کو ذبح کر کے اس کے خون سے اس جوتی[1] کو رنگ دینا جو اس کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے، اور اس کو لوگوں کے لئے چھوڑ دینا۔ تم خود یا تمہارے رفقا میں سے کوئی اس اونٹ کا گوشت نہ کھائے اس کی مصلحت یہ بیان کی گئی کہ اگر مقام مقصود کو پہنچنے سے پہلے ان لوگوں کو ہدیہ کے اونٹوں کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی جاتی تو ممکن تھا کہ وہ ان کی حفاظت اور ان کو چارہ پانی دینے میں غفلت کرتے، اور انہیں کھا جانے کے لئے ایک بہانہ پیدا کر لیتے۔ لہذا مقام مقصود کو پہنچنے سے پہلے ان اونٹوں کا گوشت کھانا ان لوگوں کے لئے حرام کر دیا گیا درانحالیکہ وہ دوسروں کے لئے حلال تھا۔ غرض یہ تھی کہ جب یہ لوگ اپنے لئے انتفاع کا دروازہ بند پائیں گے تو اونٹوں کی حفاظت کریں گے۔ اور اپنی حد تک انہیں سلامتی کے ساتھ

---

[1] عرب میں قاعدہ تھا کہ سفر کے موقع پر اونٹ کے گلے میں جوتی باندھ کر لٹکا دیتے تھے اور یہ گویا عزم سفر کی علامت ہوتی تھی اس رسم کے لحاظ سے اسلام میں بھی جب کعبہ کی طرف ہدی کے اونٹ روانہ کئے جاتے تو ان کے گلے میں جوتی باندھ دی جاتی۔

منزل مقصود کو پہنچانے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ یہ سد باب ذریعہ کا ایک نہایت لطیف طریقہ ہے جس سے شارع کے طریق تشریع پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

(۴۲) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جو شخص کوئی چیز پڑی پائے وہ اس پر کسی کو گواہ کرے حالانکہ ایسا شخص امین ہی ہوگا۔ مگر اس پر گواہ کرنے کو ضروری قرار دیا گیا۔ تاکہ طمع اور اخفا کا سد باب ہو جائے۔ ممکن ہے کہ چیز اٹھاتے وقت اس کی نیت درست ہو اور بعد میں یہ دیکھ کر کہ کوئی اس راز سے واقف تو ہے نہیں۔ اس کی نیت میں فساد آ جائے۔ پس وہ جلدی کرکے کسی کو اس پر گواہ کرے گا تو لالچ اور اخفاء کا خطرہ جاتا رہیگا یہ بھی سد باب ذریعہ کی لطیف ترین تدبیروں میں سے ہے۔

(۴۳) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ماشاء اللہ وشاء محمد کہنے سے منع فرمایا اور اس خطیب کی مذمت کی جس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ سیدھے رستے پر ہوگا اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا وہ بھٹک جائے گا" یہ ممانعت محض اس غرض سے تھی کہ کہیں تشریک لفظی سے تشریک معنوی تک نوبت نہ پہنچ جائے اللہ کے رسول کا مقصد شرک کی جڑ ہی کاٹ دینا تھا۔ اس لئے آپ نے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے بھی منع فرمادیا جن سے شرک کی بو آتی ہو جس شخص نے ماشاء اللہ و رسولہ کہا تھا اس سے آپ نے فرمایا کہ تو مجھے خدا کا شریک ٹھیراتا ہے؟ گو اس کا قصد ایسا نہ تھا مگر درود وسلام ہو اللہ کے نبی پر کہ آپ نے لفظ میں بھی شرک کو جائز نہ رکھا تاکہ وہ فعل اور قصد میں شرک کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۴۴) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مشابہت کفار کے ذریعہ کا سد باب ہو اور کہیں مسلمانوں کا بھی وہی حال نہ ہو جائے کہ ان کے سردار بیٹھے ہیں اور وہ ان کے سامنے کھڑے رہا کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حکم تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور اس کی علت بھی خود آپ ہی نے بیان فرمائی ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ کوئی روایت اس کی ناسخ نہیں آئی۔

(۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت نماز پڑھنے والے کو حکم دیا کہ جب وہ اونگھنے لگے تو نماز چھوڑ کر سو جائے۔ فرمایا کہ اس حال میں نماز پڑھے گا تو ممکن ہے کہ وہ استغفار کرنے جائے اور اپنے حق میں برا کہنے لگے۔ لہذا اس کو سونے کا حکم دے دیا تاکہ اس کی نماز یاوہ گوئی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۴۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی منگنی پر منگنی کا پیغام بھیجے۔ یا اس کی بولی پر بولی دے یا اس کی بیع پر بیع کرے اس سے مقصود یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلے کہیں مسلمانوں میں آپس کے بغض و حسد اور دشمنی کے اسباب نہ بن جائیں ہیں یہ احکام صرف انہی تین معاملات کے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ مناصب اور عہدوں اور ملازمتوں میں ایک دوسرے کے خلاف جد و جہد کرنا بھی ناجائز ہے۔ اور تمام ایسے مقابلے ممنوع ہیں۔ جو ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان عداوت اور بغض پیدا کرنے والے ہوں۔

(۴۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوراخوں میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ یہ فعل کسی اذیت کا سبب نہ بن جائے۔ ممکن ہے کہ سوراخ کسی موذی جانور کا بل ہو اور وہ نکل کر کاٹ لے۔

(۴۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راستوں پر اور سایہ کی جگہوں اور آب کشی کے مقامات پر بول و براز کرنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرما دی کہ لعنت کے بلانے کے "تین طریقوں سے بچو"۔ ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "دو لعنت کرنے والوں سے بچو"۔ لوگوں نے عرض کیا کہ وہ لعنت کرنے والے کون ہیں۔ فرمایا وہ جو لوگوں کے راستوں پر اور ان کی پناہ لینے کی جگہوں پر بول و براز کرتے اور ان کی زبان سے لعنت کے الفاظ نکلواتے ہیں۔

(۴۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جب تک میں نماز کے لئے نکل نہ آؤں کھڑے نہ ہوا کریں مقصد یہ تھا کہ نماز سے پہلے آپ کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہوتے کہیں قیام لغیر اللہ کی رسم نہ پڑ جائے اگرچہ اس وقت لوگ صرف نماز کے

لئے کھڑے ہوتے تھے۔ مگر امام کے نکلنے سے پہلے قیام کرنا ایک فساد کا ذریعہ تھا اور اس میں فائدہ کچھ نہ تھا۔

(۵۰) حضورؐ نے نماز جمعہ سے متصل ہی کوئی نماز پڑھنے کی ممانعت فرمادی اور نماز جمعہ کے بعد دوسری کوئی نماز پڑھنے سے پہلے کوئی بات کرنا یا مسجد سے نکل آنا ضروری قرار دیا تاکہ یہ زیادت فی الفرض کا ذریعہ نہ بن جائے۔ سائب بن یزید کی روایت ہے کہ میں نے مقصورہ میں جمعہ کی نماز پڑھی اور جب امام نے سلام پھیرا تو میں نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر پھر دوسری نماز شروع کر دی۔ اس کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا اور کہا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ نماز جمعہ کے بعد تاوقتیکہ کوئی بات نہ کر دیا مسجد سے نکل نہ جاؤ دوسری نماز نہ پڑھا کرو۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم فرمایا ہے۔

(۵۱) جس شخص نے اپنے گھر میں نماز پڑھ لی ہو، پھر مسجد میں آئے اور دیکھے کہ جماعت ہو رہی ہے تو اس کو حکم ہے کہ جماعت میں شریک ہو جائے یہ اس لئے کہ اس کے نماز میں شریک نہ ہونے سے یا تو یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتا یا نماز نہ پڑھنے والوں کے لئے یہ ایک پردہ بن جاتا ہے۔

(۵۲) نماز عشاء کے بعد آنحضرتؐ نے بات چیت میں لگ جانے یا جاگتے رہنے کو منع فرمادیا۔ آپ نماز عشاء سے پہلے سونے کو بھی ناپسند فرماتے تھے اور اس کے بعد بات چیت میں لگ جانے کو بھی اس لئے کہ پہلے سو جانا نماز کے فوت ہو جانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور بعد میں باتیں کرنا قیام لیل اور نماز صبح کے فوت ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ البتہ اگر اس مصلحت سے زیادہ کوئی بڑی مصلحت ہو تو جائز ہے مثلاً علمی خدمت میں مشغول ہو یا مسلمانوں کے مصالح سے متعلق کوئی کام ہو۔

(۵۳) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حکم دیا کہ جب جماعت میں شریک ہوں۔ تو مردوں کے سر اٹھانے سے پہلے سجدہ سے نہ اٹھیں اور وجہ خود ہی بیان فرمائی کہ کہیں ان کی نظر مردوں کی شرمگاہوں میں نہ پڑے۔

(۵۴) آپؐ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے پاس والی مسجد کو چھوڑ کر دور کی

مسجد تک جانے۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے پاس والی مسجد میں جائے اور اس سے گزر کر دوسری مسجد میں نہ جائے۔ یہ اس لئے کہ ایسا کرنا کسی مسجد کو ویران چھوڑ دینے اور اس مسجد کے امام کی بددلی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ ہاں مسجد کا امام اگر نماز پوری طرح ادا نہ کرتا ہو، یا بد عادات کا ارتکاب کرتا ہو یا علانیہ فجور کا مرتکب ہو تو اس کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں چلا جانا جائز ہے

(۵۵) آپؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اذان کے بعد مسجد سے نماز پڑھے بغیر نہ نکلیں۔ یہ اس لئے کہ ان کا نکل جانا جماعت سے غفلت کا سبب نہ بن جائے۔ حضرت عمار نے ایک شخص کو اذان کے بعد مسجد سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس نے ابوالقاسمؐ کی نافرمانی کی۔

(۵۶) حضورؐ نے جمعہ کے وقت مسجد میں ٹیک لگا کر بیٹھنے اور رومال سے گھٹنے اور کمر باندھ کر بیٹھنے کی ممانعت فرمادی جیسا کہ مسند امام احمد میں سہل بن معاذؓ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا کرنا نیند آجانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

(۵۷) حضورؐ نے عورتوں کو خوشبو لگا کر اور بخور استعمال کر کے اور مزین ہو کر مسجد میں آنے کی ممانعت فرمادی۔ یہ اس لئے کہ یہ سب چیزیں مردوں کے جذبات کو بھڑکانے والی اور ان کی طرف مائل کرنے والی ہیں۔ آپ نے اسی فساد کا سد باب کرنے کے لئے عورتوں کو حکم دیا کہ جب آئیں تو بالکل سادہ لباس میں بغیر کسی خوشبو اور زینت کے آئیں اور مردوں کے پیچھے کھڑی ہوں، اور اگر نماز میں کسی بات پر متنبہ کرنا ہو تو سبحان اللہ نہ کہیں بلکہ ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی پشت پر ماریں۔ یہ سب احکام سدّ باب ذریعہ کے قبیل سے ہیں۔

(۵۸) آپؐ نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنے شوہر سے کسی غیر عورت کی صفت اس طرح نہ کرے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اس سے بھی مفاسد کا سد باب مقصود تھا کہ بسا کیں دولت از گفتار خیزد۔

(۵۹) آپؐ نے لوگوں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع فرمادیا کہ یہ نظر بازی اور محارم کی تاک جھانک اور شہدپن کا ذریعہ نہ بن جائے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کبھی ایسا کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ فرمایا راستہ کو اس کا حق ادا کرو۔ پوچھا راستہ کا حق کیا ہے۔ فرمایا نظریں نیچی رکھو، راہ گیروں کو تکلیف دینے سے باز رہو۔ اور سلام کا جواب دو۔

(۶۰) آپؐ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ ایک مکان میں رات گزارے الا یہ کہ وہ اس کا شوہر یا محرم ذی رحم ہو۔ یہ اس لئے کہ کہیں اجنبیہ کے ہاں رات گزارنا حرام میں مبتلا ہونے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۶۱) آپ نے حکم دیا کہ جو چیز کسی مقام پر خریدی گئی ہو اس کو اسی جگہ فروخت نہ کیا جائے۔ فروخت کرنے سے پہلے اس کو وہاں سے منتقل کردینا چاہیئے۔ یہ اس لئے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ممکن ہے کہ پہلا بائع دوسرے بائع کو نفع کماتے دیکھ کر اپنی بیع منسوخ کردے اور مال واپس لے کر نئے خریدار سے معاملہ کرنے پر آمادہ ہوجائے اس حکم کو اس قاعدہ کلیہ سے موکد کیا گیا کہ جب انسان کسی چیز کے نقصان کا ذمہ دار نہ ہو اس سے نفع کمانے کا حق نہیں رکھتا۔

(۶۲) آپؐ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا۔ ایک حدیث میں ایسی بیع کو ممنوع کہا گیا ہے جس میں دو شرطیں ہوں اور ان میں سے ناقص ترین شرط کسی ایک فریق کی طرف عائد ہوتی ہو تیسری حدیث میں اس کو ربوٰ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی ممانعت ربا ہی کے سدباب کے لئے ہے۔ مثلاً بائع نے اپنا مال خریدار کے ہاتھ سو روپے میں فروخت کیا اور ادائے قیمت کے لئے مہلت دی۔ پھر وہی مال اس سے دو سو روپے میں خریدا۔ یہ ایک بیع میں دو بیعیں ہوئیں۔ لینے والا جو رقم زائد لیگا وہ سود ہوگی۔ اسی طرح اگر بائع نے مال سو روپے میں قرض فروخت کیا تھا۔ پھر اسی مشتری سے ۵۰ روپے میں اس کو خرید لیا اور باقی پچاس اس پر قرض رکھے تو یہ بھی سود ہوگا اور یہ طریقہ سودخواری کے بڑے ذرائع میں سے ہے اس حدیث کو ایسی بیع پر محمول کرنا درست نہیں جس میں بائع نے خریدار کو یہ اختیار دیا ہو کہ خواہ پچاس

میں نقد خریدے خواہ سو میں قرض خریدے۔ ایسی بیع میں نہ ربا ہے۔ نہ دھوکا ہے۔ نہ مجہولیت ہے، نہ قمار ہے اور نہ مفاسد میں سے کوئی اور مفسدہ ہے۔ کیونکہ اس نے تو خریدار کو یہ اختیار دیا ہے اور دونوں قیمتوں میں سے جو قیمت چاہے قبول کرے۔ اس قسم کا اختیار جس بیع میں دیا گیا ہو اس کی نوعیت اس بیع سے مختلف نہیں جس میں بیع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد خریدار کو تین دن کی مہلت دی جاتی ہے کہ خواہ مال رکھ لے خواہ واپس کر دے۔

(۶۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کو الگ الگ بستروں پر سلانے کا حکم دیا۔ اور لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ سلانے کی خاص طور پر ممانعت فرمائی ہے۔ یہ بھی سد باب ذرائع کی لطیف تدابیر میں سے ہے۔

(۶۴) حضور نے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے حق میں خبثت نفسی (میرا نفس خبیث ہوا) کے الفاظ استعمال کرے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ایسے مواقع پر نفسی (میرا نفس بگڑ گیا) کہا کرو۔ مدعا یہ ہے کہ لوگوں کو بیہودہ الفاظ استعمال کرنے کی عادت نہ پڑے، کیونکہ الفاظ اور معانی میں جو مناسبت ہے ان کی بنا پر بڑے الفاظ استعمال کرتے کرتے ان کے معانی بھی نفس میں اثر کر جاتے ہیں اور اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ جو شخص کسی برے لفظ کا خوگر ہو جاتا ہے اس کے اوپر رفتہ رفتہ اس لفظ کی روح مسلط ہو جاتی ہے پس نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے خبث لفظی سے منع کر کے خبث معنوی کا دروازہ بند کرنا چاہا ہے۔

(۶۵) حضور نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے غلام اور لونڈی کو عبدی وامتی (میرا بندہ یا میری بندی) نہ کہے بلکہ فتای (میرا چھوکرا یا میری چھوکری) کہا کرے اسی طرح آپ نے لونڈی غلاموں کی نسبت سے آقا کے لئے رب کا لفظ استعمال کرنے کی بھی ممانعت فرما دی۔ اگرچہ رب کے معنی مالک کے بھی ہیں جیسے رب الدار (گھر کا مالک) اور رب الابل اونٹ کا مالک لیکن انسان کے مقابلہ میں انسان کے لئے عبد اور رب کے الفاظ استعمال کرنے سے مشترک فی اللفظ ہوتے ہوتے مشترک فی المعنی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے

لہذا آپ نے لونڈی غلاموں کے لئے عبد اور اَمَۃ کے الفاظ کو فتیٰ اور فتاۃ سے بدل دیا۔ اور آقا کے لیے ربّ کے بجائے سیّد کا لفظ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی۔

(۶۶) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عورت کو کسی محرم کے بغیر سفر کرنے سے منع فرمایا۔ اس سے بھی ذرائع فساد کا سدِ باب کرنا مقصود ہے۔

(۶۷) حضور نے فرمایا کہ اہل کتاب جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔ اس لئے کہ ان کی تصدیق باطل کا ذریعہ بن جائے اور ان کی تکذیب ممکن ہے کہ تکذیب حق کا سبب ہو جائے۔

(۶۸) حضورؐ نے غلاموں کے نام افلح اور نافع اور رباح اور یسار رکھنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ یہ الفاظ ایسے شگون لینے کے ذرائع بن سکتے ہیں۔ جو ناجائز ہیں اگرچہ افلح اور نافع وغیرہ سے یہاں لفظی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ غلام کا نام ہی مراد ہوتا ہے لیکن یہ الفاظ مکروہ معانی و مقاصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے مکروہ قرار دیئے گئے۔

(۶۹) حضورؐ نے مردوں کو تنہائی میں اور شوہروں کی غیبت میں عورتوں کے پاس جانے سے منع فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی مفاسد کے سدِ باب کی خاطر ہے۔

(۷۰) حضورؐ نے برّہ نام رکھنے سے منع فرمایا اس لئے کہ ایسا نام خود ستائی اور اپنی بزرگی آپ ظاہر کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اس سے محض تسمیہ مقصود ہوتا ہے۔

(۷۱) حضورؐ نے شراب کو دواءً استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی اگرچہ علاج کی مصلحت استعمال شراب کے مفسدہ سے بڑھ کر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ شراب نوشی کی طرف رغبت پیدا ہونے اور اس کی نفرت دل سے نکل جانے کے جتنے اسباب ممکن ہیں شریعت ان سب کا سدِ باب کرنا چاہتی ہے۔ لہذا اس نے مادۂ مے نوشی کا قطعی استیصال کر دیا حتیٰ کہ دوا کے لئے بھی شراب استعمال کرنے کی اجازت نہ دی۔

(۷۲) حضورؐ نے اس سے منع کیا کہ تیسرے شخص کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں کھسر پھسر کریں۔ یہ اس لئے کہ ایسا کرنا دوسروں کی دل شکنی کا سبب ہے اور اس سے

آپس میں بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۷۳) اللہ تعالےٰ نے ایسے شخص کے لیئے لونڈی سے نکاح کرنا ممنوع کردیا۔ جو آزاد عورت سے نکاح کرنے پر قادر ہو، بجز اس حالت کے کہ آدمی تنگدست ہو یہ اس لئے کہ لونڈی سے نکاح کرنا اپنی اولاد کو کنیز زادگی کا داغ لگاتا ہے۔ پھر جب اس فعل سے منع کیا گیا تو ایسی لونڈی سے بھی نکاح کرنے کی اجازت نہ دی گئی جو آئسہ ہو چکی ہو اور جسے حمل و ولادت کی امید نہ رہی ہو۔ کیونکہ جس چیز کی ممانعت کی جاتی ہے اس کے ذرائع کا دروازہ کھولنا شریعت کے اصول کے خلاف ہے اسی مصلحت کی بنا پر امام احمدؒ نے اسیر اور تاجر کو دارالحرب میں نکاح کرنے سے منع کیا ہے تاکہ اس کی اولاد غلامی کے خطرے میں مبتلا نہ ہو۔ انہوں نے ایک دوسری وجہ بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ شاید دارالحرب میں وہ شخص اپنی بیوی کی عصمت بچانے پر قادر نہ ہوسکے۔

(۷۴) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی مریض آدمی کو تندرست آدمی کے پاس لے جانے سے منع فرمایا۔ اس لیے کہ ایسا کرنا یا تو اس تندرست کو بھی بیماری میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جاتے گا یا وہم اور خوف کی وجہ سے اس کے لیئے سبب اذیت ہوگا۔

(۷۵) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دیار ثمود میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اِلّا یہ کہ روتے ہوئے جائیں یہ اس لئے کہ وہ ایک معذب قوم کا مقام تھا اندیشہ تھا کہ وہاں فرحان و شاداں جانا کسی آفت میں مبتلا ہو جانے کا سبب نہ بن جائے۔

(۷۶) حضورؐ نے انسان کو کسی ایسے شخص پر نظر رکھنے سے منع کیا جو اس سے زیادہ مالدار ہو اور اس سے بہترین لباس پہنے ہوئے ہو اس لئے کہ اللہ نے جو نعمت خود اس کو دے رکھی ہے کہیں وہ اس کو نہ سمجھنے لگے اور یہ اس کے لئے ذریعہ ہلاکت بن جائے۔

(۷۷) حضورؐ نے گھوڑیوں پر گدھے ڈالنے کی ممانعت فرمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ گھوڑوں کی نسل قطع کرنے اور گھوڑوں کی تعداد کم ہونے کا ذریعہ ہے اور

اگر یہ حدیث صحیح ہے کہ آپؐ نے گھوڑے کا گوشت کھانے سے منع کیا۔ تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ گھوڑوں کی تعداد کم ہونے سے ان مصالح کو نقصان پہنچ سہے۔ جو غذا سے زیادہ اہم ہیں بعض غزوات میں آپؐ نے لوگوں کو گھوڑوں کی پیٹھوں پر ضرب لگانے سے منع کیا کہ وہ بیکار نہ ہو جائیں۔

(۷۸) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے برا خواب دیکھنے والوں کو اپنے خواب کا ذکر کرنے سے منع کیا۔ کیونکہ یہ کہیں اس خواب کے مرتبہ وجود لفظی سے وجود خارجی میں منتقل ہونے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ یہ سد ذرائع کی ایک لطیف ترین مثال ہے۔ غور کرو تو معلوم ہو گا کہ عموماً برائیاں درجات ظہور میں طبقاً بعد طبق منتقل ہوتی ہیں۔ پہلے وجود ذہنی ہوتا ہے۔ پھر وہ بیان میں منتقل ہو جاتا ہے اور آخر کار اس کا ظہور خارج میں ہو جاتا ہے۔

(۷۹) حضورؐ سے پوچھا گیا کہ شراب سے سرکہ بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ حالانکہ آپ نے ایسے سرکہ کی اجازت دے دی تھی جو خمر سے بلا تخلیل حاصل ہوا ہو۔ پس تخلیل کی ممانعت صرف اس لئے تھی کہ آپ شراب رکھنے کے کسی بعید ترین ذریعہ کو بھی آزاد نہ چھوڑنا چاہتے تھے ممکن تھا کہ تخلیل کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر لوگ شراب اپنے پاس رکھنے لگیں۔ اور یہ کسی وقت اس کے استعمال کا محرک ہو جائے۔

(۸۰) حضورؐ نے ننگی تلوار لینے اور دینے سے منع فرمایا تاکہ یہ کسی برائی کا سبب نہ بن جائے ہو سکتا ہے کہ شیطان اس وقت آدمی کے ہاتھ سے کھیلنے لگے اور اس کو کسی فتنہ میں مبتلا کر دے۔

(۸۱) حضورؐ نے مسجد میں نیزے لے کر آنے والوں کو حکم دیا کہ ان کے پھل ہاتھ میں رکھو۔ تاکہ ان کی نوک سے کسی مسلمان کو اذیت نہ پہنچ جائے۔

(۸۲) آپ نے تشیاع (تفاخر بالجماع) کی ممانعت فرمائی کیونکہ اس سے فساد پھیلتا ہے اور بے شرمی ہونے کے علاوہ یہ نفوس میں تحریک کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی باتیں سن کر کسی شخص کے جذبات بھڑکیں اور وہ حلال کا ذریعہ نہ

رکھنے کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جائے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ مجاہرین (یعنی وہ لوگ جو اپنے معاصی کا چرچا کرتے ہیں) اللہ کی عافیت سے خارج ہیں۔

(۸۳) حضورؐ نے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ اس سے پانی نجس ہو جاتا ہے۔ اس باب میں پانی کی کثرت اور قلت کی کوئی تمیز نہیں اس لیے کہ کثیر پانی میں اگر بول و براز کرنے کی اجازت دی جائے تو کسی وقت قلیل پانی کو بھی نجس کر دیا جائیگا پھر اس کی ممانعت عام ہے۔ کیونکہ اگر ہر شخص یہی خیال کرے کہ میرا تھوڑا سا پیشاب لتنے پانی کو کیا گندہ کرے گا، تو پیشابوں کے تواتر سے پاک پانی نادر الوجود ہو جائے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ممانعت صرف اس پانی کے لئے ہے جو قلتین سے کم ہو یا جس کو کھینچ لینا ممکن ہو، وہ حکمت تشریع سے ناواقف ہیں شارع حکیم کا مقصد تو ٹھیرے ہوئے پانی کو نجاست سے پاک رکھنا ہے۔ اس کے لئے پانی کی مقدار مقرر کرنا اور کسی خاص مقدار سے زیادہ پانی میں پیشاب کی اجازت دینا گویا پانی کے خزانوں کو پیشاب گاہ بنا دینا ہے، جو شارع کی حکمت سے ابعد ہے۔ شارع نے کسی جگہ بھی قلتین سے زیادہ پانی میں یا ایسے پانی میں جس کو کھینچنا ممکن ہو، پیشاب کی اجازت نہیں دی، بلکہ عمومیت کے ساتھ ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔

(۸۴) حضورؐ نے مسافر کو دشمن کے ملک میں قرآن لے جانے سے منع فرمایا ہے اور خود ہی اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شاید اس طرح قرآن دشمنوں کے ہاتھ پڑ جائے اور وہ اس کی توہین کریں۔

(۸۵) حضورؐ نے احتکار[1] کی ممانعت فرمائی ہے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کو یا محتاج کو تنگی ہوتی ہے اور یہ گرانی اجناس کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر ایسے احتکار کی ممانعت نہیں ہے جو لوگوں کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔

(۸۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا کہ کوئی شخص اپنی ضرورت سے زیادہ پانی کا استعمال دوسروں پر بند کرے۔ اور خود ہی وجہ یہ بیان فرمائی کہ کہیں یہ زائد ضرورت

---

[1] غلہ وغیرہ کے ذخائر اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں چڑھنے کے وقت ان کو فروخت کریں گے۔

چارے کو بھی روکنے کا ذریعہ نہ بن جائے مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنا پانی کم دوسروں کے جانوروں کو نہ پینے دے گا وہ اس کے اردگرد کی چراگاہ میں ان کے جانور بھی نہ چرنے دے گا اور یہ تنگ دلی لوگوں کے لیے سختی و مصیبت کا سبب بن جائے گی۔

(۸۷) حضور نے حاملہ عورت پر حدِ زنا جاری کرنے کی ممانعت فرمائی تاکہ یہ اس کے پیٹ کے بچے کی ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔

(۸۸) حضور نے جذام کے مریضوں کی طرف نظر جما کر دیکھنے سے منع فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں یہ بیماری دیکھنے والے کو بھی نہ لگ جائے۔ اہلِ طبیعت اس کے معترف ہیں کہ بعض بیماریاں محض نظر کے واسطے سے لگ جاتی ہیں۔ ایک عالمِ طبیعات نے خود مجھ سے بیان کیا کہ میرا ایک عزیز آنکھوں کا معالج تھا جب اس نے اپنے پیشہ کا آغاز کیا تو کچھ عرصہ بعد اس کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ اچھا ہونے کے بعد اس نے پھر اپنا کام جاری کیا اور پھر اس کی آنکھیں دکھیں۔ اس طرح کئی مرتبہ وہ بیمار ہوا اس تجربہ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ طبیعت نظر کے واسطہ سے بھی منتقل ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بار بار آشوبِ چشم کے مریضوں کی آنکھیں دیکھتا تھا اس لئے مریضوں سے آشوب کی طبیعت اس کی آنکھوں میں منتقل ہو گئی اگرچہ اس قسم کا انتقال ہونے کے لئے پہلے سے اس شخص میں اس مرض کی استعداد ہونا لابُد ہے مگر یہ کون جانتا ہے کہ اس میں کس مرض کی استعداد ہے اور کس کی نہیں

(۸۹) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے وقت جھکنے اور سر و کمر خم کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ آج بہت سے لوگ جو عالم کہلاتے ہیں مگر سنت کا علم نہیں رکھتے۔ اس سنت کی مخالفت میں اتنا مبالغہ کر رہے ہیں کہ انسانوں کے سامنے رکوع کی حد تک جھک جانے کو بھی جائز رکھتے ہیں۔ اور ایک جماعت تو اپنے زندہ اور مردہ شیوخ کے سامنے اس قدر جھکتی ہے کہ سجود کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔ ایک تیسرا طائفہ ہے جو اس کو جائز رکھتا ہے کہ ایک شخص خدا بن

کر بیٹھے اور لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوں۔ ان تینوں گروہ نے نماز کی ایک ایک چیز لے لی ہے۔ ایک نے رکوع لیا۔ دوسرے نے سجود اور تیسرے نے قیام۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسان کے سامنے سر اور کمر کو محض خم کرنا بھی جائز نہ رکھا تاکہ یہ تعبد لغیر اللہ کا سبب نہ بن جائے حتیٰ کہ آپ نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہو۔ اس کے پیچھے لوگ کھڑے ہو کر نماز پڑھیں۔ گو یہ قیام خدا کی عبادت ہی کے لئے ہے۔ مگر آپ کی حکیمانہ نظر دیکھ رہی تھی کہ مخلوق کی تعظیم اور عبودیت میں قیام کرنے کا بھی ایک خفیف ترین شائبہ اس کے اندر موجود ہے اس لئے آپ نے اس تک کا قلع قمع کر دیا۔

(۹۰) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے چاندی اور غلات وغیرہ کے ہم جنس مبادلہ میں حکم دیا ہے کہ مبادلہ دست بدست ہو اور تقابض سے پہلے فریقین کے جدا ہونے کی ممانعت فرمادی۔ تاکہ اس کی مہلت اور تاجیل کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ جو ربا کی اصل[1] ہے۔ ایک ہی مجلس میں تقابض کی شرط اس لئے لگائی گئی ہے کہ لوگ ربا کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائیں۔ پھر حضور نے ہم جنس اشیاء کے مبادلہ میں مثل بمثل کی شرط بھی لگائی اور واجب کیا کہ مقدار میں ایک شے دوسری شے سے زائد نہ ہو۔ حتیٰ کہ اچھی اور بری کھجوروں کا مبادلہ بھی مساوی مقدار میں کیا جائے۔ یہ سب اسی لئے ہے کہ ربا النسیئہ کا دروازہ نہ کھلنے پائے۔ کیونکہ جب لوگ اس زیادتی سے بھی پرہیز کریں گے جس کے مقابلہ میں بجز مہلت کے اور کچھ نہ ہو۔ ربا الفضل کی تحریم میں یہی حکمت ہے جو اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے حتیٰ کہ بعض متاخرین نے صاف ہی کہہ دیا۔ کہ ربا الفضل کے حرام ہونے کی علت ہماری سمجھ میں نہیں آئی حالانکہ شارع نے خود ہی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جب ایک ہی جنس کی دو چیزوں کا مبادلہ ہو تو اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا معاملہ ہونا چاہیئے اگر قبضہ لینے سے پہلے فریقین ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو بیع فاسد ہو جائے گی اس باب میں یہاں تک سختی کی گئی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے جدا ہو جانے کو بھی جائز نہیں رکھا گیا کیونکہ اگر اس کو جائز رکھا جائے تو مہلت کا دروازہ کھلتا ہے اور سود کی جڑ ہی مہلت ہے۔

علت فرمادی ہے۔ کہ اسے ربا النسیہ کے ذریعہ کا سدباب کرنے کے لئے حرام کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ فانی اخاف علیکم الرما والرما ھو الربا (یعنی مجھے خوف ہے کہ کہیں تم ربا میں مبتلا نہ ہو جاؤ) پس تحریم ربا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نوع تو وہ ہے جو اصل مفسدہ کی وجہ سے حرام کی گئی ہے۔ یعنی ربا النسیۂ اور دوسری نوع تو وہ ہے جو محض وسیلہ اور ذریعہ ہونے کی وجہ سے حرام کر دی گئی ہے۔ جو لوگ شارع حکیم کی حکمت کو نہیں سمجھتے ان کے لئے لازم ہے اکہ ربا الفضل سے تعبّد محض کے طور پر باز رہیں۔

(۹۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی بہت سی انواع کو سدباب ذریعہ کی خاطر ممنوع قرار دیا ہے۔ مثلاً نکاح بلا ولی کہ وہ زنا کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک زانی ایک عورت کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنا نفس دس درہم کے عوض اس کے حوالہ کر دے اور اس پر اپنے دوستوں کو یا راہ چلتوں میں دو آدمیوں کو پکڑ کر گواہ کر لیتا ہے اگر اس کو جائز رکھا جائے تو ایسے نکاح اور زنا میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اسی طرح حضورؐ نے ایسے نکاح کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ جو محض حلالہ کرنے کے لئے کیا جائے۔ کیونکہ اس میں عورت کو بیوی بنانے کا ابتداہی سے ارادہ نہیں ہوتا۔ وہ محض اس لئے ایک مرتبہ یا حد سے حد چند مرتبہ جماع کرنے کے لئے عقد کرتا ہے اور یہ حقیقتاً زنا ہی ہے اگرچہ صورت بدلی ہوئی ہے۔ نکاح متعہ کی تحریم بھی اسی لئے ہے کہ متعہ کرنے والا محض ایک خاص مدت تک اپنی خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے عورت سے معاملہ کرتا ہے ان سب انواع نکاح کو ذریعہ سفاح کا انسداد کرنے کے لئے حرام کیا گیا ہے۔ اور صرف ایسے نکاح کو جائز رکھا گیا ہے جس میں زوجین ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا قصد رکھتے ہوں، اور جس میں ولی اور شاہد موجود ہوں اور جس کو اعلان کے ساتھ کیا جائے۔

(۹۲) حضورؐ نے صدقہ کرنے والے کو اپنا صدقہ کیا ہوا مال خریدنے سے منع فرمایا ہے۔ اگرچہ وہ اس کو بازار میں بکتا ہوا ہی کیوں نہ پائے۔ یہ اس لئے کہ انسان کے

دل میں اس چیز کو واپس لینے کی کوئی خواہش تک باقی نہ رہے جو اس کے پاس سے خدا کے لئے نکل چکی ہے۔ جب کوئی شخص بعوض بھی اپنے صدقہ کو واپس نہ لے سکتا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بلا عوض اسے واپس لینے سے بدرجہ ادنیٰ باز رہیگا اور اس کے نفس کو اس مال سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ جس کو وہ راہ خدا میں دے چکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بات ثابت ہے کہ صدقہ کئے ہوئے مال کو خریدنا مطلقاً ممنوع ہے اور غور کرنے والا سمجھ سکتا ہے کہ اگر یہ ممنوع نہ ہو تو ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ پہلے اپنے مال کا صدقہ کسی فقیر کو دے پھر اس کو کم قیمت دے کر خرید لے، فقیر بیچارہ یہ دیکھ کر کہ کچھ تو ہاتھ آتا ہے۔ اس کو بخوشی یا مجبوراً بیچ دے گا مگر اللہ عالم الاسرار ہے۔ اور اس کی نظر میں اصلی قیمت مال کی نہیں بلکہ اس کی نیت کی ہے جس کے ساتھ مال دیا گیا ہے۔

(۹۳) حضور نے پھل پکنے سے پہلے ان کی بیع سے منع فرمایا۔ کیونکہ پھل پکنے سے پہلے خراب ہو سکتے ہیں اور ایسی بیع خریدار کا مال ناحق کھانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس ذریعہ کا سدباب کرنے میں مزید تاکید یہ کی گئی۔ کہ اگر جائز طور پر خریدنے کے بعد پھل خراب ہو جائیں تو خریدار کے حق میں آفت ناگہانی کا حکم لگایا جائے گا۔ تاکہ وہ سوچ سمجھ کر معاملہ کرے اور اس پر ظلم نہ ہو، نہ اس کا مال بلا حق کے کھایا جائے۔

(۹۴) نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری تقدیر کا لکھا جب پیش آئے تو یہ نہ کہا کرو کہ ہم ایسا کرتے تو ایسا ہوتا۔ وجہ یہ بیان فرمائی کہ ایسی باتیں شیطان کو اپنا کام کرنے کا موقع دیتی ہیں وہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم پر رنج اور شرمندگی اور مقدور سے ناراضی مسلط ہو۔ اور تم خیال یہ کرو کہ ایسا اور ایسا کرنے سے تقدیر کو ٹالا جا سکتا تھا۔ ایسی باتیں رضا و تسلیم اور تفویض و تصدیق کو ضعیف کرنے والی ہیں۔ درحقیقت مسلمان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ خدا چاہے گا وہ ہوگا اور جو نہ چاہے گا وہ نہ ہوگا جب دل اس اعتقاد سے ذرا منحرف ہوتا ہے تو شیطان کے

لیے عمل کا دروازہ کھل جاتا ہے پس یہ ذرا سا جملہ کہ "ہم ایسا کرتے تو ایسا ہوتا"
اگرچہ مجرد لفظ ہی ہے لیکن چونکہ اس سے بڑے مفاسد کی ابتدا ہوتی ہے ۔ اس
لیے اس کی ممانعت کر دی تاکہ دل میں وہ خیالات راہ ہی نہ پائیں جو ایمان کے منافی
اور عمل شیطان کے لیے راستہ کھولنے والے ہیں ۔

(۹۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کا کھانا کھانے سے منع کیا جو محض ایک
دوسرے کے مقابلہ میں شان دکھانے اور فخر و مباہات کی خاطر دعوتیں کرتے ہوں
اسی طرح ایسے لوگوں سے مال خریدنے کی بھی ممانعت کر دی جو ایک دوسرے کے
مقابلہ میں قیمتیں گھٹا کر فروخت کرتے ہوں تاکہ گاہک ان کے مخالف کی دوکان پر نہ جائے
اس ممانعت میں متعدد وجوہ سے ذریعہ فساد کا انسداد ہے ۔

(۹۶) قرآن میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کو عذاب دیا جنہیں آزمانے کے
لیے سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا تھا ۔ سبت ہی کے دن مچھلیاں
کثرت سے آتی تھیں ۔ اس لیے وہ جمعہ کو گڑھے کھودنے لگتے تاکہ سبت کے روز
مچھلیاں اس میں جمع ہو جائیں اور اتوار کے روز وہ انھیں پکڑ لیں ۔ اللہ نے ان لوگوں
کو بندروں اور سوروں کی صورت کا بنا دیا ۔ غور کرو کہ اس عذاب کی وجہ بھی یہی تھی
کہ انہوں نے نافرمانی کے لیے ایک جائز فعل کو ذریعہ بنا کر خدا کو دھوکا دینا چاہا ۔ اصل
مقصد سبت ہی کی مچھلیاں پکڑنا تھا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا ، مگر انہوں نے حیلہ
یہ کیا کہ جائز صورت فعل اختیار کی ۔ یعنی جمعہ کو جال لگانا اور اتوار کو مچھلیاں پکڑنا
لہذا ان کو نافرمان قرار دیا گیا ، کیونکہ اصل اعتبار صورت فعل کا نہیں بلکہ قصد فاعل اور
حقیقت فعل کا ہے ۔ جو لوگ ذریعہ کے انسداد کو اہمیت نہیں دیتے اور صرف صورت فعل
ہی پر نظر رکھتے ہیں ۔ ان کے مذہب کی رو سے اصحاب السبت کا یہ فعل حرام نہ تھا ،
اسی وجہ سے وہ بھی ایسے حیلوں کو جائز رکھتے ہیں ، مثلاً یہ کہ اگر احرام سے پہلے جال
لگایا گیا ہو ۔ اور اس میں مچھلیاں پھنس جائیں تو احرام کھولنے کے بعد ان کو پکڑنا جائز
ہے ۔

(۹۷) امام احمد کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کے زمانہ میں اسلحہ فروخت کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ لاریب کہ یہ بھی اعانت علی المعصیت کے ذریعہ کا انسداد ہی کرنے کے لیئے ہے جو لوگ سدّ ذریعہ کے قائل نہیں وہ اس کو بھی جائز رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بیع دراصل تعاون علی الاثم والعدوان ہے اور ایسے تمام بیوع اور اجارات اور ہر قسم کے معاملات اسی ذیل میں آتے ہیں جو خدا کی معصیت میں مددگار ہوں مثلاً کفار اور باغیوں اور رہزنوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا اور غلام کو ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو اس سے بُرا کام کرتا ہو یا کراتا ہو، اور مکان یا دکان کو رنڈیوں کے لیئے کرایہ پر دینا، اور ان لوگوں کے ہاتھ چراغ اور سامان زینت فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا جن کے متعلق معلوم ہے کہ خدا کی معصیت میں ان کو استعمال کریں گے، اور ایسے شخص کے لیئے نچوڑنا جس کے متعلق معلوم ہے کہ شراب بنائے گا۔ یہ اور ایسے ہی تمام امور دراصل اللہ کی نافرمانی میں مدد دینے کے مترادف ہیں۔ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے انگور کا رس نکالنے اور نکلوانے والے دونوں سے فرمائی ہے۔ جو لوگ سدّ ذریعہ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے مذہب کی رو سے لازم ہے کہ رس نکالنے والے پر لعنت نہ کی جائے اور ہر شخص کے لیئے رس نکالنا جائز ہو اور کہا جائے کہ عقد میں قصد و نیت کا کوئی اختیار نہیں۔ اور ذریعہ معصیت خود معصیت نہیں۔ وہ علانیہ کہتے ہیں کہ ہم صرف ظاہر کو لیتے ہیں، باطن کا تعلق خدا سے ہے مگر ان کے اس مسلک اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کھلی ہوئی منافات ہوئی۔

(۹۸) آنحضرت نے امراء مسلمین سے لڑنے اور ائمہ پر خروج کرنے سے منع فرمایا جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے رہیں، اگرچہ وہ ظالم اور ستمگر ہوں۔ یہ اسی لئے تھا کہ ان سے جنگ کرنا ان کے ظلم وجود سے بڑھ کر فساد اور شر کا سبب بن جائے گا۔ جیسا کہ فی الواقع ہوا جب کبھی ان کے خلاف جنگ کی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ظلم وہ کرتے تھے ان سے بدرجہا زیادہ ظلم و ستم برپا ہوئے اور آج تک امت پر ان فتنوں کے باقیات مسلط ہیں۔ اسی فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے

حضورؐ نے فرمایا کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے ایک کو قتل کر دو۔

(۹۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سات حرفوں میں سے صرف ایک حرف پر جمع کیا تاکہ مختلف لہجوں اور زبانوں کا استعمال قرآن میں اختلاف کا ذریعہ نہ بن جائے۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مسئلہ میں ان سے اتفاق کیا۔

یہاں ہم تفاولاً صرف اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں کہ اللہ کے اسماء حسنیٰ بھی (۹۹) ہیں۔

ترجمہ القرآن ذی القعد سنہ ۱۳۵۵ ہجری

تغیرِ احکام بلحاظ تغیرِ ازمنہ واحوال

(از افادات علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ)

(اس اشاعت میں ہم علامہ ابن القیم کا ایک اور مقالہ ان کی کتاب اعلام الموقعین سے نقل کرتے ہیں۔ اس مقالہ میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ زمان و مکان اور حالات و نیّات اور عوائد کے بدل جانے سے احکام شرعیہ میں کس طرح اور کن اصول پر تغیر ہوتا ہے۔ جو لوگ شریعت میں فقیہانہ بصیرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ مقالہ غایت درجہ مفید ہوگا۔)

یہ ایک نہایت نافع بحث ہے۔ جس سے ناواقف ہونے کی بدولت مسائل شرعیہ میں بڑی غلطیاں کی جاتی ہیں، اور حرج و مشقت میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور ایسی تکلیفات میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ جن سے رستگاری کی کوئی سبیل نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ شریعت باہرہ جو مصالح کے بلند ترین مراتب پر ہے۔ ایسی تکلیف بندوں پر عائد نہیں کرتی۔ شریعت کی بنیاد تو حکمت پر ہے۔ وہ معاش اور معاد دونوں میں بندوں کے مصالح کی پوری رعایت کرتی ہے۔ وہ سراسر عدل ہے۔ سراسر رحمت اور مصلحت اور حکمت ہے۔ ہر وہ مسئلہ جو عدل سے نکل کر جور تک پہنچ جائے اور رحمت سے خارج

ہوکر زحمت بن جائے اور مصلحت کے بجائے مفسدہ کی طرف رجوع کرے اور حکمت کے مقام میں نکل کر عبث ہوجائے۔ وہ شریعت کا مسئلہ نہیں ہے خواہ کیسی ہی تاویل سے اس کو شریعت میں داخل کیا جائے۔ شریعت دراصل اللہ کا عدل ہے، اس کے بندوں کے درمیان، اور اس کی رحمت ہے اس کی مخلوق کے درمیان، اور اس کا سایہ ہے اس کی زمین پر اور اس کی حکمت ہے جو اس پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر سچی اور مکمل دلالت کرتی ہے وہ اس کا نور ہے جس سے آنکھوں والوں نے دیکھا ہے اور اس کی ہدایت ہے جس سے ہدایت پانے والوں نے راہ راست پائی ہے۔ اور اس کی شفا تام ہے جو ہر علیل کی دوا ہے اور اس کی ایسی راہ مستقیم ہے کہ اس پر جو ثابت قدم ہوگیا وہ سلامتی کی راہ پر جم گیا وہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کی زندگی اور روحوں کی لذت ہے حیات، اور غذا اور دوا اور نور اور شفا اور عصمت سب کچھ اسی سے ہے۔ وجود میں جو چیز خیر ہے وہ اسی سے مستفاد ہے اور اسی سے حاصل ہوتی ہے اور وجود میں جو کچھ نقص ہے وہ اسی کو ضائع کردینے کا نتیجہ ہے اگر اس کے کچھ آثار باقی نہ رہ جاتے تو دنیا تباہ ہوجاتی اور عالم کا سارا دفتر لپیٹ دیا جاتا۔ وہی دراصل قوام عالم اور انسان کے لئے پشت پناہ ہے اسی سے اللہ آسمانوں اور زمینوں کا ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے جب اللہ تعالے دنیا کی خرابی کا ارادہ فرمائے گا اور دنیا کے دفتر کو لپیٹ دینا چاہے گا تو اس کے جو آثار باقی ہیں ان سب کو اٹھالے گا پس وہ شریعت جس کو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجا ہے عمود عالم ہے، قطب فلاح ہے دنیا اور آخرت کی سعادت ہے۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ ازمنہ و امکنہ اور احوال و نیات اور عوائد کے تغیر سے فتویٰ میں کس طرح تغیر ہوتا ہے اور ان کے اختلاف کے لحاظ سے احکام میں کس طرح اختلاف کے لحاظ سے احکام میں کس طرح اختلاف ہوجاتا ہے اس مضمون کو ہم چند صحیح مثالوں سے واضح کرینگے۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے ایجاباً لازم کیا ہے کہ منکر

(بدی) کی مخالفت کریں اور اس کو مٹائیں تاکہ اس مخالفت اور انکار سے وہ معروف حاصل ہو جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتا ہے۔ لیکن اگر کسی بدی کی مخالفت سے کوئی ایسی بدی حاصل ہوتی ہو جو اس سے زیادہ بدتر ہو اور خدا و رسول کو اس سے بھی زیادہ ناپسند ہو تو اس کی مخالفت میں کوشش کرنا مناسب نہیں، اگرچہ وہ اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اور اللہ اس کے حامیوں اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جابر و ظالم بادشاہوں اور بدکار امرا پر خروج کرنا کہ یہ ہر فتنہ اور شر کی جڑ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے پوچھا کہ جو امرا نماز کو اس کے وقت سے ٹال دیں۔ کیا ہم کو ان سے جنگ نہ کرنی چاہیئے۔ فرمایا نہیں جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جو کوئی اپنے امیر سے کوئی برائی دیکھے وہ اس پر صبر کرے اور اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے"۔ اگر تم ان فتنوں پر غور کرو جو اسلام میں برپا ہوئے ہیں تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ اسی اصل کو ضائع کر دینے کا نتیجہ ہیں۔ منکر پر صبر نہ کیا گیا اور اس کو زائل کر دینے کی کوشش کی گئی اس سے وہ منکر پیدا ہوا جو عظیم تر تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بڑے بڑے منکرات دیکھتے تھے مگر ان کو مٹا دینے پر قادر نہ تھے۔ اس لئے خاموش رہ جاتے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ جب اللہ نے مکہ کو فتح کر دیا اور وہ دارالاسلام بن گیا اس وقت حضور خانہ کعبہ میں ترمیم کرنا اور اسے بنائے ابراہیمی پر قائم فرمانا چاہتے تھے۔ مگر قدرت رکھنے کے باوجود آپ اس لئے باز رہے کہ اس کام کے نہ کرنے میں جو خرابی تھی اس سے عظیم تر خرابی کا اندیشہ اس کے کرنے میں تھا یعنی یہ کہ اہل قریش جو اس وقت جدید الاسلام تھے اور جن کو کفر سے نکلے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا، شاید اس کو برداشت نہ کر سکے۔ اسی بنیاد پر حضور نے امرا کے خلاف بھی عملی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس سے ایسی خرابیاں واقع ہونے کا اندیشہ ہے جو ان کے شر سے عظیم تر ہوں۔

انکارِ منکر کے چار درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ منکر کو زائل کر کے اس کی جگہ معروف کو قائم کر دیا جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ منکر کو بالکلیہ زائل نہ کیا جا سکے تاہم اس کو

گھٹا دیا جائے تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک منکر کو اس طرح مٹایا جائے کہ ویسا ہی دوسرا منکر اس کی جگہ قائم ہو جائے اور چوتھا درجہ یہ ہے کہ ایک منکر کو مٹانے کی کوشش میں اس سے بدتر منکر قائم ہو جائے۔

ان میں سے پہلے دونوں درجے تو مشروع ہیں اور جب ان دونوں میں سے کسی کی امید ہو تو انکار منکر ضرور کرنا چاہیئے تیسرے درجہ میں اجتہاد کا موقع ہے۔ رہا چوتھا درجہ تو وہ ممنوع ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم دیکھو کہ اہل فجور و فسوق شطرنج کھیل رہے ہیں تو ان کو محض زجر و توبیخ کرنا حکمت اور بصیرت کے خلاف ہوگا۔ عقلمندی یہ ہے کہ ان کو ایسے کھیل میں لگاؤ جو خدا اور رسول کو پسند ہے۔ مثلاً تیر اندازی اور گھوڑ دوڑ وغیرہ۔ ایک جگہ تم دیکھتے ہو کہ فساق کا مجمع ہے اور لہو و لعب ہو رہا ہے یا رقص و سرود کی محفل گرم ہے اگر تم ان کو کسی تدبیر سے عبادت یا فعل خیر کی طرف منتقل کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ لیکن اگر ان کو منتشر کر دینے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ اس سے بدتر کاموں کے لئے فارغ ہو جائیں تو ان کو اسی چھوٹے درجہ کے فسق میں مبتلا رہنے دینا زیادہ بہتر ہے کہ وہ چھوٹی برائی ہی ان کو بڑی برائی سے روکے ہوئے ہے ایک شخص کو تم دیکھتے ہو کہ افسانہ و مزاح کی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ اگر اس کو ایسی چیزوں کے مطالعہ سے منع کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ بدعت اور گمراہی اور اور سحر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اس کو افسانہ و مزاح ہی میں چھوڑ دینا اولیٰ ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ و نور ضریحہٗ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ فتنۂ تاتار کے زمانے میں میرا گذر تاتاریوں کے ایک گروہ پر ہوا جو شراب نوشی میں مشغول تھا۔ میرے ساتھیوں نے ان کو ملامت کرنی شروع کر دی مگر میں نے ان کو روک دیا۔ اور ان سے کہا کہ اللہ نے شراب سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ وہ ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔ مگر یہاں شراب ان کو قتل نفوس اور نہب اموال اور ظلم و ستم سے روکے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دو۔

۲ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر سارق کا ہاتھ کاٹنے سے منع فرما دیا (رواہ ابوداؤد) غور فرماؤ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد ہے مگر جنگ

میں آپ نے اس کو قائم کرنے سے روک دیا۔ اسی خوف سے تاکہ اس کے نتیجہ میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو ان کے نزدیک حدود اللہ کی تعطیل و تاخیر سے زیادہ مبغوض ہو، مثلاً مجرم کا بھاگ جانا اور دشمنوں سے جا ملنا جیسا کہ حضرت عمرؓ اور ابو درداؓ اور حذیفہ وغیرہم نے فرمایا ہے۔ اسی بنا پر امام احمد اور اسحاق بن لاہویہ اور اوزاعی وغیرہ علماء اسلام نے کہا ہے کہ دشمن کی سرزمین پر حدود جاری نہ کیے جائیں۔ ابوالقاسم خرقی اپنی مختصر میں لکھتے ہیں کہ کسی مسلمان پر دشمن کی سرزمین میں حد جاری نہ کی جائے۔ ایک جنگ کے موقع پر حضرت بشر بن ارطاۃ کے پاس ایک شخص پکڑا ہوا آیا جو ان کی ڈھال چرا لے گیا تھا آپ نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ سنا ہوتا کہ جنگ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں تو میں تیرا ہاتھ ضرور کاٹ دیتا (رواہ ابوداؤد) ابو محمد مقدسی کہتے ہیں کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے۔ اور سعید بن منصور اپنی سنن میں احوص بن حکیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے یہ فرمان لکھ کر بھیج دیا تھا۔ کہ کسی لشکر اور سریہ کے امیر یا مسلمانوں میں سے کسی شخص پر بحالت جنگ میں حد نہ جاری کی جائے تاوقتیکہ وہ سرحدوں کو عبور کر کے اپنے علاقہ میں نہ آ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر حمیت شیطانی کا غلبہ ہو جائے اور وہ کفار سے جا ملے۔ ابو درداء سے بھی ایسا ہی منقول ہے اور علقمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایک لشکر کے ساتھ روم کی سرزمین میں پڑے ہوئے تھے۔ حذیفہ بن الیمان بھی ہماری جماعت میں تھے اور ولید بن عقبہ ہمارے سردار تھے اتفاق یہ ہوا کہ ولید شراب پی گئے ہم نے ارادہ کیا کہ حد جاری کریں۔ حذیفہ نے ہم کو روکا اور کہا کہ تم اپنے سردار لشکر پر حد جاری کرتے ہو حالانکہ دشمن تمہارے قریب موجود ہے؟ قادسیہ کی جنگ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس ابو محجن ثقفی جرم بادہ خواری میں گرفتار ہو کر آئے اور آپ نے انہیں قید کر دیا۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو ابو محجن بڑی حسرت کے ساتھ یہ شعر پڑھنے لگے۔

کفی اخزناً ان تطرد الخیل بالقنا واترک مشدوداً علی وثاقیا

کیسے رنج کا مقام ہے کہ شہسوار تو نیزوں کے ہاتھ دکھا رہے ہوں اور میں یہاں بندھا پڑا ہوں

آخر کار انہوں نے حضرت سعد کی بیوی سے کہا کہ آپ مجھے چھوڑ دیجئے اور میں خدا کی قسم کھا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر جی بچا تو واپس آ کر خود بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال لوں گا۔ اور اگر مارا گیا تو جھگڑا ہی چکتا ہو جائے گا۔ یہ بات انہوں نے مان لی اور ابو محجن چھوٹ کر غازیوں سے جا ملے۔ سعد اُس روز زخم کی وجہ سے میدان جنگ میں نہ آ سکے تھے۔ اور لوگوں نے ان کو ایک بلند جگہ پر بٹھا دیا تھا۔ کہ جنگی نقل و حرکت کو دیکھتے رہیں۔ فوج کی قیادت ان کے نائب کی حیثیت سے خالد بن عرفطہ کر رہے تھے ابو محجن جو چھوٹ کر نکلے تو انہوں نے حضرت سعد کی گھوڑی بلقا پر قبضہ کیا اور نیزہ ہاتھ میں لے کر معرکہ کارزار میں جا گھسے۔ حال یہ تھا کہ جدھر حملہ کرتے تھے دشمنوں کی صفیں پلٹ دیتے تھے ان کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھ کر لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ شاید کوئی فرشتہ ہے جو مسلمانوں کی مدد کے لیے آگیا ہے اور سعد حیرت کے ساتھ بار بار کہتے تھے کہ جانور کی جانفشانی بتا رہی ہے کہ بلقا ہے اور سوار کی چلت پھرت کہتی ہے کہ ابو محجن، مگر ابو محجن تو قید میں ہے۔ پھر آخر یہ ہے کون؟ جب لڑائی ختم ہو گئی اور دشمن بھاگ گئے تو ابو محجن نے آ کر وعدے کے مطابق خود بیڑیاں پہن لیں۔ سعد کی بیوی نے اپنے شوہر سے سارا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم میں ایسے شخص کو تو نہیں ماروں گا جس نے آج مسلمانوں کے لیے ایسی جان نثاری کی ہے چنانچہ ابو محجن چھوڑ دیئے گئے جب ان کو رہائی کا حکم ملا تو انہوں نے کہا کہ میں نے تو شراب اس لئے پیا تھا کہ مجھ پر حد جاری کی جائے گی اور مجھے پاک کر دیا جائے گا مگر تم نے مجھے پاک کئے بغیر ہی چھوڑ دیا تو اب میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔

اس میں کوئی بات بھی نص یا قیاس یا قواعد شرع میں سے کسی قاعدے کے خلاف نہیں ہے۔ نہ اجماع کے خلاف ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے تو زیادہ درست ہوگا۔ چنانچہ شیخ اپنی کتاب المغنی میں فرماتے ہیں کہ اس پر اتفاق ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ کسی نے اس سے اختلاف کیا ہو میں کہتا ہوں کہ اقامت حد میں یہ تاخیر دو مصلحتوں میں سے کسی ایک مصلحت پر مبنی ہے یا تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک

شخص نے حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں حد کا مستحق ہوگیا ہوں۔ مجھ پر حد جاری فرمائی جائے۔ حضور نے فرمایا کیا تو نے اس وقت ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کیا، جی ہاں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ جا اللہ نے تیری حد معاف کر دی۔ اور اس معافی اور اسقاط کی برکت، اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس نے اسی وقت سچے دل سے توبہ کر لی، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا کہ اب میں کبھی شراب نہ پیوں گا دوسری روایت میں ابدالابد کے الفاظ ہیں تیسری روایت میں اس کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "تمہارے کوڑوں کے خوف سے شراب چھوڑنا مجھے گوارا نہ تھا، مگر اب کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا، خدا کی قسم اب میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔ اسی طرح حضرت خالد نے بنی جذیمہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا۔ وہ ایسا فعل تھا کہ حضور نے اس سے برأت کا اظہار فرمایا۔ مگر اس پر کوئی مواخذہ ان سے نہ کیا، کیونکہ خالد کی خدمات اور اسلام پر ان کی جان نثاریوں کا لحاظ تھا۔ اور جو کوئی امر و نہی اور ثواب و عقاب کی مطابقت اور ان کے باہمی ارتباط کو بنظر تامل دیکھے گا۔ اس پر اس باب میں تفقہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی تائب کو عذاب نہیں دیتا۔ اسی طرح تائب پر حد بھی قائم نہیں کی جاتی۔ چنانچہ خود اللہ نے ہی نے ان محاربین پر سے حد ساقط کر دی جو مسلمانوں کے قبضۂ قدرت میں آنے سے پہلے توبہ کر چکے ہوں۔ ایسے زبردست جرم کے مجرموں پر سے جب حد ساقط کر دی گئی — تو اس سے ادنیٰ درجہ کے جرائم پر تو سچی توبہ سے بدرجہ اولیٰ حد ساقط ہونی چاہیئے سنن نسائی میں ایک حدیث آئی ہے جس کو سماک نے علقمہ بن وائل سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت صبح اندھیرے منہ نکل کر مسجد جا رہی تھی کہ ایک شخص نے اس کو پکڑ لیا اور زبردستی زنا کرنے لگا۔ عورت نے شور مچانا شروع کیا۔ پاس سے ایک شخص گذر رہا تھا وہ جب آیا تو مجرم بھاگ گیا۔ یہ شخص اس کو پکڑنے کے لئے دوڑا۔ اتنے میں اور لوگ آگئے اور عورت نے ان سے فریاد کی۔ وہ بھی مجرم کو پکڑنے کے دوڑے۔ اصل مجرم تو بھاگ گیا اور وہ شخص جو اس کو پکڑنے کے لئے بھاگا جا رہا تھا ان لوگوں کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ اس کو پکڑ کر عورت کے پاس لائے۔ اس نے کہا کہ میں تو اس کی مدد کے لئے آیا تھا۔

جنگ آزما سپاہی کی خدمات حاصل ہوں گی، یا کم از کم یہ خطرہ تو نہ رہے گا کہ ملزم مرتد ہو کر کفار سے جا ملے۔ رہی یہ بات کہ آیا کسی عارضی امر کی وجہ سے اقامتِ حد میں تاخیر کرنا جائز ہے یا نہیں تو شریعت میں اس کے جواز کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً حاملہ عورت پر حد کی اقامت ملتوی کر دی جاتی ہے جس کا بچہ دودھ پیتا ہو سخت گرمی اور سخت سردی کے وقت بھی حد جاری نہیں کی جاتی۔ مریض پر حالتِ مرض میں بھی اقامتِ حد ممنوع ہے پس جب مجرموں کے مصالح کو پیشِ نظر رکھ کر حد ملتوی کرنا جائز ہے تو اسلام کی مصلحت کے لیے ملتوی کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے۔

سعد بن ابی وقاص نے ابو محجن کے ساتھ جو کچھ کیا اس سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے ابو محجن پر سے حد ملتوی نہیں بلکہ ساقط ہی کر دی۔ کیا یہ اسقاط جائز ہے؟ ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ جائز ہے۔ چنانچہ ان کا مذہب یہ ہے۔ کہ دارالحرب میں مسلم پر حد نہیں ہے اور انہوں نے حضرت سعد کے اسی فعل سے تمسک کیا ہے مگر میرے نزدیک حضرت سعد کے اس فعل میں کوئی ایسی حجت نہیں ہے کہ اس کی بنا پر اسقاط حد کا عام قاعدہ بنا لیا جائے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ میں سنت اللہ کی پیروی کی ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ابو محجن نے دین کے لئے ایسی فداکاری کی ہے اور اللہ کے لئے کمال درجہ کا جہاد اور بذلِ نفس کیا ہے تو حد ان پر سے ساقط کر دی کیونکہ ان کی نیکی ان کے اس گناہ پر چھا گئی اور وہ اس طرح نیکی میں محو ہو گیا۔ جیسے سمندر میں نجاست کا ایک قطرہ محو ہو جاتا ہے اس کے ساتھ حضرت سعد نے یہ بھی خیال کیا ہو گا کہ ابو محجن نے جنگ کے موقع پر ضرور سچے دل سے توبہ کر لی ہو گی، اس لئے کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے کڑے وقت میں جب کہ موت سامنے ہو اور ہر وقت خدا کے پاس حاضر ہونے کا امکان ہو۔ وہ گناہ پر اصرار کرے گا۔ پھر جس طرح ابو محجن نے اپنے آپ کو خود لا کر قید کے لئے پیش کر دیا اور بیڑیاں پہن لیں، اس سے وہ اس بات کے مستحق ہو گئے تھے کہ ان کی حد معاف کر دی جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس قسم کی رعایت ثابت ہے۔ ایک

اور وہ شخص جس نے اس پر دست درازی کی تھی۔ بھاگ گیا۔ مگر کسی نے اس کی نہ سنی اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا۔ عورت نے حضور سے عرض کیا۔ کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ لوگوں نے بھی کہا کہ ہم نے اسے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس کی مدد کے لئے آیا تھا اور مجرم کو پکڑنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ ان لوگوں نے راستہ میں مجھے دوڑتے ہوئے پایا اور پکڑ لیا۔ عورت نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔ دراصل اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ آخر کار حضور نے فیصلہ فرمایا لے جاؤ اسے اور رجم کرو۔ جب اس کو رجم کرنے کا وقت آیا تو مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا کہ اس کو رجم نہ کرو۔ رجم کا سزاوار تو میں ہوں میں نے ہی عورت پر حملہ کیا تھا۔ اس پر تینوں کو دوبارہ حضور کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ اقراری مجرم اور وہ شخص جو عورت کی مدد کو آیا تھا اور خود عورت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا معاملہ سن کر اس شخص کے حق میں کلمات خیر فرمائے جس نے عورت کی مدد فرمائی تھی۔ اور اقراری مجرم سے فرمایا کہ تجھے معاف کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ جس نے زنا کا اعتراف کر لیا ہے اس کو تو رجم فرمایئے۔ حضورؐ نے انکار کیا اور فرمایا کہ اس نے اللہ سے توبہ کر لی ہے۔

اس مقدمہ میں بحمد اللہ کوئی اشکال نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر شہادت اور بغیر اقرار کے پہلے شخص پر رجم کا فیصلہ کیسے صادر فرما دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضورؐ کا یہ فعل اس بات پر نہایت قوی دلیل ہے کہ تہمتوں میں قرائن کا اعتبار کرنا اور شواہد احوال پر رائے قائم کرنا جائز ہے۔ اور اس کی نظیر یہ ہے۔ کہ شراب نوشی کے جرم میں منہ کی بو اور قے پر اقامت حد کا فیصلہ کیا جاتا ہے جیسا کہ صحابہ کا اجماع ہے اور زنا کے جرم میں حمل کی شہادت کو اقامت حد کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا ہے۔ اور فقہاء اہل مدینہ کا مذہب ہے۔ اسی طرح جس پر سرقہ کی تہمت ہو اگر اس کے قبضہ سے مال مسروقہ برآمد ہو جائے تو یہ اقامت حد کے لئے کافی شہادت ہے۔ پس یہ شخص جب بھاگتا ہوا پکڑا گیا اور عورت نے کہا،

کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھ سے ایسا کیا تھا اور خود اس شخص بھی کم از کم اتنا اعتراف کیا کہ وہ اس کے پاس آیا ضرور تھا (گو اس کے ساتھ اس نے یہ دعوی بھی کیا کہ بری نیت سے نہیں بلکہ اس کی مدد کے لیے آیا تھا۔) اور پکڑنے والے لوگوں نے اس کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھا تو ایسی صورت میں کوئی اور رائے اس کے سوا قائم ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہی شخص مجرم تھا۔ ان قرائن و شواہد سے جو گمان غالب حاصل ہوتا ہے۔ شہادت میں بھی غلطی کا احتمال یا گواہوں کی دشمنی کا احتمال ویسا ہی ہے جیسا کہ اس معاملہ میں غلط فہمی یا عورت کی عداوت کا احتمال ہے۔ بلکہ یہاں اس گمان کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ عورت نے دشمنی کی بنا پر اس شخص کو متہم کر دیا ہوگا۔ غرض یہ کہ اس مقدمہ میں ظاہر قرائن و شواہد اتنے مضبوط ہیں کہ اس درجہ کے قرائن و شواہد ثبوت حد کے لیے شرعاً کافی ہو سکتے ہیں، بلکہ بہت سے مواقع پر اس سے بھی کم درجہ کے قرائن و شواہد کو فیصلہ کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ایک عمدہ نظیر ہے اور قواعد شرع پر باحسن وجوہ جاری ہوتا ہے ظاہری احکام ہمیشہ ظاہری دلائل مثلاً شہادت اور اقرار، اور شواہد احوال کے تابع ہوتے ہیں اور ان کا کبھی کبھی نفس الامر کے خلاف ہونا کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ فصل خصومات کے لیے یہ طریقے اور وسائل کافی نہیں ہیں۔ خود شہادت بھی تو تو بالذات موجب حد نہیں ہے۔ بلکہ حد کے ساتھ اس کا ربط وہی ہے جو مدلول کے ساتھ دلیل کا رابطہ ہوتا ہے اگر کوئی دلیل اس کے خلاف برابر کی قوت رکھتی ہو یا اس سے زیادہ قوی ہو تو شارع کی نگاہ میں وہ ناقابل التفات نہیں ہے اور اس کا نفس الامر کے خلاف ہونا اس کے دلیل ہونے میں اسی طرح قادح نہیں جس طرح شہادت اور اقرار کا حقیقت کے خلاف نکلنا اس کے دلیل ہونے میں قادح نہیں ہے۔

رہا اقراری مجرم سے حد کا اسقاط، تو جب امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے شخص کا دامن عفو اس کے لیے وسیع نہ ہو سکا تو کوئی حرج نہیں اگر اکثر فقہا کا دامن عفو بھی اس کے لیے وسیع نہ ہو لیکن رؤف الرحیم کا دامن تو اس کے لیے پھیل چکا ہے۔

جب اس نے ایک بے گناہ شخص کو سنگسار ہوتے دیکھ کر اپنے جرم کا آپ سے آپ اقرار کر لیا اور اپنے آپ کو رضا و رغبت سنگساری کے لیئے پیش کر دیا تو حضور نے اس کے اس فعل کو اس امر کی بین دلیل سمجھا کہ اس کے دل میں خدا کا خوف آ گیا ہے۔ اور اس نے سچے دل سے اپنے مالک کی طرف رجوع کیا ہے۔ نیز اس کا ایک مسلمان کو ہلاکت سے بچانا، اور اس کی سلامتی کے لیئے اپنے آپ کو موت کے سامنے پیش کر دینا ایسی بڑی نیکی تھی جس کے مقابلہ میں زنا کا جرم ہلکا ہو گیا حضور نے سمجھا کہ یہ طاقت ور دوا اس کے مرض کو زائل کر چکی ہے، اور اس کا قلب جو عارضی طور پر جرم کی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر صحت کی طرف عود کر آیا ہے۔ اس لیئے فرمایا گیا کہ ہمیں تجھ پر حد لگانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تو حد اسی لیئے مقرر کی ہے کہ آدمی کو پاک کر دے اور اس کے مرض کا علاج کر دے مگر جب تو اس کے بغیر ہی پاک اور صالح ہو گیا۔ تو اب تیرا مقام رجم گاہ نہیں بلکہ میرا دامن عفو ہے۔ دیکھو! کونسا فیصلہ اس فیصلہ سے بہتر ہو جاتا ہے کہ رحمت کے مطابق بھی ہے اور حکمت و مصلحت کے مطابق بھی۔

سنن نسائی میں اوزاعی کی حدیث ہے جس کو انہوں نے ابو عمار شداد سے اور انہوں نے ابو امامہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ! میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر جاری فرمایئے حضور نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا، اس نے پھر عرض کیا کہ میں حد کا مستحق ہوں۔ مجھ پر حد جاری فرمایئے۔ آپ نے سنا اور ٹال دیا۔ سہ بارہ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حد کا مجرم ہوں آپ مجھ پر حد جاری فرمائیں۔ آپ نے پھر سنی ان سنی ایک کر دی۔ اس کے بعد نماز کے لیئے جماعت کھڑی ہو گئی جب حضور نے سلام پھیرا تو اس شخص نے پھر آگے بڑھ کر عرض کیا کہ میں مجرم ہوں۔ مجھ پر حد جاری فرمایئے۔ حضور نے پوچھا جب تو یہاں آیا تھا تو کیا تو نے وضو کیا تھا؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے پوچھا کہ جب ہم نے نماز پڑھی تو کیا تو نے بھی نماز پڑھی۔ اس نے کہا ہاں، تب حضور نے فرمایا

جا! اللہ نے تجھے معاف کیا۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اللہ نے تیرا گناہ معاف کر دیا، یا یہ کہ تیری حد معاف کی۔

نسائی نے اس حدیث پر ترجمۃ الباب باندھا ہے کہ جس نے حد کا اعتراف کیا اور اس کا نام نہ لیا" اس باب میں لوگوں کے تین مسلک ہیں ایک تو یہی ہے جو نسائی نے لکھا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ بات اس شخص کے لئے خاص تھی اور تیسرا یہ ہے۔ کہ پکڑے جانے سے پہلے جو توبہ کرے اس پر سے حد ساقط کر دی جائے اور یہی صحیح ترین مسلک ہے۔

(۲) حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں سارق کا ہاتھ نہیں کاٹا اور اس پر سے حد ساقط کر دی۔ سعدی نے ہارون بن اسمٰعیل الخزاز سے اور انہوں نے علی بن المبارک سے، اور انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے اور انہوں تے حسان بن زاہر سے، اور انہوں نے ابن حدیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کھجور کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ اور نہ قحط کے زمانہ میں سرقہ کی حد جاری کی جائے سعدی کہتے ہیں کہ میں نے احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ سے پوچھا، کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ضرور۔ میں نے پوچھا۔ اگر قحط کے زمانے میں چوری کی جائے تو کیا آپ ہاتھ نہ کاٹیں گے؟ انہوں نے کہا، اگر زمانہ خشک سالی کا ہو اور لوگوں پر سختی گذر رہی ہو اور ایسی حالت میں حاجت سے مجبور ہو کر کوئی شخص چوری کرے تو میں کبھی اس کا ہاتھ نہ کاٹوں گا۔

سعدی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حاطب کے غلاموں سے جو معاملہ کیا وہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے ہم سے ابو نعمان عارم نے اور ان سے حماد بن سلمہ نے اور ان سے ہشام بن عروہ نے اور ان سے ان کے والد نے اور ان سے خود حاطب کے بیٹے نے بیان کیا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا لیا۔ گرفتار ہوئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کئے گئے سب نے جرم کا اقرار کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن حاطب کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو حاطب

کے غلاموں نے ایک مُزنی کا اونٹ چرالیا ہے وہ خود جرم کے معترف ہیں اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کثیر بن الصلت سے فرمایا کہ جا اور ان کے ہاتھ کاٹ دے جب وہ ان کو لے کر چلے تو حضرت عمرؓ نے ان کو واپس بلایا اور کہا کہ خدا کی قسم مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ ان بے چاروں سے خدمت لیتے ہو اور پھر انہیں بھوکا مارتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی حرام چیز بھی کھالے تو وہ ان کے لئے حلال ہو جائے اگر میں یہ نہ جانتا ہوتا تو ضرور ان کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ مگر اب جو میں ان کو معاف کر رہا ہوں۔ تو اس کا تاوان تم پر ڈالوں گا اور ایسا تاوان وصول کروں گا جس سے تم کو قدر و عافیت معلوم ہو گی پھر اس مُزنی سے پوچھا کہ تیرا اونٹ کس قیمت کا تھا۔ اس نے کہا چار سو درہم کا۔ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن حاطب سے فرمایا کہ جاؤ اور اس کو آٹھ سو درہم دو۔

امام احمدؒ نے ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ سے اتفاق کیا ہے چنانچہ اسماعیل بن سعید الشالنجی کے مسائل میں جن کی شرح سعدی نے المترجم کے نام سے لکھی ہے۔ یہ مذکور ہے کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص کسی کے پھل چوری سے توڑ لے تو کیا سزا دی جائے گی انہوں نے جواب دیا کہ مالک کو دگنی قیمت دلوائی جائے گی اور چور کو پیٹا جائے گا۔ ہم جس کو حد یا قصاص سے معاف کرتے ہیں اس پر غرامت دگنی کر دیتے ہیں۔ اسی طرح قحط کے زمانہ میں حد سرقہ کے سقوط پر امام احمدؒ نے اوزاعی سے اتفاق کیا ہے۔ یہ محض قیاس ہے اور گو شریعت کا صریح حکم یہ نہیں ہے۔ مگر قواعد شرع کا مقتضی یہی ہے کیونکہ جب کال پڑتا ہے تو لوگ عام طور پر مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ایسی حالت میں بعید نہیں ہے کہ کسی شخص نے محض سد رمق کی خاطر مجبوراً چوری کی ہو۔ دوسری طرف خود مال کے مالک پر بھی اس حال میں واجب تھا کہ حاجت مند کو وہ مال دیتا، خواہ بقیمت یا مفت (اس باب میں اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ مفت دینا واجب ہے اس لئے کہ لوگوں کو ہلاکت سے بچانا اس پر فرض ہے جو اس کی قدرت رکھتا ہو اور محتاج کی ضرورت اگر شدید ہو تو صاحب فضل

پر ایثار واجب ہو جاتا ہے ایسی قحط سالی کے زمانہ میں چوری کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور یہ شبہہ اتنا قوی ہے کہ اس کی بنا پر قطع ید کی سزا ساقط ہونی چاہیئے، بلکہ یہ اُن بہت سے شبہات سے زیادہ قوی ہے جن کو فقہا نے سقوط حد کے لئے کافی سمجھا ہے جو شبہات وہ بیان کرتے ہیں اگر تم ان کو اور اس شبہہ کو میزان عدل میں تولوگے تو تم کو دونوں کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ مثلاً اگر مال مسروقہ کسی ایسی جنس سے ہو جو جلدی بگڑ جاتی ہو، یا وہ ان چیزوں میں سے ہو جو مباح الاصل ہیں جیسے پانی یا سارق اس کی ملکیت کا مدعی ہو۔ اور اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو یا اس شبہ کی گنجائش ہو کہ اگر وہاں مالک کے قبضہ میں رہتا تب بھی تلف ہو جاتا جیسے کھانا یا بکری کے تھنوں میں دودھ، تو ایسی صورتوں میں فقہا کہتے ہیں کہ چوری پر قطع ید کی سزا نہ دی جائیگی اب غور کرو کہ کہاں یہ شبہات، اور کہاں وہ قوی شبہ جو ہم نے بیان کیا ہے خصوصاً جبکہ حاجت مند کو شرعاً اس کی اجازت بھی دی گئی ہے کہ وہ مال کے مالک سے اس حد تک چھین کر لے سکتا ہے جو سدِ رمق کے لئے کافی ہو اور یہ معلوم ہے کہ قحط سالی کے زمانہ میں عام طور پر لوگ حاجت مند اور مضطر ہوتے ہیں اور یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون واقعی محتاج و مضطر ہے اور کون نہیں ہے، تو یہ بات بالکل مشتبہ ہو جاتی ہے کہ حالت قحط میں چوری کرنے والوں میں سے کون درحقیقت حد کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے، لہٰذا سب پر سے حد ساقط کر دی گئی۔ ہاں بتحقیق معلوم ہو جائے کہ کسی نے بغیر حاجت واقعیہ چوری کی ہے تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جائے گا۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر میں ایک صاع جَو یا ایک صاع کشمش یا ایک صاع پنیر دینے کا حکم دیا ہے۔ یہی چیزیں اس زمانہ میں اہل مدینہ کی خوراک کا غالب حصہ تھیں اگر کسی ملک یا شہر کے باشندوں کی خوراک اس سے مختلف ہو تو انہی چیزوں میں سے کوئی چیز ایک صاع دینی چاہیے جن کو عام طور پر لوگ کھاتے ہیں، مثلاً دال، چاول وغیرہ۔ اور یہ بھی کچھ ضروری نہیں کہ وہ حبوب ہی کی قسم ہو۔ اگر لوگ کچھ اور کھانے کے خوگر ہوں، مثلاً گوشت، مچھلی یا دودھ تو فطرہ بھی اسی میں سے نکالنا چاہیئے۔ یہ جمہور علماء کا

قول ہے۔ اور یہی ثواب ہے۔ اس لیے کہ اصل مقصود تو یہ ہے کہ عید کے روز مساکین بھوکے نہ رہ جائیں، اور ان تک بھی سامان خورد و نوش پہنچ جائے پس ان کو وہی چیزیں دینی چاہئیں جنہیں کھانے کے وہ عادی ہوں۔ اس لحاظ سے غلہ کے بجائے آٹا دینے میں کچھ حرج نہیں۔ اگرچہ یہ حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ رہا پکا ہوا کھانا دینا تو اگرچہ ایک لحاظ سے یہ مساکین کے لیے زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ وہ پکانے کی تکلیف سے بھی بچ جاتے ہیں مگر دوسرے لحاظ سے غلہ زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ غلہ کو وہ چاہیں تو محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں، بخلاف اس کے کھانا اگر ان کے پاس زیادہ مقدار میں جمع ہو جائے تو وہ اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ بعض لوگ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اصل مقصود تو اس روز ان کو مستغنی کر دینا اور سوال کی ذلت سے بچا دینا ہے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "آج کے دن ان کو سوال سے بے نیاز کر دو۔" حضور نے غلہ نکالنے کے لیے جو حکم فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں لوگ عید کے دن خاص طور پر کچھ پکانے کے عادی نہ تھے بلکہ عموماً سال کے دوسرے دنوں میں جو کچھ کھاتے تھے۔ وہی عید کے دن بھی کھا لیا کرتے تھے۔ بخلاف اس کے عید النحر میں قربانی کے گوشت سے قانع اور معتر کو کھلانے کا حکم دیا گیا۔ کیونکہ اس روز لوگ خاص طور پر یہی چیز کھایا کرتے تھے۔ پس اگر کسی ملک یا زمانہ میں لوگ عید الفطر کے دن خاص طور پر کچھ کھانے پکانے کے خوگر ہوں تو جائز ہی نہیں، لازم ہے کہ وہ انہی کھانوں میں سے غریبوں کو دیں۔ یہ قول بھی قابل لحاظ ہے اور اس پر عمل کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس بکری کے تھنوں میں دودھ جمع ہو اور اس کو کوئی شخص خرید کر دودھ نچوڑے اور پھر بکری کو ناپسند کر کے واپس کرے تو اس دودھ کے عوض جو اس نے نچوڑا ہے) ایک صاع کھجور بکری کے مالک کو دے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جہاں کھجور نہیں ہوتی بلکہ جہاں کے لوگوں نے کھجور دیکھی بھی نہ ہو وہ کہتے ہیں کہ ایسے مقامات پر ایک صاع کھجور کی قیمت دے دی جائے لیکن اگر کوئی شخص اپنے ملک کے غلات میں سے کوئی چیز

ایک صاع دے دے تو وہ کافی نہ ہوگا۔ اکثر شافعیہ اور حنابلہ کا قول یہی ہے۔ کہ جس طرح کھجور کی زکوٰۃ کھجور ہی ہے۔ اسی طرح بکری کا دودھ نچوڑنے کی جزا بھی کھجور کے سوا کچھ نہیں۔ گویا کہ انہوں نے دودھ کی جزا میں کھجور دینے کو عبادات میں داخل کیا ہے۔ اور اس میں وہ لفظ نص کی پیروی واجب سمجھتے ہیں۔

دوسرے علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس جگہ کھجور کے بجائے کچھ اور چیزیں غذا میں استعمال کی جاتی ہوں۔ وہاں انہی چیزوں میں سے کوئی بقدر ایک صاع دی جائے مثلاً جہاں گیہوں کا رواج ہو وہاں گیہوں اور جہاں چاول کا رواج ہو وہاں چاول۔ اور اگر کسی کے پاس کشمش یا انجیریں ہوں اور وہ ان میں سے ایک صاع کے بقدر نکال دے تو یہ بھی کافی ہوگا۔ یہی قول صحیح ہے۔ ابوالمحاسن رویانی اور بعض اصحاب احمد بن حنبل نے اسی کو اختیار کیا ہے اور مالکیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ قاضی ابوالولید نے ابن القاسم کی یہ روایت نقل کی ہے کہ عام طور پر جس ملک میں جس چیز کا رواج ہو اسی میں سے ایک صاع دینا چاہیئے۔ صاحب الجواہر نے اس مسلک کو بیان کرکے لکھا ہے کہ بعض احادیث میں لفظ تمر (کھجور) کے بجائے "طعام" کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے روایت مشہور میں صاعٌ من تمر کے جو الفاظ مروی ہیں ان کو اس معنی پر محمول کرنا جائز ہے کہ جہاں کی عام غذا کھجور ہو وہاں کے لیے یہ حکم تھا۔

لاریب کہ یہی بات شارع کے مقصود سے اقرب ہے، اور ایسا ہی حکم ان تمام معاملات میں ہے۔ جن میں شارع نے کسی خاص چیز کو کسی مقصد کے لیے متعین کیا ہو، اور اس مقصد کے لیے کوئی دوسری چیز ہر حیثیت سے اس شئے خاص کی قائم مقام ہو سکتی ہو یا کسی حیثیت سے اس کے مقابلہ میں اولیٰ ہو۔ مثلاً حضور نے استنجا کے لیے پتھر تجویز فرمایا۔ مگر پتھر کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اصل مقصد جس طرح پتھر سے حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ بہتر طریقہ سے کپڑے اور روئی اور اون سے حاصل ہوتا ہے، لہذا بدرجہ اولےٰ جائز ہونے چاہیئں۔ اسی طرح جس چیز کو کتے کا لب لگ جائے اسے دھونے کے لیے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مٹی تجویز

کی ہے ، مگر مٹی کی خصوصیت نہیں ہے ۔ راکھ اور کھلی اور ایسی ہی دوسری چیزیں بھی پاک کرنے کے لئے مفید ہو سکتی ہیں ۔ غرض یہ کہ جن معاملات میں شارع کا مقصود ہم کو معلوم ہو اور اس مقصود کو شارع کی تجویز کردہ چیز کے مانند دوسری چیزوں سے حاصل کیا جا سکتا ہو تو وہ اس کی قائم مقام ہو سکتی ہیں ۔

ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

تقلید واتباع

ازافادات علامہ ابن القیم رحمہ اللہ

تقلید کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی تقلید حرام ہے، دوسری واجب ہے اور تیسری جائز ہے مگر واجب نہیں۔

تقلید حرام کی بھی تین قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ بزرگوں سے جو طریقہ چلا آتا ہو، انسان اسی کی پیروی کیے چلا جائے اور سرے سے اس بات کی تحقیق ہی نہ کرے کہ خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ انسان کسی ایسے شخص کی تقلید کرے جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ آیا وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ اس کی بات مانی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسان کسی شخص کی تقلید کا ایسا پابند ہو کہ جب اس کے قول کے خلاف دلیل و حجت قائم ہو جائے تب بھی وہ اسی کی پیروی پر جما رہے۔ اس تیسری قسم کے مقلد اور پہلی قسم کے مقلد میں فرق یہ ہے کہ پہلا شخص تو علم نہیں رکھتا۔ اس لئے تقلید کرتا ہے، اور یہ علم رکھتا ہے، حجت اس پر ظاہر ہوتی ہے، پھر بھی تقلید کی بندش سے نہیں نکلتا اس لحاظ سے یہ زیادہ لائق مذمت ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں متعدد مقامات پر ان تینوں قسم کی تقلیدوں کی برائی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ تَتَّبِعُ مَا وَ
جَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا اَوَلَوْ كَانَ
اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا
يَهْتَدُوْنَ (البقرہ : ۲۱)

اور جب ان سے کہا گیا۔ کہ پیروی کرو اس حکم
کی جو خدا نے نازل کیا ہے تو انہوں نے جواب
دیا کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس
پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگر ان کے
باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں۔ اور طریقہ ہدایت
پر نہ ہوں تب بھی کیا وہ انہی کی پیروی کئے جائیں گے؟

وَكَذٰلِكَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوْهَا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا
عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ
مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ
بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ
اٰبَآءَكُمْ (الزخرف : ۲)

اور ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب ہم نے
تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا
بھیجا تو اس بستی کے خوشحال لوگوں نے
یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اس طریقہ
پر پایا اور ہم انہی کے قدم بہ قدم چلے جا
رہے ہیں۔ اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ اگر
میں تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر
طریقہ تمہیں بتاؤں تو کیا پھر بھی تم انہی کی پیروی کئے چلے جاؤ گے؟

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا
اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا
حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا
(المائدہ : ۱۴)

اور جب بھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی
طرف جو خدا نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی
طرف تو انہوں نے یہی کہا کہ ہمارے لئے وہی
طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا
کو پایا ہے۔

اس مضمون کی دوسری آیات بھی قرآن میں بکثرت وارد ہوئی ہیں۔ جن میں ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو تقلید اسلاف پر قناعت کر لیتے ہیں۔ اور خدا کی نازل کی ہوئی ہدایت کی طرف توجہ نہیں کرتے[1]۔

---

[1] اگر کوئی یہ کہے کہ ان آیات میں تو ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے گمراہ اور کافر اسلاف کی

پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ تقلید علم نہیں ہے۔ جیسا کہ اہل علم بالاتفاق کہتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا
لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ
تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

(الاعراف ۴۰)

کہو کہ میرے پروردگار نے تو حرام کیا ہے
بے حیائی کے کاموں کو خواہ وہ کھلے ہوں یا
چھپے اور گناہ کو اور ناروا زیادتی کرنے
کو اور اس بات کو کہ تم خدا کے ساتھ کسی
ایسی چیز کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اس
نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم خدا کے
بارے میں کوئی ایسی بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں

اور ایک جگہ فرمایا۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ
اَوْلِيَآءَ ۔

الاعراف (۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف
تمہارے پروردگار سے نازل ہوئی ہے
اور اس کے سوا اپنے بنائے ہوئے پیشواؤں
کی پیروی نہ کرو۔

تکملہ حاشیہ صـ پیروی کرتے تھے۔ پھر تم نے کس طرح ان آیات کو ایسے لوگوں پر چسپاں کر دیا جو علماء مجتہدین کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ جو کچھ تمہیں معلوم نہ ہو اسے اہل علم سے پوچھو۔ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دراصل تقلید کی اس نوعیت کو برا ٹھیرایا ہے کہ انسان خدا کی نازل کی ہوئی ہدایت سے بے پرواہ ہو کر انسانوں کی پیروی کرنے لگے۔ تقلید کی یہی نوعیت ہے جس کے مذموم اور حرام ہونے پر سلف صالح اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ رہی یہ تقلید کہ کوئی شخص اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے اتباع کی کوشش کرے اور اسکے کو سمجھنے میں ایسے لوگوں کی طرف رجوع کرے جو اس سے زیادہ علم رکھتے ہوں تو ایسی تقلید مذموم نہیں محمود ہے جیسا کہ آگے چل کر تم تقلید واجب اور تقلید جائز کی بحث میں بیان کریں گے۔

اس آیت میں صرف خدا کی نازل کردہ ہدایت کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور مقلد کا حال یہ ہے کہ وہ جانتا ہی نہیں کہ جس چیز کی پیروی وہ کر رہا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا مقلد تو ایسا ہے کہ جب دلیل و حجت سے اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے پیشوا کا قول خدا کی نازل کردہ ہدایت کے خلاف ہے۔ تب بھی وہ اس کی پیروی سے باز نہیں آتا۔ پس یہ کھلا ہوا اتباع غیر منزّل ہے۔

پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ
إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ
وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء : ۸)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس میں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔

اس آیت میں ہم کو اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے بھی تقلید کا ابطال ہوتا ہے۔

پھر فرمایا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا
يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ
وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا
رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً
(التوبہ : ۲)

کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ نے ابھی تک آزما کر نہیں دیکھا کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مومنین کے سوا کسی غیر کو اپنا معتمد علیہ نہیں بنایا

اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ولیجہ[1] اور کیا ہو گا۔ کہ کوئی شخص کسی کو اللہ اور اس کے رسول اور تمام امت کے کلام پر مختار کل بنا دے، اور ان سب پر اس کو مقدم ٹھیرائے اور کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع امت سب کو اس کے قول پر پیش کرے، پھر ان میں سے جو کچھ اس کے قول کے موافق ہو اس کو اس بنا پر قبول کرے، دلیلیں ڈھونڈے اور

---

[1] ولیجہ اس کو کہتے ہیں جس کو انسان اپنا معتمد علیہ بنائے۔

کسی نہ کسی بہانے سے اس کو رد کر کے ہی چھوڑے۔ اگر یہ بھی ولیجہ نہیں تو ہم نہیں جانتے کہ پھر ولیجہ اور کیا چیز ہے۔

پھر اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي
النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَا أَطَعْنَا اللّٰهَ
وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا وَقَالُوا رَبَّنَا
إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا
فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا۔

(الاحزاب : ۸)

جس دن آگ میں ان کے چہروں کو الٹ
پلٹ کیا جائے گا۔ تو وہ کہیں گے کہ اے
کاش ہم اطاعت کرتے اللہ کی اور اس
کے رسول کی، اور وہ کہیں گے۔ کہ
پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور
اپنے بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور
انہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔

یہ آیت بھی تقلید کا بطلان کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں تو ایسے لوگوں کی مذمت ہے جو گمراہ کرنے والوں کی تقلید کریں، پھر تم نے اسے ان لوگوں پر کیوں چسپاں کر دیا جو راہ راست کی طرف ہدایت کرنے والوں کی تقلید کرتے ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ اس کا جواب خود سوال ہی میں موجود ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے ہادی اور مہتدی ہونے کا صحیح علم اسی کو ہو سکتا ہے جو خود ہدایت کا علم رکھتا ہو۔ اب اگر کوئی شخص یہ علم رکھتے ہوئے کسی کو ہادی و مہتدی جانتا ہے اور اس کی پیروی کرتا ہے تو وہ مقلد ہی نہیں ہے اور اگر وہ اس علم سے بہرہ ور نہیں تو اسے یہ معلوم ہی کیونکر ہوا کہ کون راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے اور کون راہ کج کی طرف۔ وہ تو خود اپنے اقرار کے بموجب جاہل اور گمراہ ہے۔ کتاب و سنت کے علم سے ناواقف ہو کر وہ جس کی بھی وہ پیروی کرے گا۔ اندھی پیروی کرے گا۔ اس کا رہبر جدھر جدھر جائے گا، وہ بھی اندھوں کی طرح اس کے پیچھے چلا جائے گا، خواہ وہ سیدھے راستہ پر جائے یا غلط راستہ پر۔

مقلدین کہتے ہیں کہ دین کے معاملات میں جن ائمہ کی ہم تقلید کرتے ہیں ان کے ہدایت

پر ہونے کا خود اقرار کرتے ہو، پھر جب وہ ہدایت پر ہیں تو ان کی تقلید کرنے والے بھی قطعاً ہدایت پر ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا ان کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا خود اُن کے اپنے طریقے کے بھی تو قطعاً خلاف ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حجت کا اتباع کرتے تھے اور اندھی پیروی سے روکتے تھے، جیسا کہ ہم آگے چل کر خود انہیں کے اقوال سے ثابت کریں گے۔ پس جو شخص حجت کو ترک کرتا ہے اور اس چیز کا ارتکاب کرتا ہے، جس سے خود انہوں نے اور ان سے پہلے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے، وہ یقیناً اُن کے طریقہ پر نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مخالف ہے ان کے طریقہ پر تو وہی شخص ہے جو حجت کا اتباع کرے اور دلیل کے آگے سر جھکائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو کتاب و سنت پر مختار نہ ٹھیرا لے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص تقلید اور اتباع کو ایک چیز قرار دیتا ہے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے یا قصداً تلبیس کرتا ہے۔ تقلید دراصل اتباع سے مختلف چیز ہے۔ خود اللہ اور اس کے رسول نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور اہل علم نے ہمیشہ اس فرق کو ویسا ہی ملحوظ رکھا ہے جیسا کہ ان دونوں کی حقیقتوں میں فرق ہے۔ اتباع کے معنی یہ ہیں کہ تم نے جس شخص کو اپنا پیشوا ٹھیرایا ہے اس کے طریقہ پر چلو۔ اور جو کچھ وہ کرتا تھا وہی تم کرو۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل باب اس موضوع پر لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ فساد التقلید ونفیہ والفرق بینہ وبین الاتباع اس میں انہوں نے تقلید اور اتباع کے فرق پر خوب بحث کی ہے، لکھتے ہیں:۔

„ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات پر تقلید کی مذمت کی ہے مثلاً فرمایا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ[1]۔ حضرت حذیفہ اور دوسرے بزرگوں سے مروی ہے کہ اس آیت

---

[1] انہوں نے اپنے احبار (علما) اور رہبان (مشائخ) کو خدا کے بجائے اپنا رب بنا لیا۔

میں احبار اور رہبان کو خدا بنا لینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرنے لگے تھے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے احکام سے بے پروائی کی اور اپنے احبار اور راہبوں پر اتنا اعتماد کر لیا کہ جس چیز کو انہوں نے حلال ٹھیرا دیا اسے حلال اور جس کو حرام ٹھیرا دیا اسے حرام سمجھنے لگے۔ عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا، اے عدی اس کو پھینک دو، یہ بت ہے حضورؐ اس وقت سورہ براۃ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے جب آپ اس آیت پر پہنچے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ، تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم نے تو ان کو خدا نہیں بنایا حضورؐ نے فرمایا، ضرور بنایا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے جسے حرام ٹھیرایا اسے تمہارے احبار و رہبان حلال ٹھیرا دیتے ہیں۔ اور تم اسے حلال مان لیتے ہو اور خدا نے جسے حلال ٹھیرایا اسے وہ حرام کر دیتے ہیں اور تم اسے حرام سمجھ لیتے ہو۔ میں نے عرض کیا، یہ تو صحیح ہے آپ نے فرمایا ”بس یہی ان کی عبادت اور بندگی ہے[1] ابوالبختری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر ان کے احبار و رہبان ان سے کہتے کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہماری عبادت کرو تو وہ انکی اطاعت نہ کرتے مگر جب انہوں نے خدا کے حلال کئے ہوئے کو حرام اور اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حلال قرار دیا تو وہ اس باب میں ان کی اطاعت پر راضی ہو گئے، یہی چیز ربوبیت ہے۔ وکیع نے سفیان اور اعمش سے اور انہوں نے حبیب بن ابی ثابت سے اور انہوں نے ابوالبختری سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ سے اس آیت پر سوال کیا گیا۔ کہ نصاریٰ اپنے احبار اور رہبان کی عبادت کب کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ عبادت تو نہیں کرتے تھے مگر ان کے حلال کو حلال اور ان کے حرام کو حرام ضرور مانتے تھے۔

---

[1] یہ حدیث مسند امام احمد اور ترمذی میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ۔ اس طرح جب باپ دادا کی تقلید نے ان کو ہدایت قبول کرنے سے روک دیا تو انہوں نے رسولوں سے صاف کہہ دیا کہ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (ہم اس پیغام کو نہیں مانتے جسے تم لائے ہو) ایسے ہی لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ۔

(البقرہ ۲۰)

وہ ایسا دن ہوگا کہ جن کی پیروی کی گئی ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے برأت ظاہر کریں گے اور اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے درمیان سب تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ اور پیروی کرنے والے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع اور ملتا تو ہم ان سے اسی طرح تبرّی کرتے جس طرح انہوں نے ہم سے تبری کی ہے۔ یوں اللہ انکے اعمال ان کے سامنے لائیگا اور وہ پیکر حسرت بن جائیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ اہل کفر کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ۔

(انبیاء : ۵)

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے پایا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (الاحزاب : ۸)	اور انہوں نے کہا کہ خدایا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انہی نے ہم کو گمراہ کیا۔

اس قسم کی آیات قرآن میں بہت ہیں۔ جن میں باپ دادا اور سرداران قوم کی تقلید کو برا کہا گیا ہے۔ علماء تقلید کے ابطال میں انہی آیات سے استدلال کرتے ہیں وہ اس امر کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ آیات جن لوگوں کے حق میں آئی ہیں وہ کافر تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل جو چیز مذمت کے قابل ہے اور جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی روشنی سے آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے ہو لے اور کچھ نہ دیکھے کہ وہ کدھر جا رہا ہے حتیٰ کہ اگر اس کا پیشوا کفر کرے تو یہ بھی کافر ہو جائے اور اگر وہ گناہ کرے تو یہ بھی گناہ کرنے لگے اور اگر وہ کسی مسئلہ میں خطا کرے تو یہ بھی اس خطا میں گرفتار ہو جائے۔ اسی اندھی تقلید کے اعتبار سے کفار کی تقلید کرنے والوں اور اہل ایمان کی تقلید کرنے والوں کے درمیان مشابہت واقع ہوتی ہے دونوں میں مدارج کا فرق ضرور ہے، ایک زیادہ بری ہے اور دوسری کم، لیکن نوعیت دونوں کی ایک ہی ہے۔ اور دونوں جگہ یہی بنائے فساد ہے۔ کفار جو کفر کے خطرے میں مبتلا ہوئے تو اسی وجہ سے ہوئے کہ انہوں نے خدا کی ہدایت سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو انسانوں کے حوالے کر دیا۔ اور آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے چلنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے رہبر جوں جوں خدائی ہدایت سے ہٹتے گئے یہ بھی ان کے ساتھ ساتھ ہٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے کفر کی حد میں قدم رکھا، تو یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اسی حد میں پہنچ گئے ہیں جو لوگ خود آنکھیں کھول کر خدائی ہدایت کو نہیں دیکھتے اور بالکل دوسرے انسانوں پر اعتماد

کر لیتے ہیں۔ وہ دراصل اپنے آپ کو اسی خطرے میں ڈالتے ہیں جس میں پچھلی امتیں مبتلا ہو کر گمراہ ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُوْنَ ۔ "اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد کبھی گمراہی میں نہیں ڈالتا۔ جب تک کہ انہیں واضح طور پر یہ نہ بتا دے کہ انہیں کس چیز سے بچنا چاہیئے۔

آگے چل کر علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں۔

"جب مذکورہ بالا دلائل سے تقلید کا بطلان واضح ہو گیا تو لازم آیا کہ ان اصول کو تسلیم کیا جائے جنہیں تسلیم کرنا واجب ہے۔ وہ اصول کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور جو کچھ ان دونوں سے استدلال ماخوذ ہو"

اس کے بعد علامہ نے وہ حدیث نقل کی ہے جسے کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے۔

انی لا اخاف علیٰ امتی من بعدی الا من اعمال ثلٰثة - قالوا وَمَا هی یا رسول الله - قال اخاف علیهم من زلة العالم ومن حکم جائر ومن هوی متبع

میں اپنے بعد اپنی امت کے لیے جن چیزوں سے ڈرتا ہوں وہ بس تین ہی اعمال ہیں۔ لوگوں نے پوچھا، وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا میں ڈرتا ہوں عالم کی لغزش سے اور ظالم کے حکم سے اور ہوائے نفس کی پیروی سے۔

اور اسی اسناد سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ حضور نے فرمایا:-

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله وسنة رسوله

میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان کو تھامے رکھو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

مصنفین اہل سنت نے عموماً ابطال تقلید کے ساتھ عالم کی لغزش کا ضرور ذکر کیا ہے کیونکہ تقلید کا فساد اسی سے واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول کے سوا کوئی انسان بھی معصوم نہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے درجہ کا انسان ہو۔ اور جب وہ معصوم نہیں تو ضرور ہے کہ اس سے کہیں نہ کہیں لغزش سرزد ہو۔ اسی بنا پر یہ جائز نہیں کہ اس کے قول کو بلا دلیل و حجت تسلیم کیا جائے اور اس کی بات کو وہ درجہ دیا جائے۔ جو معصوم کی بات کو دینا چاہیئے۔ یہی چیز ہے جس کی مذمت تمام علماء نے کی ہے اور اسے حرام ٹھیرایا ہے اور اس کے مرتکبین کی مذمت کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مقلدین جن فتنوں اور بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی جڑ یہی ہے وہ ایک عالم کی تقلید ان چیزوں میں بھی کرتے ہیں جن میں اس سے لغزش ہوئی ہے اور ان چیزوں میں بھی جن میں اس سے لغزش نہیں ہوتی۔ صحیح اور غلط کے درمیان وہ تمیز کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ بلکہ تمیز کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے دین کو خطا کے ساتھ لیتے ہیں، اور ناگزیر طور پر اسی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے یعنی اللہ کے حلال کئے ہوئے کو حرام اور اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حلال کر لینا اور ان چیزوں کو مشروع بنا لینا جن کو خدا نے مشروع نہیں کیا۔ جب کوئی شخص کسی غیر معصوم انسان کی تقلید اپنے اوپر لازم کرے گا۔ اور بلا دلیل و حجت اس کی پیروی کرے گا تو لامحالہ یہ صورت ضرور پیش آئے گی اور کوئی چیز اس کو پیش آنے سے نہ روک سکیگی۔

بیہقی وغیرہ نے ابی کثیر بن عبداللہ بن عمرو سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے۔ کہ اتقوا زلۃ العالم وانتظروا فیئتہ (عالم کی لغزش سے بچو اور غلطی سے اس کے رجوع کا انتظار کرو) نیز بیہقی ہی نے دوسری حدیث مسعود بن سعد سے نقل کی ہے جسے یزید بن ابی زیاد نے مجاہد سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اَشدّ ما اتخوف علیٰ امتی ثلاث میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن چیزوں سے

زلة عالم وجدال منافق بالقرآن
ودنیا تقطع اعناقکم

ڈرتا ہوں وہ تین ہیں۔ عالم کی لغزش اور منافق کا قرآن سے استدلال اور وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ عالم کی لغزش سے خوف کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ اس لغزش میں اس کی تقلید کرنے لگیں گے اور وہ بہت سے لوگوں کو غلطی میں مبتلا کر دے گی۔ اگر تقلید کا خوف نہ ہوتا تو کسی عالم کی لغزش میں امت کے لئے خوف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شعبی کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "دنیا کو بگاڑنے والی تین چیزیں ہیں، گمراہ کرنے والے سردار۔ اور منافق کا قرآن سے استدلال۔ اور عالم کی لغزش۔

بیہقی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے، جس کو حماد بن زید نے مثنیٰ بن سعید سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا، پیروی کرنے والوں کے لئے عالم کی لغزشوں میں بڑا خطرہ ہے پوچھا گیا، وہ کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ عالم ایک بات اپنی رائے سے بیان کر دیتا ہے۔ پھر اس کو نبی صلی اللہ وسلم کا کوئی ارشاد پہنچ جاتا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنی پہلی رائے سے رجوع کر لیتا ہے مگر پیروی کرنے والا اس کے پہلے قول ہی کا اتباع کئے جاتا ہے۔

تمیم الداری کا قول ہے کہ عالم کی لغزش سے بچو، پوچھا گیا اس میں ڈرنے کی کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا، یہ کہ عالم لغزش کرے اور لوگ اس کے پیچھے چل پڑیں اس لئے کہ بسا اوقات عالم کو خود اپنی غلطی پر تنبہ ہو جاتا ہے اور وہ اس سے رجوع کر لیتا ہے مگر لوگ اسی غلطی قائم رہتے ہیں۔

شعبہ نے عمرو بن مرہ سے اور انہوں نے عبداللہ بن سلمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اے قوم! تم تین خرابیوں کا کیا علاج کرو گے، ایک وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے۔

دوسرے منافق کا قرآن سے استدلال، تیسرے عالم کی لغزش ؟ لوگ خاموش رہے حضرت معاذ نے پھر فرمایا، عالم کی لغزش کا علاج یہ ہے کہ کوئی عالم اگر ہدایت پر بھی ہو تب بھی اندھے بن کر اپنے دین کو بالکل اس کے ہاتھ میں نہ دے دو۔ اور اگر وہ غلطی میں پڑا ہوا ہو تو اس کے مقابلہ میں تحمل کو ہاتھ سے نہ دو کیونکہ مومن ایک دفعہ فتنہ میں پڑ جاتا ہے، پھر اس سے توجہ کر لیتا ہے۔ رہا قرآن تو وہ ایک منارہ ہے، جیسے راستوں میں منارے ہوتے ہیں کہ وہ کسی سے مخفی نہیں ہوتے ہیں جو بات تم کو قرآن سے معلوم ہو جائے اس کو کسی سے نہ پوچھو اور جس میں تمہیں شک ہو اسے جاننے والے سے پوچھ لو، رہی دنیا تو فلاح وہی پا سکتا ہے۔ جسے خدا کی طرف سے قناعت کی توفیق مل جائے۔ ورنہ حریص کی پیاس تو کبھی دنیا سے بجھ نہیں سکتی۔

اسی کے قریب قریب حضرت سلمان فارسی کا قول بھی ہے بوالبختری نے روایت کیا ہے اور ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ حکما نے عالم کی لغزش کو کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس لئے کہ کشتی جب ڈوبتی ہے تو اس کے ساتھ ایک خلقت کی خلقت ڈوب جاتی ہے۔ اس قول کو نقل کرنے کے بعد ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جب یہ صحیح اور ثابت ہے کہ عالم سے خطا اور لغزش سرزد ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے لئے کسی انسان کے قول پر فتوٰی یا اس کی رائے پر چلنا جائز نہیں تاوقتیکہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا قول کس حجت پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے بزرگ کا قول ہے کہ جس طرح قاضی تین قسم کے ہیں۔ اور ان میں سے دو ناری اور ایک جنتی ہے اسی طرح مفتی بھی تین قسم کے ہیں۔ اور ان میں دو ناری ہیں اور صرف ایک جنتی ہے۔ قاضی اور مفتی میں فرق اتنا ہے کہ قاضی پر اس کے فیصلے کا الزام آتا ہے اور مفتی پر نہیں آتا۔

ابو ذرعہ عبدالرحمٰن بن عمر بصری نے ابو مسہر سے اور انہوں نے سعید بن عبدالعزیز سے اور انہوں نے اسماعیل بن عبیداللہ سے اور انہوں نے سائب بن یزید بن اخت نمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگوں کی باتیں بہت

بری اور تمہارا کلام بہت خراب ہے تم آپس میں باتیں کرتے ہو، فلاں کا قول یہ ہے اور فلاں یہ کہتا ہے۔ مگر کتاب اللہ کا ذکر کہیں نہیں آتا تم میں سے جو کھڑا ہونا چاہتا ہے وہ کتاب اللہ کو لے کر اٹھے ورنہ بیٹھا رہے۔ دیکھو! حضرت عمر یہ بات اس زمانہ کے لوگوں سے کہہ رہے ہیں۔ جو تاریخ میں بہترین دور سمجھا جاتا ہے۔ اگر آج وہ دیکھتے کہ لوگ کس طرح کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر عمرو زید کی باتیں کرتے ہیں تو نہ معلوم وہ کیا فرماتے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کمیل بن زیاد النخعی سے جو کچھ فرمایا تھا وہ بھی قابل غور ہے۔ یہ حدیث اہل علم میں اس قدر مشہور ہے کہ اس کی اسناد نقل کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ نے فرمایا اے کمیل! یہ دل گویا ظروف ہیں اور ان میں بہترین ظرف وہ ہے جس میں بھلائی کے لئے زیادہ گنجائش ہو۔ لوگ تین طرح کے ہیں۔ ایک عالم ربانی دوسرے متعلم جو نجات کے راستہ پر چلتا ہو تیسرے حشرات الارض جو ہر شور مچانے والے کے پیچھے چل پڑیں کہ ہر بلند بانگ کے گرد جمع ہو جائیں۔ وہ نہ کبھی نور علم سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اور نہ کبھی کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ پھر اپنے سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا آہ! اس میں جو علم ہے کاش مجھے اس کے لینے والے ملتے۔ مگر افسوس کہ مجھے یا تو وہ لوگ ملتے ہیں جو سمجھ تو رکھتے ہیں لیکن دین کو دنیا کے لئے آلہ بنانے والے اور اللہ کی کتاب پر حجتوں سے دست درازی کرنے والے اور اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں استعمال کرنے والے ہیں یا پھر ایسے لوگ ملتے ہیں جو حق کے پرستار تو ہیں، مگر بصیرت نہیں رکھتے۔ شک پہلا موقع پاتے ہی ان کے دلوں میں گھس جاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ حق کہاں ہے۔ جب بولتے ہیں تو غلط بولتے ہیں۔ اور جب غلطی کرتے ہیں تو اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے۔ وہ ان چیزوں میں مشغول رہتے ہیں جن کی حقیقت کو وہ نہیں جانتے۔ ایسے لوگ ایک فتنہ ہیں۔ سب سے بڑی بھلائی یہ ہے کہ اللہ کسی کو اپنے دین کی سمجھ عطا کرے اور انسان کے لئے بدترین جہالت یہ ہے کہ وہ اپنے دین کو نہ سمجھے۔

ابوالبختری حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ خبردار لوگوں کے طریقہ کو اپنے لئے سنت نہ بناؤ۔ ایک شخص اہل جنت کا سا عمل کرتا ہے پھر وہ یکایک پلٹ جاتا ہے۔ اور اہل دوزخ کے سے اعمال کرنے لگتا ہے اور اسی حال پر مر جاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اہل دوزخ کا سا عمل کرتا ہے، پھر اللہ اس کا دل پھیر دیتا ہے اور وہ اہل جنت کے سے عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اسی راہ میں اسے موت آتی ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا دین کسی دوسرے شخص کے قبضہ میں نہ دیدے کہ اگر وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن ہوا اور اگر وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ غلطی میں کسی کی بھی پیروی نہ کرنی چاہیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اہل علم گذر جائیں گے پھر لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دینے لگیں۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔

یونس بن عبدالاعلیٰ اپنے استاد سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ربیعہ سر جھکائے رو رہے تھے، پوچھا گیا کہ رونے کا سبب کیا ہے۔ فرمایا ظاہر میں ریا ہے اور باطن میں شہوات ہیں۔ علماء کے سامنے لوگوں کا حال بچوں کا سا ہو گیا ہے جس چیز کو وہ حرام ٹھیرا دیتے ہیں وہ حرام ہو جاتی ہے اور جسے مشروع قرار دیتے ہیں وہ مشروع بن جاتی ہے۔

عبداللہ بن المعتمر کہتے ہیں کہ حیوان منقاد اور انسان مقلد میں کوئی فرق نہیں۔ پھر وہ ابن وہب سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس کو انہوں نے سعید بن ابی ایوب سے اور انہوں نے بکر بن عمر سے اور انہوں نے عمرو بن ابی نعیمہ سے اور انہوں نے مسلم بن یسار سے اور انہوں نے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کسی نے میری طرف سے ایسی بات بیان کی، جو میں نے نہیں کہی ہے۔ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں ڈھونڈھ لے۔ اور اگر کوئی اپنے بھائی سے مشورہ لے اور وہ اس کو بے جانے بوجھے رائے دیدے تو گویا اس نے اپنے بھائی سے خیانت کی۔ اور اگر کوئی بغیر ثبوت

کے فتویٰ دے دے تو جو لوگ اس کے فتوے سے غلطی سے مبتلا ہوں گے ان کا وبال اسی فتوے دینے والے پر ہو گا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ تقلیداً فتویٰ دینا حرام ہے، اس لئے کہ اس قسم کا فتویٰ بے ثبوت ہی ہے۔ ثبوت کے معنی بالاتفاق یہ قرار دیئے گئے ہیں۔ کہ ایسی حجت جس سے حکم ثابت ہوتا ہو۔ پس جب کہ انسان کا قول حجت ہی نہیں ہے تو اس کی بنیاد پر جو فتویٰ ہو گا وہ بے ثبوت نہیں تو اور کیا ہوا۔

ابو عبداللہ بن خواز منداد البصری المالکی نے لکھا ہے کہ اصطلاح شرعی میں تقلید کے معنی ہیں کسی شخص کے قول کی طرف رجوع کرنا بغیر اس کے کہ اس کی حجت معلوم کی یہ شریعت میں ممنوع ہے اور اتباع کے معنی ہیں کسی شخص کی حجت کو قبول کر کے اس کے قول کی پیروی کرنا۔ یہ فعل شرعاً جائز ہے ایک دوسری جگہ یہی بزرگ لکھتے ہیں کہ جب تم نے کسی شخص کے قول کی پیروی اختیار کی بغیر اس کے کہ کوئی دلیل ایسی ہو جس کی بنا پر تم اس کی بات مان رہے ہو تو تم اس کے مقلد ہوئے اور اللہ کے دین میں ایسی تقلید درست نہیں اور اگر تم کسی شخص کی دلیل سے مطمئن ہو کر اس کے قول کی پیروی کرو۔ تو یہ اتباع ہے، اور اتباع شریعت میں درست ہے۔

محمد بن حارث نے سحنون بن سعید کے حالات میں خود سحنون سے یہ روایت نقل کی ہے۔ کہ امام مالک اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور محمد بن ابراہیم بن دینار وغیرہم اکثر ابن ہرمز کے پاس جایا کرتے تھے ابن ہرمز کا طریقہ یہ تھا کہ جب مالک اور عبدالعزیز کچھ پوچھتے تو وہ اس کا جواب دے دیتے اور جب ابن دینار اور ان کے ساتھی کچھ پوچھتے تو وہ جواب نہ دیتے۔ ایک روز ابن دینار نے ان سے شکایت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ بھتیجے میں بڈھا آدمی ہوں، مجھے ڈر ہے کہ جس طرح میرے جسم میں انحطاط پیدا ہو گیا ہے ممکن ہے کہ میری عقل میں بھی ہو گیا ہو۔ مالک اور عبدالعزیز عالم اور فقیہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے جو بات سنیں گے وہ اگر حق ہو گی تو قبول کریں گے اور اگر غلط ہو گی تو رد کر دینگے تم لوگوں سے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا اسے مانتے چلے جاؤ گے۔ اس واقعہ

کو نقل کرکے ابن حارث لکھتے ہیں کہ یہ ہے اہل حق کا طریقہ، نہ یہ کہ انسان جو کچھ بزبان نکلے اسے چاہیے کہ لوگ اس طرح قبول کریں جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے۔

"تمام بزرگان سلف اور ائمہ اربعہ کا یہی طریقہ تھا کہ وہ لوگوں کو خود اپنی تقلید سے منع کرتے تھے کہ ہماری بات کو دلیل و حجت کے بغیر تسلیم نہ کرو۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جو شخص علم کو حجت کے بغیر لیتا ہے۔ اس کی مثال رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والے کی سی ہے کہ وہ لکڑیوں کو بغیر دیکھے بھالے اٹھاتا جاتا ہے اور اسے خبر نہیں کہ ان میں کہاں کوئی سانپ چھپا ہوا ہے جو اسے ڈس لے گا۔

ابو داؤد نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ امام احمد سے کہا اوزاعی تو مالک سے مقدم ہیں انہوں نے جواب دیا کہ "تم اپنے دین کو ان میں سے کسی کے بھی حوالہ نہ کرو۔ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے ثابت ہو جائے اس کو قبول کر لو۔ ان کے بعد تابعین کے اقوال میں تمہیں اختیار ہے۔ جسے چاہو قبول کرو۔ اور جسے چاہو رد کردو۔

امام احمد نے تقلید اور اتباع میں فرق کیا ہے ابو داؤد ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اتباع یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے جو کچھ ثابت ہو اس کی پیروی کی جائے، بعد کے کسی شخص کا قول حجت نہیں ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ تم نہ میری تقلید کرو نہ مالک کی نہ ثوری کی نہ اوزاعی کی بلکہ جہاں سے ہم نے لیا ہے وہیں سے تم بھی لو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی ناسمجھی کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دیدے۔

بشر بن ولید نے امام ابو یوسف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی شخص کے لئے ہمارے قول کا اتباع جائز نہیں تاوقتیکہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔

ترجمان القرآن - ربیع الاول ۱۳۵۲ ہجری

تقلید شخصی کے شرعی حدود

(از افادات علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ

(۱) کیا ایک امام کا مقلد دوسرے امام کے پیرووں کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے؟ کیا اس سے اجتناب کرنا بدعت اور گمراہی ہے؟ اور کیا ایک شخص کسی ایسے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ جو نماز میں ایسے امور کی بالکل رعایت نہ کرتا ہو جن کی فرضیت اور وجوب تک کا وہ مقتدی قائل ہے؟ مثلاً مقتدی بسم اللہ اور تشہد کی فرضیت کا قائل ہے، قے، رعاف اور حجامت کو نواقض وضو میں سے مانتا ہے، لیکن امام عملاً اور اعتقاداً ان باتوں کی بالکل رعایت نہیں کرتا، اور مقتدی کو اس بات کا علم بھی ہے۔

(۲) ایک مقلد بعض ارکان نماز میں اپنے امام کی مخالفت کرتا ہے۔ کیا یہ مخالفت اس کے "تذبذب" پر دلالت کرتی ہے۔ اور کیا اس کی یہ مخالفت اس (امام کے) مذہب کے اندر بدعت کا فتنہ قرار دی جائے گی؟

(۳) ایک شخص کسی امام کے مذہب کا مطالعہ کرتا ہے، اس میں تفقہ اور بصیرت حاصل کرتا ہے، پھر اس کے سامنے ایسی احادیث آتی ہیں۔ جو صحیح اور مستند ہیں، نسخ اور تخصیص کے شکوک سے بالاتر ہیں۔ دیگر نصوص شرعیہ سے ان کا کوئی معارضہ

بھی نہیں، لیکن امام کی تقلید میں جو مذہب اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ حدیثیں اس کی مخالفت کرتی ہیں۔ تو کیا ایسی صورت میں اس مذہب کا اتباع جائز ہو سکتا ہے۔ یا اس شخص کے لیے احادیث کا اتباع ضروری ہے؟

شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

(۱) اختلاف مذہب کے باوجود نماز بلا کسی نقص اور کراہت کے ہو جائے گی۔

ایسے تمام مسائل میں سلف اپنی رائیں الگ الگ رکھتے تھے، لیکن صحابہؓ، تابعینؒ، ائمہ اربعہؒ اور دیگر تمام علمائے سلف سب کے سب بلا لحاظِ اختلاف ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ اور کسی کا ذہن بھی ان اوہام سے دوچار نہ ہوا، انکار تو درکنار، وہ لوگ بھی جنہیں معلم شریعتؐ کو بالکل قریب سے دیکھنے اور سراج نبوت سے براہ راست روشنی حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، اگرچہ مذکورہ بالا مسائل میں اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کی اقتدا سے کبھی کسی نے احتیاط روا نہ رکھی۔ احناف اور امام شافعیؒ وغیرہ علما، مالکی ائمہ کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ خلیفہ رشید نے پچھنے لگوائے اور حسب رائے امام مالکؒ بغیر تجدید وضو نماز کے لئے کھڑا ہو گیا، لیکن امام ابو یوسف نے اس کی اقتدا میں نماز پڑھی اور کوئی لیت و لعل نہ کی۔ امام احمد بن حنبلؒ رعاف اور حجامت کو ناقض وضو مانتے ہیں، لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد از سر نو وضو نہ کیا ہو؟ امام علّام نے فرمایا کیوں نہیں، سعید ابن المسیب اور امام مالک کے پیچھے تو میں برابر نمازیں پڑھتا ہوں۔

صحابہ کرام، تابعین اور تمام ائمہ سنت کا یہ اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص اس روشنی کے اتباع سے گریز کرتا ہے، بدعت کے زہر سے اس کا ذہن مسموم ہو چکا ہے، ہدایت کا وہ بدترین دشمن اور کتاب و سنت اور اجماع سلف کا کھلا ہوا منکر ہے۔

اب اس مسئلہ کے تمام امکانی پہلوؤں پر پھیل کر ایک گہری نظر ڈالو اس اختلاف

کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مقتدی اس بات سے بالکل بے خبر ہو کہ امام سے ایسے افعال سرزد ہوئے ہیں جو نماز کو باطل کر دینے والے ہیں۔ ایسی صورت میں ائمہ اربعہ اور علمائے متقدمین یک زبان ہو کر فرماتے ہیں کہ اس کی نماز میں کوئی قباحت نہیں۔ ہاں بعض متاخرین نے جن کے دماغوں پر تعصب اور جہالت کا کابوس سوار ہے، اس کی بھی مخالفت کی اور کہہ گئے کہ حنفی کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ خواہ وہ تمام واجبات کو ادا ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ کیونکہ عملاً انہیں ادا کرنے کے باوجود وہ ان کے وجوب کا تو قائل نہیں ایسی لایعنی باتوں پر کان دھرنے سے پہلے ضرورت ہے کہ اس مفتی کو اہل بدعت کی طرح توبہ کی دعوت دی جائے۔ نماز کچھ آج ہی سے نہیں پڑھی جا رہی ہے۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں بھی نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔ اور ہر مسلک کا آدمی دوسرے مسلک والے کے پیچھے بے تکلف نماز پڑھتا تھا۔ حالانکہ اکثر ائمہ بالکلیہ فرائض و سنن کی کوئی تفصیل اپنے ذہن میں رکھتے ہی نہ تھے، بس شرعی نماز ادا کر دیتے تھے۔ اگر ان تدقیقات کا علم و اعتقاد نماز کے لئے ضروری مان لیا جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ امت کا سواد اعظم تمام عمر نماز پڑھنے کے باوجود بے نمازی اور نافرمان ہی رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک طرح کی تکلیف مالا یطاق ہے۔ ایسی احتیاط سرے سے ممکن ہی نہیں۔

(۲) دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مقتدی کو معلوم ہو کہ امام سے ایسے افعال سرزد ہوئے ہیں جو اس (مقتدی) کے نزدیک جائز نہیں، مثلاً امام نے فصد لی یا قے کی اور وضو کئے بغیر مصلائے امامت پر آ کھڑا ہوا۔ ایسی صورت میں فقہاء کی دو رائیں ہیں۔ بعض احناف امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا خیال ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ وہ تو امام ہی کی نماز نہ ہونے پر اعتقاد رکھتا ہے۔ پھر اس کی نماز کیونکر ہوگی۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس صورت حال میں بھی اس مقتدی کی نماز ہو جائے گی۔ تمام ائمہ سلف اور امام مالک کا یہی خیال ہے، بلکہ امام شافعی، احمد اور ابو حنیفہ سے بھی بعض سلسلے

یہی روایت کرتے ہیں اور یہی خیال صحیح اور موافق سنت ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ :-

> "آپ نے فرمایا، تمہارے امام تمہاری نمازیں پڑھاتے ہیں، اگر انہوں نے ٹھیک ٹھیک نماز ادا کی تو تم اور وہ دونوں مستحق اجر و ثواب ٹھیرے۔ اور اگر انہوں نے نماز میں لغزشیں کیں تو تمہارا اجر تو گیا نہیں، وہ البتہ ماخوذ ہوں گے۔"

دیکھو! رسول اللہ صلعم نے کس طرح کھول کر فرما دیا ہے کہ امام کی کوتاہیاں مقتدی پر کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔

پھر ایک اور پہلو سے غور کرو حقیقت اور زیادہ نکھر کر سامنے آجائے گی۔ مقتدی کو یہ بات تو معلوم ہے کہ امام کا یہ طرزِ عمل خود امام کے خیال اور اعتقاد کے مطابق بالکل جائز ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اس طرزِ عمل پر کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ اس رائے میں یا تو وہ امام بذاتِ خود مجتہد ہوگا بصورتِ اول، یہ بات معلوم ہے کہ اجتہاد کی خطا بھی باعثِ اجر و مغفرت ہوتی ہے، لہٰذا اس کی نماز کی صحت یقینی ہے۔ بصورتِ دیگر خطا و صواب کی تمام ذمہ داری اس امام پر ہوگی جس کا وہ مقلد ہے۔ اس کے مذہب کے پیشوا نے اگر غلطی کی ہے تو اس کی پاداش میں خود اس بیچارے کے اعمال نہیں ضائع ہو سکتے۔ بہرحال اگر امام نے کسی مجتہد کی تقلید میں یا اپنے ذاتی اجتہاد کی رہنمائی میں کوئی فعل اختیار کیا اور مقتدی نے اپنے واجبات کو اپنے طور پر ادا کر لیا۔ تو اب اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا یقیناً لا یکلف اللّٰہ نفسًا الّا وسعہا کی صریح مخالفت ہے۔ نمازیں دونوں کی ہوگئیں اور دونوں نے تکلیف شرعی کے حقوق ادا کر دیئے درانحالیکہ ظاہری افعال میں امام و مقتدی کی موافقت بھی پوری موجود ہے۔

اور مخالفین کا یہ کہنا تو بالکل ہی غلط ہے۔ کہ مقتدی کو امام کی نماز باطل ہوجانے کا یقین ہے۔ کیونکہ مقتدی اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہے کہ امام نے وہ تمام افعال پورے کر دیئے ہیں جو اس پر واجب تھے اور اگر اس کے علم و اجتہاد نے کوئی لغزش کھائی

بھی ہے تو خدا اسے معاف کر دے گا۔ اس کی نماز پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ تم دیکھتے ہو کہ بعض اوقات امام کو نماز میں سہو ہو جاتا ہے اور اس کی متابعت میں مقتدی بھی اس سہو کا ارتکاب جانتے ہوئے کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن ان کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ تو پھر جب صرف امام ہی اکیلا ایک غلطی میں گرفتار ہو تو مقتدیوں کی نماز کیوں خراب ہو گی پس اقتدار کے شرائط میں سے یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ امام کے حالات اور اعتقادات کا جائزہ لیا جائے، بلکہ ایک اجنبی شخص کے پیچھے بھی جس کے متعلق مقتدی کو کچھ بھی واقفیت نہ ہو نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ امام کے اتباع سے اس وقت تک بالکل انکار نہ کریں جب تک وہ نماز میں ایسے افعال نہیں کرتا جس کی کوئی اصل شریعت میں سرے سے موجود ہی نہ ہو، کیونکہ شارع کا ارشاد ہے کہ "امام بنایا ہی اسی لئے گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے" اگر امام نماز میں رفع یدین کرتا ہے اور مقتدی نہیں کرتا یا مقتدی کرتا ہے امام نہیں کرتا، یا دونوں کرتے ہیں، یا ایک شخص بعض وقت ہاتھ اٹھاتا ہے اور بعض اوقات نہیں اٹھاتا، ان تمام باتوں سے کسی کی نماز میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ کسی خاص امام کی رائے کو مذہبی شعار قرار دے کر اس کے اتباع کو واجب کہے اور اس کے خلاف جو مستند حدیثیں مروی ہیں ان کے اتباع کو رد کرے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ رسول پاکؐ سے جو کچھ اور جس قدر ثابت ہے اس کی وسعت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ مثال کے طور پر اذان و اقامت کو لو، کہیں تو مروی ہے کہ آپؐ نے اذان میں ہر کلمہ کو دہرانے اور اقامت میں صرف ایک ایک بار کہنے کا حکم دیا اور کہیں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اذان اور اقامت دونوں میں دہراؤ۔ اب اس وسعت کے پیش نظر جو شخص اقامت کے اندر ان کلمات ماثورہ کو دہراتا ہے وہ بھی حق پر ہے۔ اور جو صرف ایک ہی بار کہتا ہے وہ بھی حق پر لیکن جو شخص اس وسعت میں تنگی پیدا کرتا ہے، اور دونوں طریقوں میں سے ایک ہی کو واجب العمل اور منصوص قرار دیتا ہے وہ راہ حق سے بھٹکا ہوا ہے اور سنت پر ظلم کرتا ہے لیکن آج پورا عالم اسلامی اس

بدبختی اور گمراہی کا شکار ہے اتنی بڑی امت کا کوئی شیرازہ ہی نہیں۔ ہر ایک تعصب کے نشۂ باطل سے سرگراں ہے۔ صرف اپنے ہی امام کو سب کچھ سمجھ کر دوسرے تمام ائمہ دین اور مجتہدین ملت کو کچھ نہ سمجھنا پکے ایمان کی نشانی قرار پا چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس اختلاف اور تشتت سے اسلام نے بار بار منع کیا تھا، وہی آج مسلمانوں کا طغرائے امتیاز، بلکہ قومی شعار بن چکا ہے ایسے متشدد دین، سب کے سب قابل نفرین، گمراہ، ہوا پرست اور ہدایت سے یک لخت نا آشنا ہیں۔ ان میں اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں کہ اتحاد ملی اور ایک مرکز سے وابستگی دین کے بنیادی اصول میں سے ہے اور جن چھوٹی چھوٹی اختلافی باتوں پر وہ فرقہ بندیاں اور ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے ہیں وہ دین کے خفیف ترین فروع میں سے ہیں۔ جڑوں کو کاٹ کر شاخوں کو ہری رکھنے کی کوشش کرنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

لطف یہ ہے کہ ان دلدادگان تعصب کو کتاب و سنت سے کچھ یوں ہی سا واسطہ ہے۔ ان کے استدلال کی پوری عمارت ضعیف روایتوں، چند سنی سنائی باتوں اور بعض علما اور شیوخ کی طرف منسوب کی ہوئی آرا پر قائم ہے، جو آرا علماء سلف کی طرف منسوب ہیں ان کے متعلق جزم کے ساتھ یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ انہیں کی ہیں بہت ممکن ہے کہ اس انتساب میں جھوٹ اور افترا سے کام لیا گیا ہو۔ اور اگر انہیں صحیح بھی مان لیا جائے تو آخر وہ علما معصوم تو نہیں۔ عصمت تو محض مقام نبوت کے لئے مخصوص ہے، جہاں کا ہر قول وحی الٰہی اور ہر رائے حق کی ترجمان ہے۔ اور صرف وہی ایک مرکز ہدایت ہے جس کی کامل اطاعت ہر انسان پر فرض کی گئی ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کی ایک ادنیٰ سی مخالفت کرنا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ الخ

(۲) اگر ایک شخص کسی امام کا مقلد ہے، لیکن بعض مسائل میں کسی دوسرے امام

کی رائے اُسے زیادہ صائب اور قوی نظر آتی ہے، اس لیے وہ تقلید جامد کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر اپنے یقین کے مطابق دوسری رائے کا اتباع کرتا ہے، تو اس کا یہ طرزِ عمل روحِ اسلام کے بالکل مطابق ہے، اس کی دیانت اور عدالت پر باتفاق علما کوئی رد و قدح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ اس اندھے مقلد کی بہ نسبت حق سے زیادہ قریب اور اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک زیادہ محبوب ہے، جو نبیؐ معصوم کے ساتھ ساتھ کسی امام معین کو بھی واجب الاتباع سمجھتا ہے اور ہر اس رطب و یابس کو جس کی نسبت اس کے امام کی طرف ہے دوسرے آئمہ کی راویوں کے مقابلہ میں ضروری الاطاعت سمجھتا ہے، خواہ وہ رائیں اپنے اندر کتنی ہی زیادہ صداقت اور محکم دلیلیں کیوں نہ رکھتی ہوں۔ تقلید کے باب میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ عامی کے لیے کسی امام کا اتباع جائز یا بہتر یا واجب ہے۔ لیکن کسی خاص امام کی تعیین نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی مسلم کر سکتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص تمام ائمہ سے حسنِ عقیدت رکھتا ہو اور ہر ایک کی اس رائے کی پیروی کرتا ہو جو اس کے نزدیک کتاب و سنت سے زیادہ اقرب اور اوفق معلوم ہوتی ہو، وہ حق کی روشن ترین شاہراہ پر ہے اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہدایت اسے حاصل ہے۔ اس پر نفاق اور تذبذب کے اتہام لگانا انتہائی شقاوت ہے۔ تذبذب و نفاق اور رسوخِ ایمان کی حقیقت قرآن و سنت میں بار بار بیان کی گئی ہے، وہاں تذبذب کا معیار رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسائل نہیں ہیں بلکہ حب للہ و بغض للہ ہے (اس کے بعد شیخ نے آیات و احادیث سے اس کی تفصیل بیان کی ہے)

ائمہ دین کا راستہ تو صحابہؓ کا راستہ ہے۔ صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ حق کی محبت انہیں ایک شیرازے میں باندھے ہوئے تھی، جس کا نام حبل اللہ ہے۔ اگر بعض فروعِ شرعیہ میں وہ باہم دگر مختلف ہوئے تو ان کا اختلاف بھی فیضانِ رحمت اور اگر کسی ایک رائے پر سب متفق ہو گئے تو یہ اتفاق یا اجماع بھی ہمارے لیے شرعی حجت۔ اب جو شخص تعصب کی بیماری میں مبتلا ہو کر تمام ائمہ کو چھوڑ کر ایک ہی امام

کو واجب الاتباع اور مرکز ہدایت سمجھتا ہے اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہے۔ جو تمام اصحاب رسول کو چھوڑ کر ایک خاص اصحابی میں رشد وہدایت کو مرکوز کر دیتا ہے مثلاً روافض جو حضرت علیؓ کے تعصب میں خلفائے ثلٰثہ بلکہ جمہور صحابہؓ کو نعوذ باللہ کیا کچھ نہیں کہتے اور سمجھتے، یا خوارج جو حضرت علی وعثمان رضی اللہ عنہما کو دائرہ اسلام میں رکھنے تک سے انکاری ہیں۔ ایسے لوگوں کو حق اور ہدایت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ بدعت کے علمبردار اور ہوا پرستی کے امام ہیں۔ جن پر قرآن نے لعنت برسائی۔ اور سنت نے نفرین بھیجی ہے۔ انہوں نے جو راہ اختیار کی وہ رسول کی بتائی ہوئی راہ سے بالکل مختلف ہے۔ پس جو کوئی بھی کسی خاص امام کے بارے میں تعصب کو اپنا شیوہ قرار دیتا ہے۔ وہ اک گونہ ان گمراہوں سے تشبہ اختیار کرتا ہے خواہ وہ حنفی ہو یا مالکی، شافعی ہو یا حنبلی یا کسی اور کا مقلد۔

اب ایسے اندھے متعصب کے انجام پر ایک نگاہ ڈالو، ایک طرف تو وہ تعصب کی اس سرشاری میں خدا کے عطا کردہ علم دین سے بےخبری کا ثبوت دیتا ہے دوسری طرف وہ دیگر ائمہ ومجتہدین کے مقام علم وعرفان سے غفلت برتتا بلکہ انکار کرتا ہے گویا بیک حرکت جہل اور ظلم دوگناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ ہمیں علم اور عدل کا حکم دیتا اور ظلم وجہل سے روکتا ہے کہ فسق وفجور، تمرد وطغیان اور فتنہ وفساد کے یہی دو سرچشمے ہیں۔ جن سے دامن بچانا ہی اللہ تعالےٰ کی امانت کا ایفا ہے جس نے فرمایا ہے: وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِيْنَ الی آخر السورہ۔

امام ابو یوسف اور امام محمد سے بڑھ کر امام ابو حنیفہ کا پیرو اور ان کے اقوال کا صحیح علم رکھنے والا کون ہو سکتا ہے لیکن انہوں نے بےشمار مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے، کیونکہ دلائل اور سنن کی روشنی انکے سامنے پھیلتی گئی۔ اور انہیں وہ چیزیں ملتی گئیں جن کا اتباع کسی غیر معصوم انسان کے اقوال کے مقابلہ میں راجح اور ضروری تھا۔ مگر اس اختلاف کے باوجود وہ حنفی ہیں اور ان سے بڑھ کر امام کا قدر شناس اور عاشق کوئی

نہیں۔ انہیں تذبذب کا بیمار کون کہہ سکتا ہے۔ ذرا آگے بڑھو خود امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ مجتہدین کو دیکھو، وہ کس طرح ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب اس رائے کے خلاف دلائل سامنے آتے ہیں تو بلا تکلف اپنی پہلی رائے کو چھوڑ کر دوسرا مسلک اختیار کر لیتے ہیں اور انہیں کوئی تذبذب نہیں کہتا۔ کیونکہ حقیقت کی تلاش اور علم وایمان کی جستجو ہی تو انسانیت کا جمال ہے۔ اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے کہ تم ازدیاد علم کی دعا مانگو۔ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔

خلاصہ کلام یہ کہ مومن کے لئے ضروری ہے کہ تمام مومنین اور علماء سے موالات رکھے۔ سیح کی ٹوہ میں رہے اور اسے جہاں پائے اپنا لے، اور یقین رکھے۔ کہ مجتہد کی رائے اگر ٹھیک ہے تو اسے دو اجر اور اگر غلط ہے تو ایک اجر ضرور ملے گا اور اس کی خطا بہرحال معاف ہے۔

(۳) کتاب وسنت اور اجماع امت سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بنی نوع انسان پر صرف اپنی اور اپنے رسولِ معصوم کی اطاعت فرض کی ہے۔ رسول کو چھوڑ کر کسی بڑے سے بڑے انسان کی اطاعت بھی اس کے تمام اوامر ونواہی میں اس امت پر واجب نہیں حتیٰ کہ وہ جسے صدیق امت کہا گیا، انبیاء کے بعد جس کی فضیلت تمام انسانوں پر مسلم مانی جاتی ہے۔ جو صبغۃ اللہ کا پیکر اور مقام رسالت کا سب سے بڑا رمز شناس تھا وہ بھی کہا کرتا تھا کہ جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں۔ تم میری اطاعت کرو لیکن جب میں اس کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم بھی میری اطاعت سے آزاد ہو۔ اور اس پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر کوئی بشر بھی امر ونہی کے تمام احکام میں معصوم نہیں ہو سکتا۔ غلطی تو بشریت کا خاصہ ہے۔ اسی بناء پر بعض ائمہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہر انسان کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ تو لے لینے کے قابل ہیں اور کچھ ترک دینے کے، الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم نے خود لوگوں سے فرمایا ہے کہ وہ ان کے ہر قول کی تقلید نہ کریں۔ اور درحقیقت یہ بات لوگوں کے لئے ضروری ہے امام ابوحنیفہ فرمایا

کرتے تھے کہ یہ ہماری رائے ہے ، اگر کوئی اس سے بہتر رائے پیش کرے تو ہم اسے قبول کرلیں گے۔ حق پسندی کی یہ اسپرٹ بزمانہ حج میں ایک بار عملاً ظاہر ہوئی۔ امام موصوفؒ کے سب سے افضل اور رشید شاگرد امام یوسف، امام مالکؒ کے پاس آئے اور ان سے سبزیوں کی زکوٰۃ اور "صاع" کے متعلق مسائل پوچھے آپ نے سنت نبوی کا فیصلہ سنا دیا، امام ابو یوسف نے فوراً فرمایا کہ میں نے اپنی رائے سے رجوع کیا، اور اگر امامؒ (یعنی ابو حنیفہ) اس وقت ہوتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔

امام مالکؒ کی تعلیم تھی کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ میری رائے صائب بھی ہو سکتی ہے ۔ اور غلط بھی۔ لہٰذا میرا ہر قول کلام اللہ اور فرمان رسول پر پرکھ لیا کرو۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی صحیح حدیث تمہارے سامنے آئے تو میری رائے کو دیوار پہ دے مارو، جو رائے اپنے گرد و پیش دلائل کا حصار رکھتی ہو اسی کو میری رائے سمجھو۔

امام احمدؒ کہا کرتے تھے نہ میری تقلید کرو نہ کسی اور امام کی، بلکہ جس طرح ہم نے علم شریعت سیکھا تم بھی سیکھو۔ کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ لوگ اس کی تقلید کریں تم اپنے دین کی زمام انسانوں کے ہاتھوں میں نہ دو کہ وہ غلطی سے ہرگز مامون نہیں ہو سکتے۔

صحیح بخاری میں ہے۔

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ " جس کا اللہ بھلا کرنا چاہتا ہے۔ اُسے دینی بصیرت سے نوازتا ہے۔"

اب ذرا تصویر کے دوسرے رُخ پر نظر ڈالو۔ اس ارشاد کا لازم کیا ہے؟ یہی نا کہ جس کو تفقہ فی الدین کی نعمت نہیں حاصل اس سے فیض کل کی نظریں پھری ہوئی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ تفقہ فی الدین کی تحصیل ہر مومن پر حسب استطاعت واجب ہے تفقہ فی الدین نام ہے سماعی دلائل کے ساتھ احکام شرعیہ کی معرفت کا۔ جسے یہ چیز حاصل نہیں وہ تفقہ سے بھی محروم ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ انسانوں کا ایک بڑا

طبقہ دینی مسائل کے تمام تفصیلی دلائل پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ سو جن خفایا کی معرفت سے وہ واقعی عاجز ہیں، وہ ان کے مکلف بھی نہیں لیکن جن پر وہ قدرت رکھتے ہیں ان کا حصول تو فرض ہے۔ جو لوگ استدلال پر پوری طرح قادر ہوں ان کے لئے بعض علماء کے نزدیک تقلید مطلقاً حرام ہے، بعض کے نزدیک مطلقاً جائز ہے اور تیسرا مذہب یہ ہے کہ ایسے افراد کے لئے ضرورت کے وقت تو تقلید جائز ہے مثلاً وقت کم ہے اور استدلال و تحقیق کا موقعہ نہیں، لیکن جب کوئی مجبوری نہ ہو تو پھر جائز نہیں اور یہی قول زیادہ راجح اور معتدل ہے۔

اجتہاد کا نام سن کر لوگ گھبراتے ہیں گویا اسے فلسفہ کی بولی میں وہ ایک بسیط شے مانتے ہیں کہ جب تک انسان تمام مسائل اور تمام ابواب دین میں پوری مہارت کے ساتھ اجتہاد نہیں کر سکتا اُسے مسندِ اجتہاد پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ حالانکہ حقیقت امر اس کے برعکس ہے۔ اجتہاد کوئی بسیط شے نہیں جو تجزی اور انقسام کو قبول نہ کر سکے بلکہ ایک انسان بعض فنون یا بعض مسائل میں قدرت نہ رکھنے کے باوجود، دوسرے فنون اور مسائل میں مجتہد ہو سکتا ہے۔ یعنی ہر انسان کا دائرہ اجتہاد اس کی طاقت کے لحاظ سے تنگ یا وسیع ہوتا ہے۔

اب اگر ایک شخص کسی ایسے مسئلہ میں غور و فکر کرتا ہے جس میں علما کی رائیں مختلف ہیں اور دلائل و نصوص پر گہری نظر ڈال کر اس کا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں امام کا مذہب زیادہ قوی ہے اور نصوص شرعیہ اسی کی تائید میں ہیں، تو اس وقت اُسکے لئے دو راہیں ہوں گی۔ اگر وہ ضعیف و مرجوع مذہب کو محض اس لئے اختیار کرے گا کہ وہ اس امام کا مذہب ہے جس کی تقلید کا وہ عہد کر چکا ہے۔ اور قوی مذہب کے دلائل کو حق جاننے کے باوجود چھوڑ دے، تو یہ حق پرستی نہیں بلکہ عادت پرستی ہوگی۔ جس کے لئے شرع میں کوئی حجت نہیں۔ اور اگر اس کا ضمیر اس بے جا عادت پرستی سے متاثر اور مرعوب نہیں ہے تو وہ اُسی پہلے قول کا اتباع کرے گا جس کی صحت اور حقانیت کا وہ معترف ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں دوسرے امام کا اتباع اس پہلے امام کے اتباع کا قائم مقام

ہو جائے گا جس کا وہ مقلد ہے، اور نصوص کی دانستہ خلاف ورزی سے بھی اس کا دامن عمل پاک رہے گا، اس لئے یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور پسندیدہ ہے۔ چونکہ ایسا شخص کمال اجتہاد کے مرتبہ پر فائز نہیں ہے اور یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ اس کا قصور نظر مسئلہ کے تمام گوشوں پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا فیصلہ مجتہدانہ فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے ہم نے یہ بات بہت اتر کر کہی۔ ورنہ جو شخص اپنے اندر اجتہاد کی پوری اہلیت رکھتا ہو اور جس کی دقتِ نظر مسئلہ کے اصلی خط و خال کو دیکھ رہی ہو، اور جسے یقین ہو کہ یہ مذہب نصوص شرعیہ کے مقابلہ میں کوئی جان نہیں رکھتا۔ اس پر تو ان نصوص کا اتباع واجب ہوگا اور اگر اس انشراح حقیقت کے باوجود وہ تقلید کے "عشق" میں سرشار ہے تو اس سے بڑھ کر جہل پرست اور خدا و رسول کا نافرمان کوئی نہیں۔

مقلدین کا ایک اور گروہ بھی ہوتا ہے جو ہٹ دھرم تو نہیں ہوتا مگر اس کو اپنے امام سے حسن ظن بہت ہوتا ہے۔ ان کے سامنے جب ایسی صورتِ حال پیش آتی ہے اور اپنے مذہب کے مقابلہ میں نصوص کی قطعیت یا ترجیح ان کو واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے مسلک کی تائید میں اور زیادہ راجح دلیلیں ہوں گی جن کا ہمیں علم نہیں۔ ان کے حسن ظن کی توہین تو ضرور ہوگی مگر انہیں ہم بتا ہی دیں کہ قرآن کا تم سے صرف اتنا ہی مطالبہ ہے کہ اپنی قوت اور استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کرو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ، اسی طرح حضور کا ارشاد ہے۔ اذا امرتُکُم بامرٍ فاتوا منہ ما استطعتُم یعنی جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو بقدر استطاعت اس پر عمل کرو۔ اس آیت اور حدیث کی روشنی میں غور کرو کہ تم نے حسب استطاعت اس مسئلہ کی چھان بین کر لی۔ اس جستجو میں جو کچھ تمہارے ہاتھ آتا تھا۔ وہ یہی ہے کہ وہ دوسرا قول راجح ہے، اب تم امام کی جلالت شان کو نہ دیکھو، بلکہ حق کو دیکھو۔ تم پر اس کا اتباع فرض ہو گیا۔ ہاں اگر بعد میں چل کر ان نصوص سے بھی بڑھ کر قوی اور مستند دلائل تم نے پا لئے تو تم پھر رجوع کر سکتے ہو۔ یہ تمہارا تذبذب اور اتباع نفس ہوگا بلکہ حق کی محبت اور روشنی کی تلاش ہوگی۔ تمہارا حکم بالکل اس مجتہد کا سا

ہو گا جو وضوحِ حق کے بعد ایک قول سے دوسرے قول کی رجوع کرتا ہے۔ یہ رجوع قابلِ ستائش اور خدا کی نگاہوں میں محبوب ہے، اور اس متعصب کی ہٹ دھرمی خدا کو محبوب نہیں جو روشن راہ کو چھوڑ کر تاریک راہ چلنے پر مصر ہو اور اس کے ساتھ وہ شخص بھی قابلِ مذمت ہے جو محض عادت کی بنا پر یا سہل پسندی اور نفس پرستی کا شکار ہو کر ہمیشہ نئے نئے طریقے ڈھونڈھتا رہتا ہو اور ایک رائے سے دوسری رائے کی طرف رجوع کیا کرتا ہو۔

رہ گیا کسی امام مجتہد کا ایک حدیث کو سن کر اسے ترک کر دینا، خصوصاً جب اس نے اس کی روایت بھی کی ہو، سو اس کے بہت سے اسباب ہیں اور مختلف وجوہ کی بنا پر وہ معذور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ عمل ہمارے لئے اسوہ نہیں ہو سکتا اور محض ان کے طرزِ عمل سے فائدہ اٹھا کر کوئی نصوص کو ٹھکرانے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ حدیث کو ترک کرنے میں معذور ہیں اور ہم ان کے اقوال کو ترک کرنے میں معذور ہیں۔

فرض کرو ایک شخص کسی حدیث پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا اعتقاد ہے کہ ظاہر قرآن اس سے متعارض ہے اور ظاہر قرآن پر عمل کرنا اس کے نزدیک تمام حجج شرعیہ پر مقدم ہے۔ ایسے شخص کو بہر حال معذور سمجھا جائے گا، لیکن اس کا عذر کسی دوسرے کے حق میں عذر نہیں بن سکتا، کیونکہ حقائقِ شرعیہ کا ظہور و خفا تمام اذہان و عقول کے لئے یکساں نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس تارکِ حدیث کو اس بات کا اعتقاد و یقین ہو کہ صحابہ و تابعین نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور ان کا عمل نہ کرنا کھلا ہوا قرینہ ہے اس بات کا کہ اس حدیث میں کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے ــــــــــــ مثلاً وہ منسوخ ہو گی۔ یا کسی دوسری نص کے مقابلہ میں کمزور اور مرجوح ہو گی، لیکن اس کے ایک شخص اور زیادہ کاوش و تدبر سے کام لیتا ہے اور اس پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ نہیں قرنِ اول میں بالکلیہ یہ حدیث متروک العمل نہیں تھی بلکہ ایک جماعت کا اس پر عمل رہ چکا ہے۔ اسی قسم کے اور نہ معلوم کتنے امکان پیدا ہو سکتے ہیں۔ پھر

کسی طالبِ ہدایت کے لئے کیونکر زیبا ہے کہ وہ ایک رائے کے اتباع میں نصوص سے روگردانی کرے۔

ایک اور فقرہ ہے جو ہر ایسے آزاد خیال اور جویائے حق پر فوراً چست کیا جاتا ہے یعنی "آپ زیادہ علم کتاب کے جوہر شناس ہیں یا فلاں امام؟" فلاں امام کا علم و دانش مسلم۔ مگر یہ تقابل بھی سراسر جہل ہے۔ یہ غریب خود اس امام کی مخالفت کب کر رہا ہے بلکہ اس کی مخالفت تو اسی جیسے صاحب علم و ایمان امام نے کی ہے اس کا قصور اگر ہے تو صرف یہ کہ یہ ایک دوسرے امام کی رائے کو زیادہ صحیح اور تشفی بخش سمجھ کر اختیار کر رہا ہے، ان ائمہ کی نسبت آپس میں ایسی ہی ہے، جیسی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، معاذ، ابن مسعود، عثمان، علی رضی اللہ عنہم ائمہ دین میں تھی، یعنی جس طرح یہ صحابہؓ اختلاف رائے میں ایک دوسرے کے مقابل آکھڑے ہوتے اور جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوتا تو کتاب و سنت سے اس کا محاکمہ کرایا جاتا اور گو ان کے مراتب علم میں بہت بڑا فرق ہوتا مگر کبھی حق و اتباع کا انحصار کسی کی بزرگی اور علمی برتری پر نہ رکھا جاتا تھا۔ بعینہ یہی حال ان ائمہ کے باہمی اختلاف رائے کا بھی ہے جن کی تقلید کی جاتی ہے تو پھر ہم ان کے بارے میں اسوۂ صحابہ کی پیروی کیوں نہ کریں۔

تیمم کے بارے میں لوگوں نے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کی رائے پر حضرت ابوموسیٰ اشعری وغیرہ کی رائے کو ترجیح دی، محض اس وجہ سے کہ انہوں نے کتاب و سنت سے اپنی رائے کو حق ثابت کر دکھایا، ورنہ علم اور تفقہ کے اعتبار سے وہ ان لوگوں سے کہیں کم تھے، اسی طرح انگلیوں کی دیت کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ کی رائے رد کر دی گئی اور حضرت امیر معاویہؓ کی رائے پر عمل کیا گیا، کیونکہ ان کے پاس فرمانِ رسالت کی سند تھی حضرت ابن عباس سے متعہ کے بارے میں مناظرہ کرتے ہوئے کسی نے کہہ دیا کہ ابوبکر اور عمرؓ کا یہ قول ہے، ابن عباس سرخ ہو گئے اور فرمانے لگے، "قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہونے لگے، میں کہتا ہوں کہ رسول اللہؐ نے یوں فرمایا ہے اور تم زید و بکر کا نام لئے جا رہے ہو۔

اسی مسئلہ میں حضرت ابن عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ عمرؓ تمہارے لیے زیادہ قابلِ اتباع ہیں، یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ؟ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ بلکہ تمام صحابہ کے مابین شیخین علم و معرفت کے صدر نشین تھے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شخصیت پرستی کا یہ دروازہ کھول دیا جائے تو تمام دین فتنوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ و رسول کی نافرمانی عام اور وحدت ملی پارہ پارہ ہو جائے گی۔ ہر امام نبی بن جائے گا۔ اس کی ایک مستقل امت ہوگی اور ایک مستقل شریعت یعنی نصاریٰ کی طرح اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی شان ہم پر بھی صادق آجائے گی۔

(ماخوذ از فتاویٰ ابن تیمیہ)

ترجمان القرآن اپریل ۱۹۳۰ء